ڈاکٹر ذاکر حسین۔ شخصیت و معمار

مرتبہ

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی

DR. ZAK' ‹ HUSSAIN SHAKHSIYAT AUR MEMAR
COMPILOR DR. FAHMIDA BEGUM.

سنہ اشاعت: اکتوبر تا دسمبر 1995 شک 1917
پہلا ایڈیشن : 1000
سلسلہ مطبوعات نمبر 736
کتابت : محمد راشد انصاری ــ نثار احمد
قیمت : =/70 روپے

نوٹ :۔ کتاب چھپی ہوئی قیمت پر ہی خریدی جائے۔

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو، ویسٹ بلاک 1 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
ٹیلی فون : 603938, 603381, 609746
طابع : جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز۔ جامع مسجد، دہلی 110006

مترجم اور زبان دان

معمار

گوشۂ خطوط

منظومات

میوزیم

پیش لفظ

شخصیتوں کی شناخت کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی، کبھی کبھی عظیم شخصیتوں کی بھی چند فروعی باتوں کو اچھال کر ان کی ساری خوبیوں کو پس پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی جڑ پکڑتی جا رہی ہے کہ کسی بے وقعت کم مایہ شخص نے بھی خود اپنی تشہیر کرنا اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ اپنا ڈھول پٹوانا شروع کر دیا تو بعض لوگ اس ڈھول کی آواز سے سحر زدہ سے ہو جاتے ہیں اور اس سحر زدگی کے عالم میں اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ یہ پرستش اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک اس سے زیادہ اونچی آواز کے ڈھول بجنے نہ لگیں۔ پھر وہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ یہ تو مزاجوں کی بات ہے۔ اصلی ہیرے موتی اور جواہرات کی شناخت اور پہچان صرف وہی کر سکتے ہیں جن کے مزاج میں صبر و تحمل، سیرت میں یکسوئی، وسیع القلبی اور ذکی ذہن ہو۔ عمیق معلومات رکھتے ہوں۔ جن کے شعور کے دھارے دلیل کی گہرائیوں میں پیوست ہوں، نہ کہ جذباتی ہیجان کی بیساکھیوں کے سہارے منزل کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھیں۔ مرزا غالب کے مشاہدہ اور تجربہ کا کیا کہنا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ڈاکٹر ذاکر حسین پر تصنیف شدہ کتابوں اور خود اُن کی تحریروں کے مطالعہ کے دوران ان کی شخصیت کی جو تصویر فکر و ذہن کے پردے پر ابھری تو لگا کہ ان کی بھی ناقدری ہوئی تھی۔ ذاکر حسین کی ہمہ جہت شخصیت کے ایسے گوشے سامنے آئے جنھوں نے عقیدت کے جذبات کو شدت سے ابھارا۔ ہمت اور استقلال کو تقویت بخشی۔ اپنوں کی بے قدری اور قدر دانی کے پیمانہ کو ایک نیا زاویہ بخشا۔

بے شک کئی اعتبار سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی قدر دانی ہوئی ترقی ہوئی مگر اپنوں کے درمیان انھوں نے جو کچھ جھیلا وہ بھی یاد رکھنے والے واقعات ہیں علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بے انتہا بد دلی و بیزاری سے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی باصلاحیت بہترین منظم، دانش مند اور دانشور، اصول پسند ہستی کا استعفیٰ اسی کی ایک مثال ہے۔ آپسی رشتہ کے مطابق رشید احمد صدیقی کی درخواست کو مسترد کر دینا ذاکر حسین کے لیے ناپسندیدہ اور غیر معمولی بات تھی مگر انھوں نے اس درخواست کو قبول نہیں کیا اور بالآخر اس خادمِ قوم نے علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفا دے دیا۔ ان کی زندگی کے ایسے کئی واقعات توجہ طلب ہیں۔

ذاکر حسین پر بہت کچھ ہندی، انگریزی اور اُردو زبان میں لکھا جا چکا ہے۔ پر ابھی ان پر لکھنے کی گنجائش ہے خصوصاً ان کے خیالات وافکار، نظریات اور سماجی مشاہدات کی افادیت آج بھی اسی قدر اہمیت رکھتی ہے جیسی کہ ان کے عہد میں تھی۔ اسی لیے ان کے تجزیہ اور تشہیر کی سخت ضرورت ہے۔ آج کے پس منظر میں ان کے عملی پہلوؤں پر غور اور عمل رہبر ثابت ہوگا۔ ان کے تعلیمی نظریات موجودہ تعلیمی نظام کے لیے فرسودہ نہیں بلکہ زیادہ قابلِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام پر ہندوستان میں جو تعلیمی ادارے اور کتبخانے قایم کیے گئے ہیں ان کی ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے جس سے عوام میں ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں ان کے نام کا کتب خانہ ذاکر حسین لائبریری اور ذاکر حسین میوزیم شانہ بشانہ ایستادہ، اس ادارہ کو پیش کی گئی خدمات کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اسی مٹی میں ذاکر حسین کی آخری خوابگاہ موجود ہے۔

ترقی اُردو بیورو سے ذاکر حسین پر یہ پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کے موقع پر دو کتابوں

(۱) ابوالکلام آزاد — شخصیت، سیاست پیغام

(۲) ابوالکلام آزاد — ایک ہمہ گیر شخصیت

کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ ملک میں ذاکر حسین صدی تقریبات شروع

ہونے والی ہیں۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ ان کی تاریخ پیدائش کا حتمی یقین نہیں ہو سکا ہے کیونکہ ان کی تاریخ ولادت کا کسی کو علم نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ضیاءالحسن فاروقی کا بیان ہے:-[1]

"ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نے جب مرحوم کی بایوگرافی لکھنے کا کام مجیب صاحب کے سپرد کیا، تو انھوں نے اپنے پرسنل اسسٹنٹ عبداللطیف اعظمی صاحب کو ذاکر صاحب کی تاریخ پیدائش کا سراغ لگانے اور اسکول کے زمانے کے متعلق دیگر معلومات حاصل کرنے کے لیے اٹاوہ بھیجا، اس لیے کہ خاندان میں ان کی تاریخِ پیدائش کا کہیں بھی کوئی اندراج نہیں ملا تھا، ذاکر صاحب نے ایک بار فرمایا تھا کہ ان کی پیدائش کی صحیح تاریخ اسکول کے داخلہ فارم سے معلوم کی جا سکتی ہے، چنانچہ داخلہ فارم جو اتفاق سے دستیاب ہو گیا، دیکھا گیا، داخلہ فارم میں تاریخ ولادت کا خانہ نہیں تھا، عمر کا تھا۔ اس میں ذاکر صاحب کی عمر دس سال ایک ماہ لکھوائی گئی تھی، رجسٹر داخلہ کے مطابق ان کا داخلہ ۸ ؍ دسمبر ۱۹۰۷ء کو ہوا تھا، اس طرح گویا ان کی تاریخ ولادت ۸ ؍ نومبر ۱۸۹۷ء ہوئی۔ چار سال بعد انسپکٹر آف اسکولس ایف، جے، مورس نے اس اندراج کو رد کر دیا اور نیا اندراج کیا گیا جس کی رو سے ان کی عمر میں ۹ ماہ کا اضافہ ہو گیا، یعنی عمر کے خانے میں دس سال دس ماہ لکھ دیا گیا جس کے مطابق ذاکر صاحب کی تاریخِ ولادت ۸ ؍ فروری ۱۸۹۷ء ہوتی ہے۔ عمر میں اس اضافے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ میٹرکولیشن کے امتحان کے لیے جو عمر مقرر کی گئی تھی اس میں ۹ مہینے کی کمی رہتی ہو اور اس طرح اسے پورا کیا گیا ہو یا شروع میں جو عمر لکھائی گئی

[1] شہیدِ جستجو ۔ ضیاءالحسن فاروقی صفحہ نمبر ۱۹ — ۱۸

تھی اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔ ۱۹۲۲ء میں جب ذاکر صاحب نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تو اسکول کا ریکارڈ دیکھنے میں بڑی طوالت معلوم ہوئی اور انھوں نے اندازے سے اپنی تاریخ پیدائش ۲۴ر فروری ۱۸۹۷ء قرار دے لی۔"

پروفیسر محمد مجیب کے الفاظ میں بقول ذاکر حسین:۔

" بعد میں جب کبھی ان سے ان کی سالگرہ کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ بہت بگڑ کر کہتے "آپ مجھے دیکھتے ہیں، میں ضرور پیدا ہوا ہوں گا اور یہی جان لینا بہت کافی ہے"، لیکن ان کی سرکاری تاریخ پیدائش وہی ہے۔ جو اسکول کے رجسٹر میں مورس کی تصحیح کے بعد لکھی ہوئی ہے"[1]

اس سلسلہ میں ان کی اپنی ایک تحریر ہمیں دستیاب ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

" مجھے نہ تاریخ ولادت معلوم ہے اور نہ تاریخ وفات" تعلیمی حصولیابیوں کے بارے میں بھی انھیں کی ایک اور تحریر ملاحظہ ہو:۔

RAJ BHAVAN
PATNA

[illegible]

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین، (اردو) ایڈیشن، محمد مجیب۔ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی صفحہ نمبر ۲۔

نام — ذاکر حسین

ولدیت — فدا حسین خاں

ساکن — قائم گنج، ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) بمبئی، حیدرآباد دکن

تاریخ پیدائش — فروری ۱۸۹۷ء

تعلیم — میٹرک ۱۹۱۳ء [illegible] یونیورسٹی سال ۱۹۱۳ء

بی اے — ایم اے او کالج علی گڑھ، الٰہ آباد یونیورسٹی سال ۱۹۱۸ء

ایم اے، پی ایچ ڈی — برلن یونیورسٹی سال ۱۹۲۰ء

پی ایچ ڈی کا عنوان — ہندوستان کی معیشت [illegible]

برلن یونیورسٹی سال ۱۹۲۶ء

دیگر معلومات و تصانیف —

Capitalism. An Essay in Understanding

معاشیات، مقصد و منہاج

[illegible]

Patel Memorial Lectures on the Principles of Educational Reconstruction

[illegible]

[illegible] Das nationale System der politischen Oekonomie [illegible]

[illegible] Elements of Economics [illegible]

مورخہ [illegible] ۱۹۶۰ء — دستخط [illegible]

شہر — پٹنہ

اس اعتبار سے ایک سال پہلے صدی تقریبات کی شروعات ۱۹۹۶ء سے ہو جاتی ہے۔ اور یہ کتاب اس سلسلہ کی ہی ایک کڑی ہے جس میں چند نئے پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ کئی احباب نے ذاکر صاحب پر اپنے مقالے/مضامین دینے کے پکے وعدے کیے۔ تاہم لینے کا فائدہ نہیں۔ اُن کے وعدے پورے نہیں ہوئے۔ جو بھی مواد مل گیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ افادیت کے پیش نظر بعض مطبوعہ مضامین کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری کے دوران سید مسعود احمد ریسرچ اسسٹنٹ کا بھرپور پُرخلوص تعاون حاصل رہا۔ جس کے بغیر یہ کام تکمیل کو نہ پہنچ پاتا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ جو جرمنی زبان میں ہے ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں ذاکر حسین میوزیم کی زینت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ برلن یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بہت زبردست آگ لگی۔ کتابیں اور مقالے آتش کی نذر ہو گئے مگر خدا کی قدرت یہ مقالہ کسی قسم کے نقصان سے محفوظ رہا۔ جس کی اطلاع یہاں کے میوزیم کو دی گئی اور مقالہ کا مسودہ بھی محفوظ کرا دیا گیا۔

مجھے امید ہے کہ قارئین کو یہ کتاب پسند آئے گی۔

۲ر دسمبر ۱۹۹۵ء

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر

خورشید عالم خاں

ذاکر صاحب، ایک تہہ دار شخصیت

ذاکر صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یقیناً آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ قدرت نے انہیں ایک ہمہ گیر، تہہ دار اور دل آویز شخصیت سے نوازا تھا۔ ایک مردِ مومن کی شخصیت میں جتنی ذاتی صفات کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ تمام کی تمام ان کی شخصیت میں موجود تھیں۔ انسان دوستی، انسانی ہمدردی، بلند نظری دردمندی اور وسعت قلبی کی مثالیں ان کی سیرت میں جابجا ملیں گی۔ وہ ایک قدآور ماہر تعلیم اور قوم پرست تھے لیکن میری نظر میں ذاکر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے روز اوّل سے جن مقاصد کو اپنی جہدِ حیات کا عنوان ٹھہرایا ان کا تعلق شمہ بھر بھی کبھی ان کی اپنی ذات سے نہیں، قوم کے مفاد کے سامنے ذاتی مفاد کبھی نہیں آیا۔ ذات کی آلودگی سے بچ کر بے لوث اور بے کسر نفسی کے جس راستے پر وہ ساری عمر گامزن رہے اس راستے کا اللہ والوں نے توحید کے بلند مقام میں شمار کیا ہے اور اس پر چلنے والوں کے لئے "ہر زماں از غیب جان دیگر است" کی نوید دی گئی ہے۔

ذاکر صاحب کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان کی انسانیت پرستی اور وسیع القلبی کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں تھا جامعہ ملیہ کے ابتدائی دور سے لے کر راشٹرپتی بھون کے زمانے تک ان کے کردار و عمل میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا۔ وضع داری ایسی کہ ملنے والا چاہے کوئی ہو یکساں خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان سے ملاقات کے بعد ہر کوئی یہ تاثر لے کر لوٹتا کہ

ذاکر صاحب نے اس کے ساتھ خصوصی کرم کا سلوک کیا ہے۔
ان کی انسانی ہمدردی کے سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آتا ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ ۱۹۴۶ء ۔ ۴۷ کا پر آشوب زمانہ تھا۔ دلی بھیانک فسادات کی آگ میں جھلس رہی تھی اور خود جامعہ والے بھی خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اس زمانے میں جامعہ سے تھوڑی دوری پر ہندو بچیوں کا ایک آشرم ہوا کرتا تھا۔ ایک روز اس آشرم کی نگران خاتون گھبرائی ہوئی ذاکر صاحب کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ مسلمان ہمارے آشرم پر حملہ کر دیں گے لہٰذا اس کا کچھ بندوبست کیجئے۔ ذاکر صاحب نے کہا آپ جانتی ہیں آپ اور ہم ایک مدت سے یہاں رہ رہے ہیں اور آپ کو جامعہ والوں سے قطعی کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو سکتا۔ نگراں کار خاتون نے کہا کہ حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ اب ہمیں خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کیوں کہ آئے دن اس طرح کے واقعات کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ ذاکر صاحب کے اطمینان دلانے پر بھی جب ان کی تسلی نہیں ہوئی تو ذاکر صاحب نے فرمایا میرے پاس فوج یا پولیس تو ہے نہیں جسے میں آپ کی حفاظت کے لئے بھیج سکوں۔ آپ ایسا کیجئے کہ میری ان دو بچیوں کو جو یہاں بیٹھی ہوئی ہیں اپنے ساتھ لے جائیے جب تک آپ کو خطرہ محسوس ہوگا یہ آپ کے آشرم میں آپ کے ساتھ رہیں گی اور اگر کچھ ہوا تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو آشرم کی دوسری بچیوں کا ہوگا۔ یہ سن کر آشرم کی نگران خاتون آبدیدہ ہو گئیں اور کہنے لگیں۔ ذاکر صاحب اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ جامعہ والوں سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔
ذاکر صاحب کسی کی دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ تصور کرتے تھے لیکن خود اپنے اعمال کی بڑی سختی سے نگرانی کرتے تھے گو دوسروں کی بڑی خطا کو وہ معاف کر دیتے تھے۔ ایسے کئی واقعات ملیں گے کہ دوسروں کے بڑے بڑے اخلاقی گناہوں پر انہوں نے پردہ ڈال دیا بلکہ دوسروں کی غلطی کو اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ کبھی کبھی تو ان کی اس عادت سے ان کے عقیدتمند بھی بدظن ہو جاتے لیکن انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی۔

ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے محسنوں کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ جامعہ ملیہ جب قرولباغ میں تھی تو اس وقت اس کی مالی حالت بہت ابتر تھی۔ اساتذہ کو وقت پر بلکہ کبھی کبھی تو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس زمانے میں قرولباغ میں کھجور روڈ پر پرچوں کی ایک دکان تھی جس کے مالک کا نام تھا سُبّا۔ یہ شخص بڑا فراخ دل تھا اور جامعہ کے لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں ادھار دیدیتا اور کہتا کہ جب سہولت ہو رقم ادا کردیں۔ جامعہ قرولباغ سے اوکھلے میں منتقل ہوگئی۔ ذاکر صاحب جامعہ سے علیگڑھ، وہاں سے پٹنے کے راج بھون اور پھر راشٹرپتی بھون پہنچ گئے جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ تھے سُبّا نے خط لکھا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں سُبّا دکاندار ہوں۔ قرولباغ کے زمانے میں جامعہ والوں کی، کھانے پینے کی چیزیں سپلائی کر کے سیوا کیا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب کو جب یہ خط ملا تو انھوں نے اے ڈی سی کو بلایا اور کہا کہ فوراً گاڑی لے کر اس پتہ پر پہنچیے اور سُبّا کو بلا کر لائیے۔ جب راشٹرپتی کی گاڑی وہاں پہنچی تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ سُبّا نے کہا راشٹرپتی جی نے بلایا ہے اور مجھے لینے گاڑی بھیجی ہے۔

غرض وہ راشٹرپتی بھون پہنچا ذاکر صاحب سے ملاقات کی چائے پی تصویر کھنچوائی اور اس کے بعد جب رخصت ہونے لگا تو ذاکر صاحب اس کو چھوڑنے کے لئے گاڑی تک آئے۔ صدر جمہوریہ کے ملٹری سکریٹری نے جو وہاں موجود تھے عرض کیا صاحب آپ کا اس طرح سے باہر آنا اور اس کو رخصت کرنا پروٹوکول کے خلاف ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ تو آپ کا پروٹوکول ہے۔ میرا بھی تو ایک پروٹوکول ہے۔ میں اس کا کیا کروں ؟ پھر انھوں نے ملٹری سکریٹری سے کہا تم نہیں جانتے یہ کون شخص ہے اگر اس فراخدل شخص نے عسرت کے دنوں میں ہماری مدد نہ کی ہوتی تو آج جو آپ کے راشٹرپتی بنے ہوئے ہیں وہ اور ان کے بیوی بچے فاقوں سے دوچار ہوتے۔

ذاکر صاحب کا شعر و ادب کا ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا اردو اور فارسی ادب کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی عادت تھی کہ فارسی اور اردو کے پسندیدہ شعر اپنی بیاض میں لکھ لیتے۔ علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فلسفے سے بے حد متاثر تھے۔ خاص طور پر

اقبال کے کلام کا وہ حصہ جو انسان کی خودی کو بیدار کرتا ہے اور اسے عمل کی آواز دیتا ہے انہیں بہت پسند تھا۔ اقبال کے مندرجہ ذیل شعروں سے جنہیں وہ خاص طور پر پسند کرتے تھے خود ذاکر صاحب کے کردار اور شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔

مجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

ذاکر صاحب کی شخصیت عبارت تھی اس حسین امتزاج سے جو ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی روح ہے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بھی انہوں نے ہندوستان کی مشترک تہذیب، جذباتی ہم آہنگی آپسی میل ملاپ اور بے لوث محبت کو بڑھاوا دینے پر زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اجتماعی کوشش سے سماج میں ذہنی تعاون کی راہیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیں تاکہ اس سے محبت اور بھروسے کے ایسے سوتے پھوٹیں کہ ساری قومی زندگی اس سے سیراب ہو سکے ان کا قول تھا کہ اگر ہم آپسی اعتماد اور اتحاد ایک دوسرے کے لئے سچے دل سے احترام اور رواداری کو عام کرنے میں کامیاب ہو گئے تو نہ صرف رب کے حضور سرخرو ہوں گے بلکہ ہمیں ذہنی سکون اور راحت بھی میسر ہو سکے گی۔

بھید بھاؤ، پھوٹ، علیحدگی پسندی اور نفرت کے تخریبی رجحانات سے انہیں

روحانی تکلیف ہوتی تھی اور وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ جامعہ ملیہ کے جوبلی تقریبات
کے موقع پر ملک کے چوٹی کے قائدین کی موجودگی میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے جو
خطبہ پڑھا تھا وہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے ہی لیکن اس سے ذاکر صاحب
کے دل میں قوم کے لئے جو درد اور تڑپ موجود تھی اس کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ذاکر
صاحب نے فرمایا تھا۔ "آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں
لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی
سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے دکھ کے ساتھ چند
الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے
اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے یہ آگ شرافت اور انسانیت
کی سرزمین کو جھلسا دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے
پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنواریں گے؟
بربریت کے اس دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچائیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ
سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں
طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی نرم ہوتے خدا کے لئے سر جوڑ کر
بیٹھیے اور آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے
لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔
مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے مہذب
زندگی کی بنیادوں کو کھودنے نہ دیجئے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذاکر صاحب کی ان باتوں
کی آج بھی وہی اہمیت ہے جو اس وقت تھی۔

ذاکر صاحب نے تعلیمی کام کو ابتدا ہی سے اپنا مقصدِ حیات بنایا تھا اور یہ بھی
ایک واقعہ ہے کہ ذاکر صاحب کی شخصیت میں ایک معلم کا عنصر ہمیشہ پایا جاتا تھا۔
وہ جامعہ سے لے کر راشٹرپتی بھون تک جس عہدے پر بھی فائز رہے ان کی شخصیت
میں معلم کا یہ عنصر نہ صرف باقی رہا بلکہ ان کے خیالات کو ہمیشہ متاثر کرتا۔ اس سلسلہ
میں مندرجہ ذیل واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم اور تعلیمی اداروں سے انہیں کس
قدر دلچسپی، لگاؤ اور شغف تھا۔

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے تو اس زمانے میں وہاں کی قانون ساز اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا تھا جو اگر پاس ہو جاتا تو اس سے یونیورسٹیوں کی خود مختاری بڑی حد تک متاثر ہوتی ذاکر صاحب چونکہ یونیورسٹیوں کی خود مختاری کو بہت اہم اور ضروری سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے وزیر اعلیٰ سے کہا کہ مجوزہ بل یونیورسٹیوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اور اس کا پاس کرنا یونیورسٹیوں کے لئے مضر ہوگا۔ وزیر اعلیٰ نے جواباً عرض کیا کہ بل چونکہ اسمبلی میں زیر بحث ہے اور اگر آپ اس میں کچھ ترمیمات کرانا چاہتے ہیں تو وہ ضرور قابل قبول ہوں گے۔ بل کو واپس لینا ممکن نہیں ہے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا "میں ترمیمات کے سلسلہ میں کوئی تجویز نہیں دے رہا ہوں بلکہ میں بنیادی طور پر اس بل کے خلاف ہوں لہٰذا اگر یہ بل اسمبلی سے واپس نہیں لیا جاتا تو میں پہلی ٹرین دہلی کے لئے لوں گا اور آپ کو کوئی دوسرا گورنر تلاش کرنا ہوگا۔ نتیجتاً بل واپس لے لیا گیا۔

ذاکر صاحب کا ذوقِ جمال اپنے اظہار کے نت نئے ذریعہ تلاش کر لیتا تھا۔ انہیں باغبانی اور پھولوں سے خاص دلچسپی تھی خصوصاً گلابوں کے شیدائی تھے۔ ذاکر صاحب کی صدارت کے زمانے میں شاہ ایران ہندوستان آنے والے تھے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ جب وہ آئیں تو مغل گارڈنس میں گلابوں کی بہار ہو اور وہ اس سے لطف اندوز ہو سکیں لیکن شاہ ایران کے دورے سے پہلے ہی پھول کھلنے شروع ہو چکے تھے۔ اندیشہ تھا کہ ان کی آمد تک سارے پھول کھل چکیں گے۔ جب ذاکر صاحب کو یہ بات بتائی گئی تو دوسرے روز وہ خود باغ میں آئے اور باغبانوں کو مشورہ دیا کہ جتنی گلاب کی کلیاں ہیں ان سب کو بے بی ڈول سے باندھ دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے بعد جس روز شاہ ایران آئے اس سے ایک دن پہلے ان کلیوں کو کھول دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب شاہ ایران راشٹرپتی بھون پہنچے تو سارے باغ میں گلاب کھلے ہوئے پائے گئے۔

ذاکر صاحب کو خطاطی کے نمونوں سے نادر پتھروں سے اور کلاسیکی موسیقی سے بھی خاص دلچسپی تھی انہوں نے نادر پتھر خوبصورت خطاطی کے نمونے اور کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ کافی تعداد میں جمع کر رکھے تھے اور اکثر تنہائی میں ان سے محظوظ ہوتے

تھے۔ جامعہ ملیہ میں انہوں نے اپنے پسندیدہ اشعار ایک مشہور خطاط سے لکھوا کر طغروں کے طور پر لگا رکھے تھے ان میں ایک شعر ایسا ہے جو ذاکر صاحب کے فلسفۂ حیات کا جامع ترین اظہار ہے۔ شعر ظاہر ہے ذاکر صاحب کے محبوب شاعر اقبال ہی کا ہو سکتا ہے۔

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

یہ آرزوئیں اور یہ مقاصد، گھر بار بیوی بچوں کی آسودگی دولت اور فراغت اور محفوظ مستقبل کے نہیں تھے۔ ان کا تمام تر تعلق قوم اور معاشرے کے مفاد اور اجتماعی خیر سے تھا۔ اس راستے میں کامیابی ہو یا نہ ہو اور اگر ہوئی تو کس حد تک ؟ اسے کتنے لوگوں نے جانا اور مانا۔ یہ سب غیر ضروری اور بے معنی باتیں ہیں۔ ایسے مقاصد جلیلہ کے حصول کی جدوجہد اپنا انعام آپ ہوتی ہے۔ ان کے آگے گورنری، صدارت وغیرہ کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی ان کی اہمیت اگر ہے تو بس اتنی کہ یہ عہدے ایک قدر شناس قوم اور حکومت کی طرف سے آدمی کی عظمت کے اعتراف کی علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہوں یا نہ ہوں آدمی کی عظمت ان کے بغیر بھی دائم و قائم رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ذاکر صاحب کبھی عہدوں کے پیچھے نہیں بھاگے البتہ عہدے اور اعزازات خود ہی ان کو اپنی طرف کھینچتے۔ یہ حقیقت جو ذاکر صاحب کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی سب سے دلنواز شخصیت ہونے کا امتیاز بخشتی ہے۔

سیدنا محمد برھان الدین

ذاکر صاحب

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ جنہیں پیار و محبت سے سب "ذاکر صاحب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک نہایت قابل قدر، لائق صد تحسین شخصیت تھی۔

"شیخ الجامعہ" سے علی گڑھ کے وائس چانسلر کے منصب تک ہر جگہ نمایاں کام کیا اور دیرپا اثرات مرتب کئے۔ پھر تعلیم سے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تب بہار کے گورنر سے وائس پریسیڈینٹ کے عہدے اور آخر میں ملک کے اہم ترین عہدہ پر فائز رہے۔ ہر عہدہ کے ساتھ فرائض منصبی کی برآوری کے علاوہ روحانی اور اخلاقی قدروں پر بھی عامل رہے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت میں کئی پہلو تھے۔ جس میدان میں اور جہاں بھی رہے اور جن حالات میں قدم رکھا اپنے نقشِ پا چھوڑ گئے۔ چاہے وہ معاشیات ہو ادب ہو یا تعلیم سیاست کا میدان ہو، ترجمہ یا دین کا، ان مختلف الجہات اور متعدد شعبوں میں ایک ہی چیز قدرِ مشترک تھی اور وہ تھی انسانیت، ان کی انسان دوستی اور محبت پروری ہر جگہ ان کے لئے راہ نکال لیتی تھی، انسانیت۔ دنیا کے کسی کونے میں دکھی ہو۔ ان کے دل میں ٹیس سی پیدا ہوتی تھی، خدمتِ خلق کے جذبے سے معمور یہ دل اپنوں اور پرایوں میں فرق نہیں جانتا تھا۔

صبر و عظم، استقلال و اطمینان، پختہ یقین و ہمت افزائی، بیان کی قوت، اور بلا کی ذہانت، زور خطابت اور ترجمہ میں سلاست۔ یہ تھے عناصر ان کی بلند پایہ شخصیت کے۔ اللہ سبحانہ ان کی مغفرت فرمائے۔

سعیدہ خورشید

ذکر میاں کا۔ زبان میری

قایم گنج والوں کے ذاکر میاں، جامعہ والوں کے ڈاکٹر صاحب علی گڑھ والوں کے وائس چانسلر ذاکر صاحب، بہار والوں کے گورنر ذاکر صاحب، بھارت اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے نائب صدر اور صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین میرے اور میری بہن صفیہ کے میاں ہیں۔ ہم دونوں اپنے والد محترم کو میاں کہتے ہیں۔

ان کا نام زبان پر آتے ہی ان کے بشاشت بھرے تھکے تھکے سے چہرے، مسکراتے ہونٹ، شفقت اور محبت بھری آنکھوں کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اخلاقی اور روحانی اعلا قدریں ان کی سیرت اور شخصیت کے ریشے ریشے میں سما گئی تھیں وہ یاد آنے لگتی ہیں اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ ساری کی ساری قدریں ہمارے درمیان سے مٹ چکی ہیں، میاں کے ساتھ دفن ہوگئی ہیں۔ میاں نے ان قدروں کی آبیاری اپنے خون پسینے سے کی اور ان کی حفاظت میں جان لگادی۔

میں ان کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں جتنا غور کرتی ہوں کئی پہلو مجھ پر روشن ہوتے چلے جاتے ہیں وہ ہر اعتبار سے بلند تھے۔ زندگی کے سفر میں جو راہ بھی اختیار کی اس پر چل کر آخر منزل تک پہونچے۔ سفر کی صعوبتوں، دشواریوں اور تکلیفوں کو خود خندہ پیشانی اور صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ کبھی

کسی سے کوئی شکوہ کیا اور نہ شکایت۔

میاں نے مختلف موقعوں پر یہ کہا ہے کہ مجھ پر سب سے زیادہ احسان میری والدہ کا ہے اور میرے استاد سید الطاف حسین کا۔ اگر ان دونوں کی تعلیم و تربیت مجھے حاصل نہ ہوتی نہ جانے میں کیا ہوتا۔ الطاف حسین مرحوم کے متعلق وہ کہتے تھے کہ "ایسا انسان مجھے آج تک نہیں ملا۔ ان سے زیادہ لائق فائق اور شفیق استاد میں نے نہیں دیکھا۔ میں سوچتا ہوں ایسے انسان اب کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ یہ دنیا ایسے انسانوں سے کیوں خالی ہوتی جارہی ہے۔" میاں نو(۹) برس کے تھے جب اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ان کا داخلہ ہوا تھا اور سید الطاف حسین اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

میاں ہماری دادی کی سخاوت کا ذکر اکثر کیا کرتے رہتے تھے کہ کوئی سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا جو دیا جاتا اس کی خبر دوسرے ہاتھ کو نہ ہوتی تھی ملاقاتیوں سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آتیں خواہ وہ کسی بھی حیثیت کا آدمی ہو۔ نوکروں تک سے برابر کا سلوک کرتیں۔ ان کے آرام کا خیال رکھتیں۔ بزرگوں کا احترام ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ رکھ رکھاؤ ایسا کہ اپنے پرائے سب خوش اور ان کا دم بھرتے تھے۔

میاں کی سیرت کی تربیت اور شخصیت کی نشوونما میں پیر حسن شاہ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میاں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اکثر ان کے قصے سنایا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ حسن شاہ کے پیر شاہ طالب حسین تھے۔ ایک دن نہ جانے کس طرح پیر شاہ طالب حسین کو پتہ چلا کہ حسین شاہ ہندوؤں سے کچھ تعصب برتنے لگے ہیں۔ تو انھیں بلا کر کہا "حسن شاہ تمہارا دل ابھی پوری طرح پاک و صاف نہیں ہوا۔ ایک خدا پرست کے دل میں خدا کی مخلوق سے نفرت کی بالکل گنجائش نہیں ہوتی۔ تمہارا علاج یہ ہے کہ تم سر پر چوٹی اور پیشانی پر تلک لگا کر کشمیر سے راس کماری تک پیدل سفر کرو تاکہ اپنے ہم وطن تمہیں اس حالت میں دیکھیں اور تمہیں عبرت حاصل ہو۔ حسن شاہ نے اپنے پیر کے حکم کے آگے سر جھکا دیا اور ان کی ہدایت کے مطابق سفر کیا۔ یہ تھے پیر حسن شاہ جن کی بدولت میاں کو

موصوف اور بزرگوں سے عقیدت ہوئی اور عمر بھر قائم رہی۔ بزرگوں کی تعلیمات اور زندگی کے حالات سے جو خاص سبق سیکھا وہ انسان کی محبت تھی جس میں نہ مذہب و ملت کا امتیاز تھا نہ رنگ ونسل کا لحاظ۔ غریبوں کی محبت تھی جو صرف خدا کے واسطے تھی۔ دینے کی عادت تھی تو دوسروں کو بنانے کے لیے تھی۔

ماہرین تعلیم وتربیت کا یہ کہنا درست ہے کہ بچے کی سب سے پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے کہ زندگی کے ابتدائی اسباق ماں سے سیکھتا ہے ابتدا میں جو عادتیں پڑ چکی ہوتی ہیں اسی کی بنیاد پر زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ میاں کی ماں نے ممتا کے خزانے ان پر لٹا دیئے۔ ان کی قوت حس بہت تیز تھی۔ وہ محبت بھری اور خدا ترس خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ذریعہ دوسروں کا دل رکھنا دوسروں کو اپنا بنانا اور اپنے کو پہچاننا سکھایا۔ ماں کی تعلیم وتربیت، استاد کی محبت اور شفقت نیز پیر حسن شاہ کی صحبت نے میاں کے اندر اخلاقی اور روحانی اقدار کی جوت جگائی لیکن ان کو روشن کرنے، ان میں پختگی اور پائیداری پیدا کرنے کا کام میاں نے خود "اپنی تعلیم آپ" کے ذریعہ کیا۔ "اپنی تعلیم آپ" میں انھوں نے کیا کیا اور کس طرح کیا ہوگا اس کا اندازہ خود ان کی تحریر سے ہوسکتا ہے۔ لکھتے ہیں "اپنی تعلیم آپ" کے معنے کیا ہیں؟ کیا بس لفظ ہیں کہ بول دیئے یا ان کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ بس مطالعہ ہے جو کر دیا یا اسے پورا کرنے کے لیے عمل مسلسل کی شرط ہے؟ اپنی تربیت آپ کرنے کے معنے ہیں اپنی روح کو، کہ پست وبلند، ادنیٰ واعلیٰ افضل وارفع کی آماجگاہ ہے۔ نیچے سے اوپر لے جانے کی سعی پیہم، پست جبلتوں اور محرکوں، بری عادتوں اور خواہشوں غلط افکار وخیالات کے دَل دَل سے اپنے کو نکال کر اخلاق حسنہ کی بے مثال راہ پر ڈالنا انھیں انفرادی صلاحیتوں اور میلانوں میں یکسوئی ویک جہتی پیدا کر کے اپنی سیرت کی ساری قوت کو ان اخلاقی معیاروں کا تابع بنانا اور شخصیت اخلاقی کی منزل کی طرف باوجود ناکامیوں اور مایوسیوں کے برابر چڑھتے جانا یہ کام دراصل

جہاد زندگی میں ایک سپاہی کا کام ہے، وہ سپاہی جو باطل کی ان قوتوں ہی سے برسرِ پیکار نہیں ہوتا جو خارج سے زندگی کو لگاڑنا چاہتی ہیں بلکہ باطل کی ان طاقتوں سے بھی جو نفس کے اندر اور روح کی جڑوں کو گھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں جن کی چھپی ہوئی فوج روح کی مملکت کو تاراج کرتی ہے اور اخلاق حسنہ کی بستیوں کو اجاڑتی رہتی ہے۔ سچا مجاہد ان سے بھی لڑتا ہے، ان سے بھی، یہ جماعت کی زندگی کو بھی اقدار عالیہ کا خادم بنانا چاہتا ہے اور انھیں شخصی صلاحیتوں کو بھی۔ اس کا ثباتِ قدم، اس کی خود اعتمادی، اس کا خلوص، اس کا اقدار عالیہ پر ایمان محکم، اس پیکار حیات میں اس کے ہتھیار ہوتے ہیں اور ضبط نفس، بے غرض خدمت اور اخلاقی جرأت اس جہاد میں اس کے رفیق راہ ہوتے ہیں"۔

اقدار عالیہ اور اتفاقِ حسنہ کے سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ۱۹۴۸ء میں استادوں کا مدرسہ" جامعہ ملیہ میں تقسیم ہند کی وبا کی ماری ہوئی چندان استانیوں کی تعلیم کا ایک پروگرام چل رہا تھا جو پنجاب سے آکر دہلی میں آباد ہوگئی تھیں۔ غالباً یہ استانیوں کا الوداعی جلسہ تھا جس میں میاں کی تقریر ہوئی تھی۔ اس جلسہ میں اماں اور میں بھی موجود تھے۔ تقریر شروع کرتے وقت میاں نے کہا بھائیو اور بہنو اور ہاں میری بیوی! یہ سن کر سب ہنس پڑے دوران تقریر اپنے دلچسپ انداز میں ضبط نفس، بے غرض خدمت، باہمی محبت، درگذر، روشن مستقبل کی امید اور حق پروری جیسی اور بھی کئی قدروں کا ذکر کیا۔ ہم گھر واپس آئے تو اماں نے میری طرف مخاطب ہوکر بڑے ہی معصومانہ انداز میں کہا "یہ تو (میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اپنی باتوں کو دوسروں پر ڈال ڈال کر کہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ سب مجھ جیسے ہو جاؤ۔" اماں کے اس فطری تاثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ میاں صرف وہی کہتے تھے جو خود کرتے تھے بتائیے بیوی سے زیادہ شوہر کو کون جان سکتا ہے۔

میاں جماعت اور سماج کے آدمی تھے۔ دوسروں کے ہمدرد اور مددگار وہ دوسروں کی زندگی میں سماج میں وہی اعلیٰ قدریں دیکھنا چاہتے تھے۔

جن کے وہ خود سیوک تھے۔ انھیں دوسروں کی شخصیتیں تعمیر کرنے کا فطری شوق تھا اور اسی شوق پر اپنی صحت قربان کی۔ ان کا یہی شوق تو تھا جس نے انھیں معلم بنایا۔ اسی شوق سے مجبور انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سنبھالا۔ ان کے شوق اور لگن کا اندازہ ان کے محبوب ترین رفیق کار، پروفیسر محمد مجیب کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ ''ذاکر صاحب میں وہ تمام صفتیں تھیں جو ایک مدبر اور قومی رہنما میں ہونی چاہئیں لیکن شاید ان کا فیصلہ نہیں بلکہ خدا کی مرضی یہ تھی کہ وہ تعلیم کو اپنا میدانِ عمل بنائیں۔ اس میدان میں بھی موثر وہی ہو سکتا ہے جس کے مزاج اور سرشت میں سیاست کی اعلیٰ قوتیں شامل ہوں جو صرف بچوں اور نوجوانوں کی نہیں بلکہ عام انسانوں کی فطرت کو سمجھتا ہو جو موقع شناس ہو اور مردم شناس ہو جو دوسروں میں خود اعتمادی پیدا کرا سکے اور اپنے کام کچھ اس طرح کرائے کہ کام کرنے والے انھیں اپنے سوچے ہوئے کام سمجھیں جامعہ مشکلوں کے ہجوم میں کھو جاتی اگر ذاکر صاحب کی طبیعت میں وہ کارسازی، مصلحت اندیشی اور صبر نہ ہوتا جو اعلیٰ سیاست کی قدریں ہیں۔ انھوں نے جامعہ والوں کو خیال اور گفتگو کی پوری آزادی دے کر اختلاف کے لیے ہر ممکن گنجائش رکھ کر ان میں وفاداری اور یک جہتی قائم رکھی''۔

میاں اللہ والے تھے۔ وہ اللہ کے بندوں کی بے لوث خدمت کو اللہ کی خدمت سمجھتے تھے۔ وہ مسلمان تھے اور ہندوستانی۔ انھیں اپنے دیس سے بے انتہا پیار تھا۔ اور ہندوستانی ہونے پر فخر ان کے سچے پیار اور جائز فخر کی طاقت ہی تو تھی کہ انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۶ء کو کاشی ودھیا پیٹھ کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں بہ بانگ دہل یہ کہا تھا۔ ''ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان ان کے اچھے ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔ ہندوستان میں ان کا دین بے تعلقی کا عذر نہ ہو۔

بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے، ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

میاں کی مذہبی اور سیاسی بصیرت کا کچھ اندازہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی اس تحریر میں بھی خوب ہوتا ہے۔" ان تمام اثرات کا مجموعی نتیجہ جب ان کی (ذاکر صاحب) گہری دانشوری کی چھلنی میں چھن کر نکلا تو مذہب اور مذہبیت تہذیب اور قومیت کے مسئلوں کو، ہندوستان کی تاریخ اور اس کے خاص حالات میں انھوں نے سچائی اور حقیقت پسندی سے دیکھا اور سمجھا۔ اس لیے ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی انھوں نے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ناطہ نہیں توڑا۔ مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے بھی ماضی سے اور فکر میں "جدید" ہوتے ہوئے بھی 'قدیم' سے اپنا تعلق نہیں ختم کیا۔ وہ آخر تک جس طرح کھرے نیشنلسٹ رہے اسی طرح پکے مسلمان بھی رہے۔

ایک دانش ور، ایک معلم، ایک جمہوریت پسند، ایک انسان دوست، اقدار عالیہ کے خادم اور اپنی تاریخی بصیرت کے طفیل تہذیب و تمدن کا ایک عالمی نقطۂ نظر رکھنے والے ایک مرد حق پرست کی حیثیت سے ذاکر صاحب کا سیاسی عقیدہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ قوم کی ترقی کے لیے جماعتوں کو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا موقع ملنا چاہیے۔ انھیں کی ہم آہنگ تربیت میں قومی فلاح کا راز پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہندوستانی تہذیب ایک مشترکہ کارنامہ ہے۔"

میاں کے ذہن میں اچھے ہندوستانی کی جو تصویر تھی وہ دیکھنے والوں نے ان کے ہر عمل اور ان کی ہر حرکت میں دیکھی ہوگی۔ میاں کے ذہن میں اچھے مسلمان کا جو تصور تھا اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے زیادہ کسی اور طرح نہیں ہو سکتا جو انھوں نے یوسف مہر علی سینٹر کے افتتاح کے موقع پر بمبئی میں کی تھی اور جس میں وضاحت کے ساتھ مسلمان کے اوصاف اور خوبیاں بیان کی تھیں۔ اس تقریر کو سن کر میاں کے ایک مخلص اور لائق شاگرد معین الدین حارث نے پروفیسر ضیاء الحسن سے کہا تھا کہ ذاکر صاحب نے" خدمتِ دیگراں کے پردے میں بالکل اپنا ذکر کیا ہے۔

بہت پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ ایک اچھا مسلمان وہ ہے جس کی سخاوت دریا کی سخاوت جیسی، جس کی فیاضی سورج کی فیاضی جیسی اور جس کی تواضع زمین کی تواضع جیسی ہوتی ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کی پکار پر وہ ان کی مدد کو پہونچتا ہے، جو لوگ مجبور اور بے یار و مددگار ہیں ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ لوگوں کے دکھ درد اور محنت و مشقت سے دل دکھی اور مغموم ہوتا ہے۔ وہ انھیں میں رہتا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے جو سختیاں پیش آتی ہیں انھیں ہنسی خوشی جھیلتا ہے اور جو لوگ اسے دکھ دیتے اور نقصان پہونچاتے ہیں اس کے بدلے میں وہ ان کے ساتھ ایثار اور فیاضی کا برتاؤ کرتا ہے۔ اچھا مسلمان دوستی کرتا ہے کیوں کہ سچی دوستی ہی خدا اور بندے کے حقیقی تعلق کی جلوہ گاہ ہے۔ ایک اچھا دوست بننے کے لیے وہ اپنے اندر وہ سماجی خوبیاں پیدا کرتا ہے جو اس کے ساتھی دوسرے انسانوں کو بہت زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ عادات و اطوار میں دل کشی، خوش گفتاری، جی کو لگنے والی بات کہنے کی صلاحیت، من کو بھانے والا استدلال، ادب اور آرٹ کے شہ پاروں سے لطف اندوز ہونے کا ذوق اور ایسی تقریبوں میں کھلے دل سے شرکت جس سے انسانوں سے اس گہری دل چسپی اور مقدس چیزوں سے متعلق اس کے جذبۂ احترام کا اظہار ہوتا ہو۔ مساوات پر اس کا عمل محض حکم کی تعمیل نہ ہو بلکہ یہ اس کی طبیعت کا تقاضہ اور اس کی فطرت ثانیہ ہو جسے کسی حال میں اس کا دبایا جانا گوارا نہ ہو۔ اچھا مسلمان صرف خدا ہی سے محبت کرتا ہے لیکن اس طرح کہ جن لوگوں کے درمیان وہ رہتا ہے وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ صرف ان ہی سے محبت کرتا ہے۔"

میاں کی ایک دو باتیں اور بتا دوں تاکہ صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ ان کے قول اور فعل ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ جیسے گھر کے اندر تھے ویسے ہی باہر تھے۔

اپریل ۱۹۴۰ء میں جامعہ نگر میں بنیادی قومی تعلیم کی کانفرنس ہونے والی تھی۔ میاں اس کے انتظام میں بہت زیادہ مصروف تھے ہمیں ان سے ملے

بغیر کئی کئی دن بیت جاتے تھے۔ ایک روز رات کے کھانے پر باتوں باتوں پر
اماں نے کہہ دیا۔ "تم یہاں صرف رین بسیرا کے لیے آتے ہو تمہارا اصلی گھر تو
جامعہ ہے۔" میاں مسکرائے اور بولے نہیں گھر تو جامعہ سے باہر دور تک ہے
جب میاں صدر جمہوریۂ ہند ہوئے اور انھوں نے ریڈیو کے ذریعہ اعلان
کیا کہ سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے رہنے والے میرا پورا پریوار تو
مجھے میاں کی ۱۹۴۶ء کی بات یاد آگئی جب یہ بات اماں کو یاد دلائی تو اماں
خوب ہنسیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب میاں نائب صدر تھے تو اماں
بیمار ہو گئیں اور کئی دن تک بیمار رہیں۔ ایک دن میاں اماں کے پاس بیٹھے
تھے اماں کا ہاتھ میاں کے ہاتھ میں تھا کہنے لگے "دعا کرتا ہوں کہ تم جلد اچھی
ہو جاؤ۔ تمہارے سوا ہمارا کوئی اور دوست نہیں۔ تم نے ہم سے صرف اللہ کے
واسطے محبت کی ہے۔ تم نے ہماری بہت سی کوتاہیوں کو نظر انداز کیا ہے۔ تم
نے ہمیں فیض پہونچایا ہے ہم تمہیں فیض نہ پہونچا سکے۔" اماں زیر لب مسکرائیں
اور نحیف آواز میں بولیں "تم نے بھی تو مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔

(سعیدہ خورشید)

حوالہ جات:۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۶۱ء صفحہ
۲۰۶ اور ۲۰۷

(۲) محمد مجیب "ذاکر صاحب" ماہنامہ، رسالہ جامعہ جون ۱۹۶۹ء

(۳) تعلیمی خطبات صفحہ ۲۵

(۴) ضیاء الحسن فاروقی، شہید جستجو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۹۲
اور ص ۴۹۸

کامل قریشی

ذاکر حسین : ایک سوانحی خاکہ

ذاکر صاحب کے آباو اجداد آفریدی پٹھان تھے، پٹھانوں کی بستیاں یوں تو سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے دور (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء) کے دوران پٹیالی اور کمپل (ضلع ایٹہ اور فرخ آباد) میں آباد کردی تھیں جو رفتہ رفتہ مسلسل پھیلتی رہیں لیکن ۱۸ ویں صدی کے اوائل میں خیبر اور کوہاٹ کے بہادر اور جنگ جو پٹھان فرخ آباد کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہوئے اس علاقے میں بنگش قبیلے کے ایک سورما نوجوان محمدؐ احمد خاں نے اپنی شجاعت اور بہادری کے سبب زبردست نام پیدا کیا تھا اس نے فرخ سیر کو اس کی تخت نشینی کی جدوجہد میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدد کی تھی اور فرخ سیر کے برسر اقتدار آجانے کے بعد نواب کا خطاب پایا تھا خطاب، جاگیر اور منصب چار ہزاری پانے کے بعد اسی محمد احمد خان بنگش نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد اور اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا تھا اور اس طرح ان علاقوں میں خیبر اور کوہاٹ سے آفریدی پٹھان مسلسل آآ کر آباد ہوتے رہے اور زیادہ تر قائم گنج میں اپنے محلے بناتے رہے اس علاقے میں اکثریت کے ساتھ ان پٹھانوں کی آبادی ہوئی جن کا کام میدان جنگ میں اپنے کارنامے دکھانا اور سورمائی کے کمالات پیش کرتا ہوتا تھا۔ اور اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر سپاہیانہ شجاعت کی داد و تحسین حاصل کرتے تھے انہی آفریدی پٹھانوں کے ورثا کے طور پر آج تک بھی قائم گنج میں وہ خاندان آباد ہیں جن کی رگوں میں پٹھان خون موجود ہے اور جو اپنی شجاعت، غیرت، حمیت اور بات کے دھنی ہونے کے لیے مشہور ہیں۔ قائم گنج کے مردم خیز علاقے میں پتورہ نامی گاؤں کے ایک

محلے مول خیل سے ذاکر صاحب کے خاندان کا تعلق ہے یہیں ان کا آبائی مکان ہے اور اسی علاقے میں ان کی کاشتکاری کی زمینیں بھی تھیں۔ قائم گنج کا پرانا نام منور شید آباد تھا اور اسی کو پرانی ڈانگ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کے مورثِ اعلا کا تعلق تورکا کا کے قبیلے سے ہے جن کو اس کے آخون یعنی مذہبی پیشوا یا استاد یا گرو ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے دو مشہور بھائی تھے حسن اور حسین، حسین مدہ آخون یعنی بڑے استاد کے طور پر مشہور تھے۔ جو اس علاقے میں آنے سے پہلے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتے تھے یہاں بھی انھوں نے معلمی ہی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ ایک صوفی صافی اور پاکباز انسان تھے، پٹھان ان سے روحانی طور پر اس حد تک متاثر تھے کہ بہت سوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔

آج بھی قائم گنج کے قدیم قبرستان نند وخاں میں ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے لوگ وہاں نذر عقیدت پیش کرنے آتے ہیں انہی مدہ آخون حسین سے ذاکر صاحب کے خاندان کا براہِ راست تعلق ہے اور انہی مدہ آخون حسین سے ذاکر صاحب کے افراد خاندان کے ناموں کے ساتھ حسین لکھا جاتا ہے۔ مدہ آخون حسین کے بیٹے احمد حسین خاں تھے اور ان کے بیٹے محمد حسین خاں، محمد حسین خاں کے بیٹے غلام حسین خان عرف حجمن خان، ذاکر صاحب کے دادا تھے جو نہایت درویش صفت تھے اور فقیروں کی صحبت میں رہتے تھے اور خصوصاً دو بزرگوں کرم علی شاہ اور بنس بہاری سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ غلام حسین خان کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے ایک بار وہ اپنا مکان تعمیر کرا رہے تھے کہ کسی بات پر کسی مزدور کو جھڑک دیا، ان کے پیر و مرشد کو پتہ چلا تو وہ غلام حسین پر بہت ناراض ہوئے اور ان سے کہا کہ حسین اگر اس نو تعمیر مکان میں تم اور تمہاری اولاد عیش و آرام سے رہنا چاہتی ہے تو مزدور کو جھڑکنے اور سخت و سست کہنے کے کفارے کے طور پر متھرا میں سنت سادھوؤں کی سنگت میں رہ کر کچھ دن گزارو اور جب تمہارے دل سے گناہ کی کثافت کا احساس دور ہو اور ضمیر مطمئن ہو جائے تو پھر واپس آکر مکان مکمل کرانا، غلام حسین نے مرشد کے حکم کی تعمیل میں متھرا کا سفر کیا وہاں سادھو سنتوں کی صحبت میں رہے اور ایک اچھے خاصے عرصے کی تپسیا کے بعد جب ان کے قلب کو سکون ملا تو واپس ہوئے اور مکان کی تعمیر مکمل کرائی۔

ان ہی غلام حسین خاں عرف جھمن خاں کے دو لڑکے عطا حسین خان اور فدا حسین خاں تھے، عطا حسین خان فوج میں رسالدار تھے اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی چھوٹے بیٹے فدا حسین خاں کی پیدائش ۱۸۶۸ء میں ہوئی وہ بعمر بیس سال تجارت کے شوق میں حیدرآباد چلے گئے اور وہاں مراد آبادی برتنوں کا کام شروع کر دیا لیکن حصول تعلیم کا شوق دل میں پھر پیدا ہوا تو پڑھنے لکھنے میں مصروف ہوئے اور قانون کا امتحان پاس کر کے اورنگ آباد میں وکالت شروع کر دی، ساتھ ہی "آئین دکن"، کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا، وکالت اور رسالہ دونوں خوب چلے اور ان کی شہرت دکن بھر میں ہو گئی تو حیدرآباد آ گئے اور بیگم بازار کے علاقے میں جہاں تجارت کا آغاز کیا تھا وہیں دفتر بنا لیا اور پھر اسی جگہ زمین لے کر مکان بھی تعمیر کرا لیا اس مکان میں وکالت کا دفتر، کتب خانہ، اخبار کا دفتر اور اپنی رہائش گاہ سب کچھ منتقل کر لیا، فدا حسین خاں کی شادی قائم گنج کے کلال خیل کے نبی داد خاں کی لڑکی نازنین بیگم سے ہوئی، نبی داد خاں شریف، نیک اور نہایت حلیم آدمی تھے ایسی ہی طبیعت ان کی بیٹی نازنین بیگم نے پائی تھی وہ سیرت و صورت دونوں اعتبار سے سادہ مزاج، بردبار، پاکباز، متواضع اور نیکی و شرافت کا نمونہ تھیں، فدا حسین اور نازنین بیگم کی یہ جوڑی طبیعتوں کے میلان اور عادات و اطوار کے لحاظ سے آفتاب و ماہتاب کی طرح تھی۔ ان فرشتہ صفت میاں بیوی کے باہمی رشتۂ ازدواج کے نتیجے میں فدا حسین کے گھر سات لڑکے ہوئے جن کی ترتیب یہ ہے مظفر حسین، عابد حسین، ذاکر حسین، زاہد حسین، یوسف حسین، جعفر حسین اور محمود حسین۔ بڑے بھائی مظفر حسین صرف تیس برس جیے جو شادی شدہ تھے اور ان کی اولاد میں دو لڑکے امتیاز حسین اور مسعود حسین اور ایک لڑکی فاطمہ بیگم ہوئے، امتیاز حسین خاں نے ۱۹۶۶ء میں انتقال کیا۔ مسعود حسین خاں علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے اور ابھی بفضل خدا حیات ہیں۔ مظفر حسین خاں سے چھوٹے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین کا انتقال بعارضۂ تپ دق علی گڑھ میں ہی دوران تعلیم ہو چکا تھا، جعفر حسین بھی صغر سنی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ یوسف حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہے پھر کچھ عرصے کے لیے مرکزی حکومت کی تعلیمی اسکیم کے تحت شملے میں رہے پھر غالب انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی سکریٹری ہوئے۔ روح اقبال، اردو غزل، فرانسیسی ادب اور یادوں کی دنیا کے علاوہ انھوں نے کافی دوسری تصنیفات و تالیفات کیں، انتقال کر چکے ہیں اولاد

میں راشد، اور اجمل حسین ان کی یادگار ہیں سب میں چھوٹے بھائی محمود حسین خاں نے تاریخ میں جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے، سلطان ٹیپو کے فوجی نظام پر کام کیا، وہابی تحریک پر تحقیق کی۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر اور وائس چانسلر رہے اور پھر پاکستان کے وزیر تعلیم بھی بنے، انتقال کر چکے ہیں۔ ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین کی پیدائش قائم گنج میں ۱۸۹۳ء میں ہوئی ان کے علاوہ باقی سب بھائی حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی سلسلے کے حساب سے ذاکر صاحب کا نمبر تیسرا ہے جن کی ۸/ فروری ۱۸۹۷ء مطابق (۶/ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ بروز پیر) کو حیدرآباد میں ولادت ہوئی، ذاکر صاحب کے والد فدا حسین حیدرآباد میں سخت بیمار ہو جانے کی وجہ سے اپنے وطن قائم گنج میں لوٹ آئے جہاں ۱۹۰۷ء میں بعمر ۳۹ سال انھوں نے وفات پائی اور اس خاندان کی سرپرستی کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی عطا حسین خاں کے سپرد ہوئی جنھوں نے اپنے انتقال ۱۹۱۰ء تک بحسن و خوبی ذمہ داری کے فرائض انجام دیئے اور پھر تمام بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ان کے خالو حسن الدین خاں نے کی۔

والد کے انتقال سے قبل حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں ذاکر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی شروع ہو گئی تھی اور اس طرح اونچے خاندان کے بچوں کی طرح ذاکر صاحب گھر پر رہ کر انگریز ٹیوٹر کے ذریعہ پڑھے، والد کے انتقال کے بعد جب قائم گنج آئے تو انھیں مولوی بشیر الدین کے قائم کردہ (۱۸۸۹ء) اٹاوے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا، یہاں ذاکر صاحب کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین کی سرپرستی ملی۔ ذاکر صاحب پر سید الطاف حسین کی نیکی، شرافت، اعلا سیرت و کردار اور خلوص و محبت کے نقوش اس قدر گہرے پڑے تھے کہ انھوں نے زندگی بھر ان کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی ترقی کی راہیں روشن کیں اور سید صاحب کی یاد اپنے دل سے کبھی محو نہیں ہونے دی وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے محسنوں کو جب یاد کرتے تو سید الطاف حسین کا نام سرفہرست ہوتا اسی اسکول کے ان کے دوسرے استاد سید شرف الدین یاس بھی تھے جو دین و مذہب شعر و ادب اور اپنے کٹر نیشلسٹ خیالات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ذاکر صاحب کی زندگی پر ان کے بھی اثرات پڑے اسی کی وجہ سے ذاکر صاحب میں علم و ادب، تحریر و تقریر بحث مباحثہ کا شوق پیدا ہوا نیز قومی و ملی مسائل میں دلچسپی کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا علاوہ ازیں اس زمانے کی ترکی کے

جنگی حالات نے مسلمانان ہند میں غیر معمولی قومی و اسلامی بیداری پیدا کر دی تھی ذاکر صاحب ترکی کی امداد کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کے لیے اسکول کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جوشیلی تقریریں کرتے، ان کی توجہ ترکی کے مظلومین کی طرف مبذول کراتے اور نہایت سرگرم رہ کر ان میں اسلامی غیرت وحمیت پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے، اسکول کے لڑکوں کے علاوہ ذاکر صاحب کی اپیل پر اٹاوے کے مسلمان گوشت کھانا بند کر کے ترکی کے امدادی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیتے تھے اور ذاکر صاحب یہ چندہ ترکی فنڈ میں بھیج دیا کرتے تھے ترکی کی جنگ کے واقعات سے جہاں ان کو عالم اسلام کے واقعات سے واقفیت ہو رہی تھی وہاں وہ اخباروں بالخصوص ریانیر، وغیرہ کے ذریعہ مختلف سیاسی وسماجی معلومات فراہم کر رہے تھے ۱۹۱۱ء میں طاعون کی وبا پھیلی جس میں گھر کے گھر ویران ہوئے اور یہ گھر بھی لپیٹ میں آگیا، دوسرے رشتہ داروں، عزیزوں کے علاوہ ذاکر صاحب کی والدہ بھی اس وبا کی شکار ہو گئیں اور ان کی دنیا تیرو تار ہو گئی، ذاکر صاحب کی والدہ نے ان پر اپنی شخصیت کے نہایت گہرے نقوش چھوڑے تھے اسی دور میں ذاکر صاحب ایک صوفی بزرگ پیر حسن شاہ سے بھی بیعت ہو گئے تھے اور ان کی صحبتوں سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے حسن شاہ کو بھی مرید سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ ذاکر صاحب کی بیماری کے زمانے میں دوا اور دعا دونوں میں شریک رہتے تھے، صوفی حسن شاہ کا بھی ذاکر صاحب نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول سے ذاکر صاحب فارغ ہوئے تو انھوں نے ۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ یہاں داخل ہونے سے قبل ان کے دو بڑے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین پہلے ہی سے طالب علم کے طور پر موجود تھے ۱۹۱۵ء میں ذاکر صاحب کے بڑے بھائی نے قائم گنج میں ہی شاہ جہاں بیگم سے ان کی شادی کر دی تھی جن سے ان کی تین لڑکیاں ہوئیں۔ سعیدہ بیگم، صفیہ بیگم اور رقیہ ریحانہ۔ رقیہ ریحانہ پانچ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ سعیدہ بیگم کی شادی جناب خورشید عالم خاں سے ہوئی اور صفیہ بیگم ظل الرحمٰن شاہ جہاں پوری سے بیاہی گئیں۔

علی گڑھ کا داخلہ ذاکر صاحب کے لیے ایک نئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ انھوں نے قوم وملت کے اس بڑے تعلیمی ادارے میں آکر دنیا کو ایک نئے انداز سے دیکھا، وہ ساتھیوں سے ملے ان میں رہے نئی چیزوں اور نئے مسائل سے واقف ہوئے اور اپنی معلومات

میں اضافے کرتے رہے۔ انھوں نے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے ایف اے کا امتحان سائنس سے پاس کیا اور پھر لکھنؤ اس لیے چلے گئے کہ وہاں میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا امتحان پاس کریں لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی وہ بیمار پڑ گئے اور جسمانی و ذہنی الجھنوں کا شکار ہو کر قائم گنج واپس ہوئے لیکن جب صحت یاب ہوئے اور انھیں اپنی زندگی کی اس بندش کو پھر ایک سال بعد دوبارہ علی گڑھ میں داخلہ لیا اور اس بار سائنس کے مضامین کے بجائے آرٹس کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں بی۔اے پاس کرنے کے بعد اقتصادیات کے ایم۔اے کے ساتھ قانون کے کورس میں بھی داخلہ لے لیا۔ بی۔اے میں ان کے پاس انگریزی، ادب، فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین تھے اس لیے ایم اے میں اقتصادیات لینا پسند کیا اور قانون سے انھیں گہرا شغف تھا اس لیے قانون کا مطالعہ یوں ضروری تھا۔

ذاکر صاحب نہایت ذہین، ہوش مند اور سمجھ دار طالب علم تھے وہ کتابوں اور کلاسوں سے اس زمانے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن لائبریری، ریڈنگ روم اور خاص کتابوں کے علاوہ معلومات عامہ سے انھیں گہری دلچسپی تھی اور ان کی یادداشت اس قدر بلا کی تھی کہ جو ایک بار پڑھ لیا وہ ذہن نشین ہو گیا وہ امتحان کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ ذہن پر کتابوں اور نوٹس وغیرہ کو بار بناتے تھے مگر جب لگ کر یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کے لیے بیٹھ جاتے تھے تو پھر ان سے بڑا پڑھنے والا اور کامیاب ہونے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ رشید احمد صدیقی ان کی ان تمام سرگرمیوں اور معمولات کے رازدار ہیں۔ انھوں نے "ہمارے ذاکر صاحب" کے صفحات میں ایسے نہ جانے کتنے ہی پردے اٹھائے ہیں ان کا بیان ہے:

> "جو بات ذاکر صاحب کو ممتاز کرتی وہ یہ تھی کہ یہ کورس کی کتابیں نہ خریدتے تھے نہ پڑھتے تھے، زیادہ وقت ادھر ادھر گھومنے یا جہاں تہاں بیٹھ کر خوش گپیوں میں گزار دیا کرتے تھے لیکن لٹن لائبریری اور یونین کے دارالمطالعے کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا، رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہو جاتی تو معلوم ہوتا کہ ہندوستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ پرائیوٹ یا پبلک یا ادویات کا اشتہار ایسا نہ تھا جس کی ان کو خبر نہ ہو"[1]

ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے ماحول میں تحریر، تقریر، بحث مباحثہ، سیاسی و سماجی معاملات کو سمجھنے اور زندگی کے نشیب و فراز سے فاتحانہ انداز کے ساتھ گزرنے کی تربیت حاصل ہوئی یہیں ان کو ایسے دوست ملے جن کی یادیں ہمیشہ ان کی زندگی کا حصہ بنی رہیں۔ یہیں کی یونین کے ماحول کے تحت وہ ایسے جادو بیاں مقرر بنے جس کا کوئی منتر خالی نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنی بات کو، اپنے نقطۂ نظر کو اور اپنے خیال کو منوانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ اور انھیں اپنے انداز بیان سے مخالف سے مخالف ماحول کو اپنا کر لینے کا سلیقہ آتا تھا۔ ان کے ایسے معرکوں کا ذکر ان کے ہمجولیوں اور ہمدموں نے بعض جگہ کیا ہے جس سے ان کی ذہانت، موقع شناسی حاضر جوابی اور ذکاوت کے کمالوں پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ علی گڑھ کے اسی طالب علمانہ دور کی ان کی وہ خدمات اور یادگار روشن ہیں جو انھوں نے طلبا کی ترقی، یونیورسٹی کی تعمیر و اصلاح، استادوں اور شاگردوں کے درمیان محبت اور ادب و احترام کے گہرے رشتوں کی کوشش، ڈیوٹی۔ سوسائٹی کے لیے جدوجہد، یونین کی کارکردگی میں غیر معمولی دلچسپی اور طلبا کے لیے یونیورسٹی سے بہت سی سہولیات و آسانیاں فراہم کرنے کے تحت انجام دیں، وہ تعلیمی مصروفیات کے علاوہ اپنے احباب کے ساتھ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے ماہانہ رسالے علی گڑھ منتھلی میں زپ کے فرضی نام سے مضامین لکھتے تھے، مباحثوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ تقریر کے فن میں ان کا لوہا سب مانتے تھے اور اسی زمانہ طالب علمی میں انھوں نے افلاطون کی کتاب PLATO REPUBLIC کا اردو ترجمہ ریاست کے نام سے اتنی شاندار، سلیس اور دلکش اردو میں کیا تھا کہ ان کے اُس دور کے ساتھی اور اردو ادب کی مشہور و معروف ہستی مولانا اقبال سہیل نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ۔

"افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔" [1]

اردو کے ساتھ ان کی انگریزی کا بھی جواب نہ تھا وہ اپنی تحریر و تقریر میں اردو انگریزی دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں مسلم یونیورسٹی

---

[1] آشفتہ بیانی
ذاکر صاحب ص ۳۶

کے پرو وائس چانسلر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ:۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر کا بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بیشتر اراکین سے کیا جاسکتا ہے"[1]

ذاکر صاحب جب ایم۔ اے (اقتصادیات) کے آخری سال میں آئے تو ان کا تقرر اکیناملکس کے جونیر لکچرار یا اسٹوڈنٹ لکچرر کے طور پر ہو گیا تھا، اس دور میں خلافت کی تحریک شروع ہو گئی اور اسی کے ساتھ تحریک ترک موالات کی تیز تر سرگرمیوں کا بھی آغاز ہوا، یہیں سے وطن کی جنگ آزادی اور انقلاب ملک نے ایک نیا ہنگامہ خیز موڑ لیا۔ تحریک خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زور سے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طوفان کھڑا ہو گیا اور ہندوستانیوں میں اتحاد و اتفاق کی اس قدر گہری لہر پیدا ہوئی کہ ایسی مثال تاریخ جنگ آزادی میں پہلے نہیں ملتی تھی۔ ہندوستان بھر کے مختلف طبقوں کے علاوہ تعلیمی ادارے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ علی گڑھ کالج جو برطانوی حکومت کے حلیفوں کا مرکز کہا جاتا تھا یہاں بھی طلبا میں دو گروپ بن گئے اور ایک انقلابی گروپ کی طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ علی گڑھ برطانوی حکومت کی امداد لینا بند کر دے اور تمام امدادی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے ان طلبا کو یہ توجہ دلانے والے قائد حکیم اجمل خاں اور علی برادران تھے جب علی گڑھ کالج کے کارپردازوں پر کوئی بات کارگر نہیں ہوئی تو قائدین ملت نے براہ راست رجوع کرنے کے لیے پیش رفت کی اور تحریک خلافت کے حامی طلباء نے یونین سے خطاب کرنے کے لیے مہاتما گاندھی، علی برادران، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو دعوت دی جنھوں نے ۲۰/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو طلباء کے سامنے اپنا نقطۂ نظر واضح طور میں رکھ کر اپنا موقف منوالیا اور انجام کار ذاکر صاحب اور ان کے کچھ انقلابی ساتھیوں نے علی گڑھ کالج کو خیر آباد کہہ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ ہی میں رکھی جس میں علی برادران، حکیم اجمل خان، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب پیش پیش تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی

---

[1] آشفتہ بیانی

مقرر کئے گئے اور ذاکر صاحب ان کے مددگار کے طور پر شریک رہے تقریباً دو برس تک وہ جامعہ ملیہ کے اساتذہ و طلباء کے ساتھ گھل مل کر کام کرتے رہے اور پھر ۱۹۲۲ء میں معاشیات کی اعلا تعلیم کے لیے (برلن) جرمنی روانہ ہو گئے برلن میں انھیں پروفیسر رومبارٹ اور اسپرنیگر کی سرپرستی نصیب ہوئی اپنے قیام کے دوران وہ جرمنی کے ہندوستانیوں کی انجمن کے صدر مقرر ہوئے یہیں ان کی ملاقات مسٹر چٹو پادھیائے برادر مسز سروجنی نائیڈو سے ہوئی اور یہیں ان کے دن رات کے ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر مجیب تھے جن کا بعد میں زندگی بھر ساتھ رہا۔ برلن میں انھوں نے جرمن زبان پر قدرت حاصل کی ایک کتاب مہاتما گاندھی کے پیغام اور مقصد حیات سے متعلق انھوں نے لکھی اور چھاپی اور اپنی تقریروں تحریروں اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ مہاتما گاندھی اور ان کے مشن سے متعلق لوگوں کو واقفیت بہم پہونچائی۔ ان مصروفیات کے علاوہ انھوں نے برلن ہی میں دیوان غالب، اور دیوان حکیم اجمل خان شیدا بھی چھپوائے، برلن میں ذاکر صاحب نے تقریباً تین سال کا عرصہ گزارا اور معاشیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے علاوہ بے پناہ مشاہدہ، گہرا تجربہ اور مغربی دنیا کے حالات کا مطالعہ و جائزہ لے کر وطن لوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ادھر ملک میں حالات تیزی سے بدلے اور تحریک خلافت سرد پڑنے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی بددلی کا شکار ہونے لگی ایسے حالات میں اراکین جامعہ اسے بند کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ذاکر صاحب نے جرمنی سے تار دیا کہ جامعہ کو بند نہ کیا جائے وہ اور ان کے ساتھی جامعہ کے لیے خود کو وقف کرنے کی قسم کھا چکے ہیں اس یقین دہانی اور مہاتما گاندھی کی ہمت افزائی پر جامعہ کو بند کرنے کا ارادہ ترک ہوا اور ذاکر صاحب ہندوستان جب واپس آئے تو علی گڑھ سے اسے گاندھی جی کی رائے کے مطابق قرول باغ دہلی منتقل کر دیا گیا۔ اور ذاکر صاحب شیخ الجامعہ بنائے گئے اور اس کے تنِ بے جان کو نئی زندگی ملی۔ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور دوسرے اساتذہ نے قومی جوش اور ملّی فرض کے پیش نظر نہایت قلیل تنخواہوں پر جامعہ کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا، ذاکر صاحب، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور جامعہ کے دوسرے ساتھیوں نے اسے اٹھانے کے لیے تن من کی بازی لگا دی۔ اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی جدّوجہد کی اور ملک کے مختلف حصّوں سے مالی امداد اور چندہ

وغیرہ جمع کر کے جامعہ کو چلایا جاتا رہا اس کی مستقل مدد کے لیے اجمل جامعہ فنڈ قائم ہوا نیز انجمن تعلیم ملی کا قیام عمل میں لایا گیا اور ملک کے دورے کئے گئے، اسے چلانے کے لیے ڈاکٹر انصاری ذاکر صاحب اور جمنالال بجاج پیش پیش رہے۔

جامعہ کے اس قومی و ملی اور تعلیمی کام میں ذاکر صاحب کا سابقہ اور ملک و قوم کے عظیم رہنماؤں سے ہو رہا تھا خاص طور پر وہ حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے ان کی زندگی پر اپنی سادگی، تپ، تیاگ اور قربانی کے اعلا اوصاف کی وجہ سے حکیم اجمل خاں صاحب نے بڑے گہرے نقوش چھوڑے تھے وہ ان کی ملت کے لیے تعلیم کی کوشش عوام میں بیداری کی جدوجہد اور ہندوستانیوں کی تعمیر و ترقی کے لیے دوڑ دھوپ سے بہت متاثر تھے، اسی طرح وہ مہاتما گاندھی کی ذات کو ملک و قوم کے لیے ایک ایسی مشعل راہ سمجھتے تھے جس کی روشنی ملک کے لیے بے انتہا ضروری تھی انھوں نے کہا تھا کہ:۔

"میں نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز گاندھی جی کے قدموں میں بیٹھ کر کیا تھا اور وہی میرے پیر و مرشد تھے" [1]

انھوں نے گاندھی جی کی تعلیمات اور اپنے آدرشوں کے پیشِ نظر ایک بار یہ بھی کہا تھا:۔

"انفرادی اور سماجی طور پر سادہ و پاک زندگی بسر کرنا، پسماندہ اور کم روز افراد کے ساتھ حقیقی اور پر خلوص ہمدردی کا اظہار کرنا اور ہندوستان کے مختلف طبقوں میں اتحاد و وحدت پیدا کرنا میرے آدرش رہے ہیں" [2]

یہ سب کچھ انھوں نے زندگی میں اپنے آدرش بنا کر قدم قدم پر برتا اور عمل میں لائے انھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ حکیم اجمل خاں کے لیے بھی ایک بار یوں اظہار کیا تھا:

"گاندھی جی کی حق بینی حق شناسی حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنا دیا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروت صبر و حلم نے اس پر جلا کر دی" [3]

---

[1] ذاکر صاحب ص۔ ۵۔ [2] ذاکر صاحب ص۔ ۵۔ [3] نقوش شخصیات نمبر۔

ذاکر صاحب نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ جامعہ کی ترقی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک ادارے کو زندگی دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے اور اس میں اپنے وقت، انرجی، صحت اور پوری زندگی کو اس طرح کھپایا کہ وہ صرف جامعہ کے ہو کر رہ گئے اور شب و روز کی جدّوجہد سے جامعہ کو معراجِ کمال پر پہونچانے میں ہر قسم کے جتن کیے، ان کی کوشش سے حیدرآباد دکن کے دورے سے مالی امداد میں بہت کامیابی ہوئی اور جامعہ کے لیے اوکھلے کی زمین خریدی گئی۔ جہاں یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو جامعہ کی نئی عمارتوں کی سنگِ بنیاد ایک چھوٹے بچے کے ہاتھوں رکھا گیا۔

مہاتما گاندھی کے ایماد سے ذاکر صاحب نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ایک نیا انقلاب لانے کے لیے واردھا اسکیم تیار کی چونکہ اس سلسلے میں ۲۱/۲۲/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مہاتما گاندھی کی صدارت میں بمقام واردھا یہ کانفرنس منعقد کی گئی اس لیے اس نئی تعلیمی اسکیم کا نام واردھا اسکیم پڑا، اس کے صدر ذاکر صاحب مقرر ہوئے اور دیگر ممبران کے طور پر اس میں ملک کے مشہور ماہرینِ تعلیم کو شامل کیا گیا۔ یہ اسکیم جب عوام کے سامنے آئی تو اس پر نکتہ چینی اور اعتراض شروع ہو گئے جن کے مختلف جلسوں، اجلاسوں اور کانفرنسوں میں جواب دیئے گئے جس کی تفصیل کے لیے وقت درکار ہے چنانچہ اس سے قطع نظر اتنا کافی ہے کہ واردھا اسکیم کے علاوہ ذاکر صاحب کے زیرِ قیادت ہی ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا بھی قیام عمل میں آیا اور اس طرح ملک و قوم نئے تعلیمی ڈھانچے کے تجربے سے گزرے، چنانچہ جامعہ نے واردھا اسکیم کے تجربے کی روشنی میں اپنے تربیتی مرکز کھولے انھی مختلف منزلوں سے گزرتی ہوئی جامعہ ذاکر صاحب کے ان الفاظ کی مکمل تصویر بنی جسے ذاکر صاحب نے مقصد سے تعبیر کیا ہے:

> "ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہبِ اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے اس کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے۔" [1]

بڑھتی ہوئی ترقی کے ساتھ ساتھ جامعہ میں عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، علمی و ادبی

---

[1] رسالہ جامعہ دسمبر ۱۹۶۳ء

دل چسپیوں کو فروغ ہوا، ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی سرگرمیاں تیز ہوئیں اس دوران جنگِ عظیم ثانی شروع ہوئی اور ادھر جنگ آزادی کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہونے لگی اور ساتھ ہی ملک میں فرقہ واریت کا زہر اور علاحدگی کے رجحانات بھی فروغ پانے لگے۔ ادھر جامعہ ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہو گیا تھا اور اس کی جوبلی کا جشن منانے کے لیے نومبر ۱۹۴۶ء کا وقت طے کیا جا چکا تھا جس کے لیے ملک کے بیشتر مقامات سے مالی امداد اور چندے کی کوششیں ہو رہی تھیں چنانچہ ۱۵/نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ کی جوبلی تقریبات کا آغاز ہوا، اور اس کے خاص دن ۱۷/نومبر ۱۹۴۶ء کو کانگریس اور لیگ کے سربرآوردہ قائدین ایک ہی ڈائس پر موجود تھے اور یہ صرف ذاکر صاحب کے اتحاد پسند مزاج، صلح کل طبیعت اور جمہوری انداز نظر کے سبب ہی تھا ۱۹۴۶ء میں ہی عارضی حکومت کے قیام کے وقت ذاکر صاحب کو وزارت میں دعوت دی گئی تو انھوں نے انکار کر دیا اور جب عارضی حکومت کا تجربہ ناکام ہوا اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو جامعہ میں آزادی کی تقریبات قومی وقار کے ساتھ منائی گئیں انھیں دنوں ذاکر صاحب شدید علالت کے سبب اپنے ڈاکٹروں کے مشورے سے کشمیر روانہ ہوئے تو جالندھر کے اسٹیشن پر فسادیوں نے انھیں ٹرین سے اتار کر زدوکوب کیا اور بندوق کی نال ان کے سینے پر رکھ دی، کچھ لوگوں کے پہچان لینے کی وجہ سے جان تو بچ گئی لیکن سامان سب لٹ گیا جب وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر دہلی آئے تو شہر فسادات کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور مسلمانوں کا کشت و خون کیا جا رہا تھا ان حالات میں جامعہ اور اہل جامعہ کو بھی شدید خطرے تھے، ذاکر صاحب نے ایسے عالم میں مظلومین کی مردانہ وار خدمت کی جو ۱۹۴۷ء کے ہولناک دنوں کی تاریخ میں یادگار ہے۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی وجہ سے جس تباہی و بربادی سے ملک و قوم کو گزرنا پڑا وہ تو اپنی جگہ، لیکن اس سے سب سے شدید ضرب ہندوستان کے قومی تعلیمی اداروں پر پڑی اور اس کا سب سے بڑا نشانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بننے کا خطرہ پیدا ہو گیا، اس کو طرح طرح سے مطعون کیا جانے لگا اور اس پر بڑی نظریں پڑنے لگیں اور خدشہ اس بات کا تھا کہ کہیں یہ ادارہ حالات کا شکار نہ ہو جائے اور کہیں اس کے سربراہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اس سے ہاتھ نہ اٹھا لیں چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما سے اس آڑے وقت میں ذاکر صاحب یونیورسٹی کی دستگیری کے لیے آگے بڑھے اور ۱۹۴۸ء میں

بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ پہونچ کر اہم ذمہ داری سنبھالی۔

ذاکر صاحب کا علی گڑھ کا دور (۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۶ء) اپنی جگہ تعمیری اعتبار سے بڑا تابناک اور تاریخی ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے دفتر درکار ہے لیکن اختصار کے ساتھ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ذاکر صاحب کے علی گڑھ آجانے کے بعد وہ خطرے ٹل گئے تھے جن سے علی گڑھ دوچار تھا وہ شبہات اور شکوک دور ہونے لگے تھے جنھوں نے علی گڑھ کو گھیر لیا تھا زندگی نئی فضاؤں میں پھر نظر آنے لگی تھی اور کارواں پھر چل پڑا تھا۔ اس برے وقت میں ذاکر صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے ایک بڑا سہارا بنی اور علی گڑھ کو وہ سب کچھ ملنے لگا جس سے اس کے محروم ہو جانے کا خوف تھا، ذاکر صاحب کے دم سے وہ غلط فہمیاں دور ہوئیں جو علی گڑھ، علی گڑھ قوم اور علی گڑھ یونیورسٹی سے متعلق علی گڑھ کے بدخواہوں میں موجود تھیں۔ ذاکر صاحب کا دور وائس چانسلری ایک اعتبار سے یونیورسٹی کے لیے نئی زندگی کا دور ہے، تعمیری دور ہے اصلاحی دور ہے اور قوم کے کارواں کو مسلسل آگے بڑھاتے رہنے کا دور ہے۔ اس کا اگر صحیح اندازہ لگانا مقصود ہے تو اس دور کی تاریخ کے اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ہر شے واضح اور روشن نظر آسکتی ہے، اپنی وائس چانسلری کے دور میں ہی وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر تھے اور انھوں نے اپنی رہنمائی میں اردو والوں کے پچاس ساٹھ لاکھ دستخط اس دور کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کو پیش کئے تھے۔

۱۹۵۶ء میں کچھ ناموافق حالات کے تحت اور اپنی دوسری ٹرم ختم کرنے سے کچھ قبل ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہونا چاہا تو انھیں اپنی ٹرم تک رہنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ مُصر رہے اور خرابیٔ صحت اور علالت کی وجہ کا اظہار کر کے سبکدوش ہوئے اور پھر کچھ دنوں آرام کے بعد مولانا آزاد کی خواہش پر یونسکو کانفرنس میں شریک ہونے وہاں سے پیرس اور پھر جرمنی چلے گئے اسی دوران اپنے علاج کی طرف بھی متوجہ ہوئے ابھی وہ جرمنی سے سوئٹزرلینڈ ہی پہونچے کہ انھیں پنڈت نہرو کا پیغام ملا کہ جلد وطن لوٹ اور بہار کی گورنری سنبھالو چنانچہ ہندوستان لوٹ کر انھوں نے گورنر بہار کی حیثیت سے جولائی ۱۹۵۷ء میں چارج لیا اور پانچ سال اس عہدے پر متمکن رہ کر بہار کی کایا پلٹ دی ایسے سرکاری وغیر سرکاری، علمی وادبی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی کام انجام دیئے کہ بہار کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے وہ جب تک بہار میں ایک منتظم اعلا کے طور پر رہے وہاں کی

حکومت کا استحکام حاصل رہا، اصلاحات کا کام برابر جاری رہا، بہار کے تمام طبقے ان کی کارکردگی، حُسنِ انتظام اور کارناموں سے اس قدر خوش تھے کہ آج تک ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء کا زمانہ یاد کرتے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں ذاکر صاحب کی گورنری ختم ہوئی اور ادھر ۱۹۶۲ء میں جنرل الکشن کے نتیجے میں کانگریس کو ایک بار پھر غالب اکثریت حاصل ہوئی اور اس دوران ان کی صحت بھی بہت بہتر ہو چکی تھی تو پنڈت نہرو کی تحریک پر کانگریس کے جہاں ڈاکٹر رادھا کرشنن کو صدارت کے لیے نامزد کیا وہاں ذاکر صاحب کا نام نائب صدر جمہوریۂ ہند کے طور پر تجویز کیا۔ ۷/مئی ۱۹۶۲ء کو ذاکر صاحب کا الکشن ہوا اور وہ نائب صدر جمہوریہ چن لیے گئے اور انھوں نے اپنے دورِ نائب صدارت میں راجیہ سبھا کی صدارت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے کر اسے بھی یادگار بنا دیا، علاوہ ازیں وہ فرائض جو نائب صدر کو انجام دینے ہوتے ہیں مثلاً تقریبات کا افتتاح، صدارتیں، اجرا کی رسمیں، عظیم بیرونی مہمانوں کا خیر مقدم، بیرونی ملکوں کے دورے، صدر کی غیر حاضری میں صدر کے فرائض کی انجام دہی، حکومت کی نمائندگی، کانفرنسوں میں شرکت کنووکیشنوں کے ایڈریس وغیرہ پڑھنا یہ سب کام بھی بڑی خوش اسلوبی اور بڑی دلچسپی کے ساتھ انجام دیئے۔ افریقی اور عرب ممالک سے گہرے تعلقات قائم کرانے، معاہدے کرانے اور تمام سرکاری ذمہ داریوں کو نہایت اچھے انداز سے نبھاتے میں ذاکر صاحب نے ایک تاریخی رول ادا کر کے ملک کے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

ان کی غیر معمولی فرض شناسی، کارکردگی اور مقبولیت کی وجہ سے اب ملک و قوم کی نگاہیں ان پر صدر جمہوریۂ ہند کی صدارت کا بوجھ ڈالنے کے لیے اٹھ رہی تھیں ہر چند کہ ملک کی سیاسی صورت حال کافی تبدیل ہو چکی تھی اور کانگریس کے اندر اور باہر زبردست انقلاب رونما ہو چکا تھا لیکن شریمتی اندرا گاندھی کی تحریک اور ان کے سینیر کانگریسی ساتھیوں کی تائید پر جب ذاکر صاحب کو صدارت کے لیے نامزد کیا گیا تو اگر ایک طرف ملک میں خوشی و مسرت کا اظہار کیا گیا تو دوسری طرف فرقہ پرستوں کی صفوں میں ماتم کی فضا چھا گئی اور فرقہ پرستی نت نئے روپ بدل کر ظاہر ہوئی پھر بھی جیت سیکولرازم اور جمہوریت کی ہوئی، ذاکر صاحب ۹/مئی ۱۹۶۷ء کو صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہوئے اور ۱۳/مئی ۱۹۶۷ء کو انھوں نے صدارتی ذمہ داریاں سنبھالیں اور جمہوری طاقتوں میں ملک و بیرون ملک اس پر زبردست خوشی کا اظہار کیا گیا، دنیا کی عظیم

جمہوریت کا یہ عظیم عہدہ سنبھالنے کے بعد انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ نہایت پُراثر اور متاثر کن تھی جس کا لب لباب یہ ہے:۔

"سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا کنبہ، عوام نے کچھ عرصے کے لیے مجھے اس کنبے کا سربراہ منتخب کیا ہے۔ میں سچی لگن سے اس گھر کو مستحکم اور خوب صورت بنانے کی کوشش کروں گا تاکہ یہ ان عظیم لوگوں کے شایانِ شان بن سکے جو انصاف، خوش حالی اور شائستگی کی بنیادوں پر زندگی سنوارنے میں لگے ہیں۔"[1]

انھوں نے اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت بھی کر دیا کہ سارا ہندوستان واقعی ان کا گھر ہے اور اس کے باشندے ان کا کنبہ اور وہ اس کنبے کے سچے اور حقیقی سربراہ ہیں۔ یوں تو انھوں نے اپنی ہر ذمہ داری کو نبھانے کے لیے ہمیشہ فرض شناسی کا خیال رکھا لیکن اس عہدۂ جلیلہ کی عظمت کو چار چاند لگانے کے لیے وہ ہمہ وقت سرگرم و مصروف رہے اور اپنی شخصیت و خدمت سے انھوں نے ملک و قوم کی بھلائی کے لیے جو یادگار کارنامے انجام دیئے اور ہندوستان کی سیکولر و جمہوری اقدار کو مستحکم بنانے کے لیے جو سعی و جدوجہد کی وہ ان کے دورِ صدارت کی ایک ایسی داستان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی صدارت ہی کے دور میں انھوں نے غالبؔ صدی کو تاریخی اور یادگار طور پر منانے کے سامان پیدا کر کے پوری دنیا میں غالب کا ڈنکا بجایا تھا، آخر وہ وقت آپہونچا جو ہر ایک کے لیے مقرر ہے۔ چند روز پہلے ہی وہ ملک کے دورے سے واپس ہوئے تھے، ڈاکٹروں نے انھیں ایک ہفتے آرام کا مشورہ دیا تھا امید تھی کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد اپنا کام شروع کر دیں گے۔ ۳/مئی ۱۹۶۹ء کو وہ حسب معمول صبح چھ بجے اٹھے، انھوں نے وقت مقررہ پر ایک گلاس دودھ پیا پھر کچھ کاغذات وغیرہ دیکھے اور پھر کسی ایسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئے جسے وہ گزشتہ رات دیر تک پڑھتے رہے تھے تقریباً گیارہ بجے ڈاکٹر ان کے معائنے کو آئے اس کے کچھ دیر بعد وہ غسل خانے میں گئے اور جب خلاف معمول انھیں زیادہ وقت ہوا تو ان کے خدمت گار اسحاق نے آواز دی، جواب نہ ملنے پر دروازہ کھٹکھٹایا

---

[1] بحوالہ ذاکر حسین ص ۱۲۔

بالکل خاموشی پر دوسری طرف سے دروازہ کھولا گیا تو انھیں فرش پر گرا ہوا پایا ڈاکٹروں نے پہونچ کر انھیں ہوش میں لانے کی پوری کوشش کی لیکن سب بے سود، آخر گیارہ بج کر ۵۵ منٹ پر ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ ذاکر صاحب خدا کو پیارے ہو گئے گویا کہ آفتاب اپنی تابانیاں دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا۔ ذاکر صاحب ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ اس خبر سے ملک ہی نہیں بیرون ملک بھی صف ماتم بچھ گئی تھی، سارا ماحول غم و اندوہ میں ڈوب گیا تھا، ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ دو روز تک راشٹر پتی بھون کے دربار ہال میں ان کا جسد خاکی آخری دیدار کے لیے لا کر رکھ دیا گیا تھا، لاکھوں انسانوں نے ان پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے۔ ہر مذہب و ملت کے پیشواؤں نے انھیں خراج تحسین ادا کیا، مقدس مذہبی کتابوں کی تلاوت اور پاٹھ ہوئے اور سب نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے دلی احترام کا اظہار کیا۔

پورے قومی و سرکاری اعزاز کے ساتھ ۵/ مئی ۱۹۶۹ء کو ان کا جنازہ توپ گاڑی پر رکھ کر جامعہ لے جایا گیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کے لیے وہ زندگی بھر جد و جہد میں لگے رہے جس کی تعمیر و ترقی کے خواب عمر بھر دیکھتے رہے جس کے آدرشوں کو بنانے میں انھوں نے اپنے فکر و عمل اور کردار کے ذریعہ جہاد مسلسل کیا جس کو اپنے خون سے سینچا اور جس کی آبیاری کے لیے اپنے جسم و جان کھپا دیئے ان کا جسد خاکی آج اسی کی خاک کے سپرد کر دیا گیا اور ذاکر صاحب کی زندگی کا وہ سفر جو ۸/ فروری ۱۸۹۷ء میں شروع ہوا تھا ۳/ مئی ۱۹۶۹ء کو پورے ۷۲ سال کی جد و جہد، ایثار، تپ، تیاگ، وطن پرستی اور انسان دوستی سے بھری داستان بیان کرتا ہوا اپنی کامیابی کی بلندیوں پر ختم ہوا اور ہر طرف سے ایک ہی آواز آئی:

کارواں خوابوں کا تیرے روز و شب جاری رہے
تا ابد تیری لحد پر رحمتِ باری رہے

رشید احمد صدیقی

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال

اقبال کو معلوم نہیں کس عالم میں آبِ رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس کی یاد آئی۔ اس وقت ذاکر صاحب کے تصوّر کے ساتھ مجھے علی گڑھ یاد آرہا ہے اور کیوں نہ آئے جب بلاکشانِ علی گڑھ کے لیے آبِ رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس دونوں کا قران السعدین علیگڑھ ہو۔

گلستان اور رود بار دونوں کی زندگی و زیبائی کا مدار ایک دوسرے پر ہے۔ زندگی آزادی اور روانی ہے۔ اسی آزادی اور روانی سے "زندہ ہیں اقوام" اور انھی اقوام کے جلیل و جمیل کارنامے گلستانِ اندلس ہیں، جن کو وہ آبِ رودِ گنگا (زندہ رود) کے کنارے اور سہارے تعمیر کرتی چلی جاتی ہیں۔ آبِ رودِ گنگا ایک صلائے عزم و عزیمت ہے، ازلی و ابدی، صحت مند حوصلہ مندی اور صالح مہم جوئی کی۔ جو ملّتیں اس رمز کو نہیں سمجھتیں یا اس آزمایش میں پڑنے سے گریز کرتی ہیں، وہ اپنی تقدیر کو صرف جھیلتی ہیں، اس کو بدل نہیں سکتیں۔

۱۹۱۵ء ایم۔اے۔او کالج میں داخل لیا اور ذاکر صاحب سے پہلے پہل ملاقات ہوئی۔ موصوف دو ایک سال پہلے سے یہاں طالبِ علم تھے۔ جونپور سے آیا تھا، جو کبھی علم و فضل اور شرافت و شائستگی کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ ذوق اور ذہن پر اس کا برائے نام تصرف بھی تھا۔ علی گڑھ نے اس تصرّف کو تازہ اور توانا کر دیا اور ایسا محسوس ہوا، جیسے امید و آرزو کا ایک وسیع روشن افق سامنے آگیا ہو اور نئی راہیں اور وادیاں، نئے سفر کے لئے نئے برگ و سامان، اور نئی تقدیر کی دعوت اور بشارت دے رہی ہوں۔ جن سے ملا، جن کو دیکھا یا اس ادارے کی جن گراں مایہ اور دل آویز شخصیتوں کے بارے میں سُنا، اس سے اس آبِ رودِ گنگا

اور گلستان اندلس کا نقشہ سامنے آیا، جن کی چالیس سال پہلے علی گڑھ میں داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس نقشے نے اپنے سے پہلے کی گنگا اور اندلس کی نشان دہی کی۔ یہاں تک کہ تصوّر وتاریخ کے بے شمار اوراقِ مصوّر دیکھتا ہوا اس دیارِ شرف و سعادت تک پہنچ گیا جہاں سے عظمتِ انسان و انسانیت کے ہر رود گنگا اور گلستانِ اندلس کی آبیاری ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ذاکر صاحب کے دو بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور عابد حسین خاں مرحومین یہاں کے طالبِ علم رہ چکے تھے۔ ان میں سے میں نے کسی کو نہیں دیکھا لیکن ان کی شرافت و ذہانت کا چرچا ہر چھوٹے اور بڑے کی زبان پر تھا۔ اس کی تصدیق ذاکر صاحب کی پاکیزہ سیرت، غیر معمولی قابلیت اور دل کش شخصیت سے اس طرح ہوتی تھی، جیسے ان بھائیوں میں سے کسی سے براہِ راست متعارف ہونے کی ضرورت نہ رہ جاتی ہو۔ جن لوگوں نے عابد حسین خاں مرحوم کو دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ ذہانت و فطانت میں وہ تمام بھائیوں میں فرد تھے۔ مظفر حسین خاں مرحوم کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑے سنجیدہ، ذی علم، صلح جو، کم سخن اور عزلت پسند تھے۔ ان کا ایک انگریزی مضمون اس وقت کے ایک بڑے ممتاز انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں پڑھا تھا جس کے ساتھ ان کی تصویر بھی چھپی تھی۔ مضمون ایسی سہل اور شستہ زبان میں لکھا گیا تھا کہ اس کے سمجھنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی دقت نہیں ہوئی، بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے سہل اردو اور یہ انگریزی ایک ہوں۔ چوتھے بھائی زاہد حسین خاں تھے، جو میرے سامنے فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ کِتا قد آور متناسب الاعضا، سرخ سپید، خوش رُو، شرمیلا، پاکباز نوجوان۔ مشکل سے سولہ سترہ سال کا سن۔ اقبال نے ایسے ہی نوجوان کو قبیلے کی آنکھ کا تارا کہا ہوگا۔ ان کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا، جیسے یہ قائم گنج سے نہ آئے ہوں بلکہ جنت سے براہِ راست علی گڑھ میں اُتار دیے گئے ہوں۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہیں پہنچ گئے جہاں سے اُن کے اتارے جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا کرتا تھا۔ خاندانی نامراد مرض دق کا تینوں بھائی شکار ہوئے۔ دوسرے دو بھائی یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں ہیں۔

پچھلے سال یوسف صاحب مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلر شپ سے سبکدوش ہو کر رخصت ہو رہے تھے۔ سارا اسباب بھیجا جا چکا تھا، جانے میں دو تین دن رہ گئے تھے۔ ایک آدھ میز دو چار کرسیاں اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ بیگم یوسف کی طویل علالت

اندیشہ ناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ یونیورسٹی کی فضا ویران اور سنسان جیسے معلوم نہیں کب کس کو کیا سانحہ پیش آجائے۔ جنگ کی ہولناکیوں سے ملک دوچار۔ حسبِ معمول ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ضخیم کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہیں۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اک "جذبۂ بے اختیارِ شوق" سے فرمایا: آپ نے سرسید کی تفسیرِ کلامِ پاک پڑھی ہے؛ کل ہی لائبریری سے لایا۔ کبھی پہلے نظر سے گزری تھی، اب جو دیکھتا ہوں تو عجب اک جہانِ معنی ہے۔ میں نے دبی زبان عرض کیا، سرسید کی تفسیر تو نہیں، ان دنوں ان کے "اسباب بغاوتِ ہند" کے بجے کیا کرتا ہوں۔ جن تشویشناک حالات کے نرغے میں یوسف صاحب اس وقت تھے، اس میں ان کے مطالعے کا یہ انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ تنقید، فلسفہ، مذہب، ادب بالخصوص فرانسیسی ادب کا اتنا جامع اور مستند مطالعہ آس پاس کے لوگوں میں سے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو۔ یونیورسٹی کے ہمہ وقت انتظامی امور کے فشار میں مبتلا، غیر معمولی ناسازگار حالات میں گرفتار، لیکن علم و ادب سے یہ شغف، یوسف صاحب کی سیرت کے بعض بڑے صالح اور دلکش پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے، جیسے اعلیٰ اقدار کی پیروی سے انھوں نے اپنے آپ کو زندگی اور زمانے کے مکائد و مصائب سے بے نیاز کر لیا ہو۔

اس وقت ۱۹۴۷ء کا ہیبتناک دورِ خون آشامی و غارت گری یاد آتا ہے۔ مسلسل ترددِ تشویش اور جانکاہی کے سبب سے ذاکر صاحب کی طبیعت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ احباب اور ڈاکٹروں کے اصرار سے مجبور ہو کر بحالِ صحت کی خاطر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ جالندھر پر ٹرین روک لی گئی جہاں خونریزی کا جنون انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ذاکر صاحب کو گاڑی سے اتار کر قتل گاہ کی طرف لے چلے۔ اللہ کی رحمت سے جس کا گورا نام ہم نے بخت و اتفاق رکھا ہے، ریلوے کا ایک اہلکار ذاکر صاحب کو پہچان لیتا ہے اور انھیں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں بٹھا کر ایک سکھ فوجی افسر کو بلا لاتا ہے۔ یہ افسر عین اس وقت جب تلواریں، چھرے اور غضبناک نعرے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ ذاکر صاحب کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ ہماری احسان مندی اور شکرگزاری کے سائے میں رہیں گے۔

یہ حادثہ دیکھا نہیں، لیکن اس کا تصور کر سکتا ہوں۔ ذاکر صاحب سوئے مقتل اسی

دلجمعی سے جا رہے ہوں گے، جس سے جمہوریۂ ہند کے معزز صدر کی حیثیت سے کسی علمی ثقافتی یا اس طرح کی کسی اور تقریب کا افتتاح کرنے، یا پھر کسی شادی خانہ آبادی میں بانیانِ تقریب دولہا دلہن کے ساتھ تصویر کھنچواتے، ان کو ہاتھوں ہاتھ اور زیادہ ہوا تو کشاں کشاں لیے جا رہے ہوں۔ بہرحال بخیریت تمام دہلی مکان پر واپس آئے، تو بُشرے سے ایسا ظاہر ہوتا تھا، جیسے کوئی میلاد خوان ہنگے سمے توقع سے زیادہ نقدی اور مٹھائی پاکر بیوی بچوں میں پہنچ گیا ہو۔

ذاکر صاحب کے اس اطمینان واستقامت کے ذکر کے ساتھ ایک اور حادثہ یاد آتا ہے، جو آنکھوں کے سامنے گزرا۔ جب وہ یہاں وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے، ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ سب گزر گیا جو ایسے میں گزرا کرتا ہے۔ اس کا ذکر نہ کرتا، اگر کچھ دنوں بعد خود اس حادثے سے دوچار نہ ہوا ہوتا اور یہ نہ معلوم ہوتا کہ اس کے شدائد کیا ہوتے ہیں؛ اور ایسے میں نفس کی کمتری یا روح کی برتری کب، کہاں اور کس طرح اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ہم دونوں شام کو تھوڑی دور ٹہل کر واپس آتے تھے۔ ذاکر صاحب مہمان کے کمرے میں ٹھہر گئے۔ میں اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی، سوا اس کے کہ موصوف شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دن میں وہ شیروانی شاید ہی اتارتے ہوں۔ آرام کرنا ہوا، تو اچکن سمیت رہیں گے؛ اور بادنیٰ اشارہ یا اطلاع اس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے، جیسے امرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں کے آرام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا طریقہ ہے۔ چاہا کہ ادھر ادھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجے میں فرمایا، قلب کا دورہ پڑ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آخری وقت ہے۔ چاہا کہ آپ کو آواز دوں۔ پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے، جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا آپ بھی آتے ہی ہوں گے۔ ذاکر صاحب کے اس اطمینانِ قلب پر دم بخود رہ گیا۔ موصوف نے بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر بلایا جائے، گھر پر اطلاع کی جائے یا دہلی پہنچا دیا جائے۔ ڈاکٹر بلائے گئے، گھر پر اطلاع کی گئی، موٹر آئی، اور بڑے اطمینان سے اس میں بیٹھ کر کوٹھی پر آ گئے۔ جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گزر گئے، سوا زندگی کے آخری حادثے کے۔ میرا ہر وقت

کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر چاہے جو گزرتی ہو، لیکن بات چیت یا چہرے بشرے سے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہر لمحہ کتنے سنگین امکانات کی زد میں تھے۔ ہمیشہ اسی لطف و شگفتہ روئی سے گفتگو کی، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ جالندھر میں قاتلوں اور ان کی ننگی تلواروں اور چھروں کا سامنا اور کس درجہ غیر طبعی المناک موت سے صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا؛ دوسری طرف علی گڑھ میں قلب کا شدید دورہ پڑا اور یہ طبعی موت بالعموم جیسی غیر طبعی ہوتی ہے، کسے نہیں معلوم، لیکن دونوں آزمائشیں وہ اس طرح جھیل گئے جیسے "اک موجِ خون دہ بھی"۔

ان بھائیوں میں شرافت، جمیت اور استقامت کے جوہر ان کی نسلی اور قبائلی صفات میں سے ہیں۔ دوسری طرف علم سے شغف اور اس کو اعلیٰ سطح تک پہنچانے کی مشکل و مبارک مہم کی سربراہی اور اس میں کامیابی بجائے خود ان کا بڑا قیمتی کارنامہ ہے۔ محمود صاحب نے جرمنی سے اور یوسف صاحب نے فرانس سے ڈاکٹریٹ لی اور پروفیسری پر فائز رہے محمود صاحب حکومتِ پاکستان میں وزیر تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اب کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ یوسف صاحب جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے اور سالہا سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر شپ کے فرائض انجام دیے۔ ذاکر صاحب کے بارے میں کون کیا نہیں جانتا۔ تفصیل اس مجلے میں مل جائے گی۔

سوچتا ہوں، اگر تینوں مرحوم بھائی زندہ رہتے اور ترقی کے جیسے آثار ان میں ہویدا تھے، ان کو برگ و بار لانے کا موقع ملا ہوتا، تو آج ان کی موجودگی اور بے بہا خدمت سے ہمارے وزن و وقعت میں کتنا گراں قدر اضافہ ہوتا۔ زندگی کی شام میں ماضی کی یادوں کا کارواں ایک بار متحرک ہو جائے، تو اس کو قابو میں لانا اور رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنا شاید گوارا بھی نہیں ہوتا۔ خیال ہوتا ہے کہ ان تمام بھائیوں کے بے بہا کارناموں کو دیکھنے کے لیے ان کے والدین جنھوں نے اوسط سے بھی کم عمر پائی بقیدِ حیات ہوتے، تو اقبالؔ کی زبان سے یہ کہنے میں کتنے حق بجانب ہوتے!

میرے گوہر تمام یکدانہ!

ذاکر صاحب ایم اے او کالج میں، بحیثیت طالبِ علم داخل ہوئے تو پہلی جنگِ

عظیم برپا تھی۔ ہندوستان میں ایک نیا سیاسی اور تہذیبی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ یہ نتیجہ تھا دادا بھائی نوروجی، سرسیّد، گوکھلے، تلک اور ان کے دوسرے جلیل القدر معاصرین کی بے مثل ذہنی و سیاسی قیادت کا جس کے طفیل ملک میں اعلا صلاحیتوں کی حامل ایک نئی نسل وجود میں آ چکی تھی، اور عام ذہنوں میں قومی مقاصد و عزائم کا ایک دلکش اور واضح تصور جھلکنے لگا تھا۔ اس نئے ذہن اور جذبے کی ترجمانی اور قیادت گاندھی جی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، موتی لعل نہرو، مختار احمد انصاری، سی آر داس، ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو اور جواہر لال نہرو کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص، اعتماد اولوالعزمی سے ہندوستان میں ایک ہمہ گیر ذہنی سیاسی تحریک کا آغاز ہوا جو بدیسی حکومت کو ہر قدم پر چیلنج کر رہی تھی۔ اس کا نہایت موثر اور قابلِ قدر اظہار حکومت کے خلاف اُس سیاسی ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں ہوا، جسے عام طور پر خلافت اور نان کوآپریشن کی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو تھے، جن کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ مجموعی حیثیت سے اس تحریک نے قومی آزادی کے بنیادی مقاصد کے حصول میں تاریخی خدمت انجام دی اور بدیسی حکومت کی گلوافشار گرفت کو ڈھیلا کیا۔ اس کے علاوہ مغربی ادب اور علوم و فنون سے پچھلی صدی میں ہندی ذہن کا جو تعلق قایم ہوا تھا اور پہلی جنگِ عظیم سے جو نئی صورت پیدا ہوئی تھی وہ اب ایک ایسی فکر، ایک ایسے جذبے اور ایک ایسی بصیرت کی شکل میں نمودار ہو رہی تھی، جس کو بحیثیتِ مجموعی قومی تہذیب و تمدّن کی اہم اور معنی خیز بازیافت اور عالمی سیاسی و ذہنی رجحانات کے ایک نئے ناممیاتی اور ناگزیر شعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت کی سیاسی تصویر کو سامنے رکھیں تو کم و بیش تین واضح نقطۂ نظر کار فرما نظر آتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر انتہا پسندی کا تھا۔ اس کے کارکن یوں تو سارے ہندوستان میں تھے، لیکن ان کا دائرۂ عمل محدود تھا۔ ان کی موجودگی کا احساس بدیسی حکومت کے لیے بڑے تردّد کا باعث تھا۔ گاہے گاہے ان کی شدید اور سنگین کارروائیاں ملک کی سیاسی فضا کو جھنجھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اس کے جواب میں حکومت سخت اقدامات کرتی، تو اس کا ردِّ عمل مزید عام سیاسی بیداری کی صورت

میں ہوتا۔ لیکن مجموعی طور پر ہندوستانی ذہن نے انارکسٹ تحریک کے طریقہ کار کو اپنانے سے احتراز کیا۔ اس طور پر سیاسی جدوجہد کو یکسر خفیہ اور سازشی انداز اختیار کرنے سے محفوظ رکھا۔ دوسرا نقطہ نظر حکومت سے مفاہمت کر کے مراعات اور حقوق حاصل کرنے کا تھا۔ اس کے ماننے والوں میں ہر مذہب اور علاقے کے امیر امراء نوکری پیشہ، اور زمیندار قسم کے لوگ تھے۔ جو اپنے چھوٹے بڑے مفاد کی خاطر حکومت کا تقرب اور تائید حاصل کرنے کے درپے رہتے۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد و ماحصل یہ ہوتا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہ ہونے پائے، جو اُن کے مفاد اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دے۔ اس لیے وہ ایک طرف حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی مستقل کوشش و کاوش میں مبتلا رہتے اور دوسری طرف اپنی فطری اور اکتسابی موقعہ شناسی کو کام میں لاکر اپنے گروہ یا صوبے کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے وقت کے مناسبِ حال مسائل پیش کرتے اور ایک حد تک ان کو حل کرا کے اپنی سیادت کو متعین کراتے رہتے۔ اکثر یہ سب حکومت کے ایماء سے ہوتا۔ لیکن اس چابکدستی اور خوبصورتی سے کہ اچھے بھلے لوگ اس سے متاثر ہوتے اور ان کی تائید کرتے۔ تیسرا نقطہ نظر زیادہ واضح، مثبت اور قابلِ قدر انداز کا تھا۔ اس کے حامل ملک کی نجات آزادی، جمہوریت اور مساوات میں تلاش کرتے تھے اور ایک باصول تنظیم اور ہمہ گیر قومی سیاسی و ذہنی تحریک کا فروغ اور ایک پسماندہ معیشت اور معاشرے کو باقاعدہ طور پر کم از کم وقت میں ترقی کے اعلا مدارج سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔

اس زمانے کا تفصیلی جائزہ لینا تاریخ، سیاست، سماجیات اور معاشیات کے ماہرین کا کام ہے۔ میرا مقصد تو اس وقت کی مخصوص فضا اور نقشے کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ہے، جن سے اس وقت کے نوجوان خاص طور سے متاثر تھے۔ صورتِ حال خاصی پیچیدہ تھی اور فکر و عمل میں کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر ہندوستانی ذہن کی تعمیر و ساخت مختلف النوع احساسات، تصورات اور روایات سے ہوئی تھی، جو بیک وقت اتنے بڑے ملک اور اس کی اتنے مختلف قماش و قرینے کی آبادی کے باہمی اختلاف

وار تباط کی ترجمان تھی۔ چنانچہ ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کو اکثر یہاں کے اجتماعی قومی ورثے اور تاریخ کی ایسی تعریف و تعبیر پیش کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، جو ملک میں مختلف رہنے بسنے والوں کے لیے یکساں طور پر قابلِ قبول ہو، اس لیے کہ مختلف عقائد، مختلف زبانوں اور مختلف رسم ورواج کی موجودگی میں مشترک اقدار کے احساس کو اس طور پر ذہنوں میں جاگزیں کرنا کہ وہ قومی مزاج وموقوف بن جائے، آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے اچھے سے اچھے آدمی کی نیت پر خود اس کے لوگوں نے شبہہ کیا اور اس کے قول وفعل کو مخصوص مفادات کی پاسداری پر محمول کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مشترک تہذیب اور سرمایے کی توضیح و توسیع کے مبارک اور مہتم بالشان کام کے لیے جتنے بامقصد مشاہدے جس گہرے مطالعے، جس وسیع ہمدردی، بے لوث عمل، گہری ریاضت اور محکم دوستداری کی ضرورت تھی، وہ ایک عرصے سے قوم کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں عام طور سے موجود نہ تھی۔

یہ اس صورتِ حال کا ایک اجمالی نقشہ ہے، جس سے ذاکر صاحب کا بحیثیت ایک ذہین، مخلص اور حوصلہ مند نوجوان طالب علم کے سابقہ ہوا۔ کالج میں ذاکر صاحب کا شمار اس وقت کے مثالی طلبہ میں تھا۔ ساتھی طلبہ بڑی عزت و محبت کرتے تھے اور اساتذہ ان کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت اور سیرت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ اس زمانے کا یوروپین اسٹاف ذاکر صاحب کے نمونے کے طلبہ سے کچھ زیادہ خوش گمان نہیں رہتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ صورتِ حال کیسی ہی ہو، ذاکر صاحب حفظِ مراتب کے آداب اور تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ خدا نے ان کو جن صفات سے نوازا تھا، خود کو اس کا اہل اور شکر گزار ثابت کرنے کے لیے انھوں نے جس مجاہدۂ نفس، احتساب عمل، اور احساسِ ذمہ داری کو تمام عمر اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا، اسے ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ آدمی کی بڑائی اس سے بھی پہچانی جاتی ہے کہ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو وہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے کام میں لاتا ہے ـــــ اپنی نمود و بہبود کا وسیلہ بناتا ہے، یا ان کو اعلا مقاصد کے حصول کے لیے وقف رکھتا ہے

جس سے ضرورت مند زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ذاکر صاحب ہمیشہ موخر الذکر طبقے میں نہایت ممتاز درجے پر پائے گئے۔ شباب کے نشہ ونشاط کو خدمتِ خلق کے صوم وصلوٰۃ پر نثار کر دینا آسان نہیں۔

ذاکر صاحب اس ادارے کے طالبِ علم رہ چکے ہیں، جو نہ صرف ایک مستند، مقبول اور اُس وقت سے اب تک ایک عدیم المثال اعلا ماڈرن تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ہندوستانی تہذیب کے ایک مخصوص اور مبارک پہلو کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلمانوں کے تعلیمی وتہذیبی مقاصد کا مرکز اور سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کے وسیلے سے ملک کی ناموری اور خوش حالی میں ساتھی رہنے بسنے والوں سے توافق وتعاون کا متمنّی بھی رہتا ہے اور مبلغ بھی۔ حسبِ حال و ضرورت جدید تعلیم دینے اور پھیلانے کا حامی، سرسیّد سے زیادہ ان کے عہد میں شاید ہی کوئی اور رہا ہو۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملک کی حقیقی اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے تعلیم کو شرطِ اولین قرار دیا اور ہندوستان جیسے ملک کی ترقی وترفع کے پروگرام میں تعداد اور طاقت کو اتنی اہمیت نہیں دی، جتنی حقیقی اور عام تعلیم وتربیت کو۔ اور سرسید کا تعلیم کا یہ تصوّر اعلا اور دور رس امکانات کے اعتبار سے کتنا صحیح تھا۔

اس طور پر زمانۂ طالب علمی ہی میں ذاکر صاحب کو مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے جملہ نشیب وفراز اور اہم شخصیتوں اور مکاتب فکر سے براہِ راست آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ وہ مشترک ومستحسن خاندانی روایات تھیں جو یہاں کے طلبہ اپنے اپنے گھروں سے لائے تھے، اسلاف کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے بزرگوں میں دیکھے، اُن سے سُنے اور کتابوں میں پڑھے، جن کی دور اور نزدیک طرح طرح کی نشانیاں بکھری ہوئی نظر آتی تھیں؛ اور وہ اچھے اور بڑے لوگ جو کالج کے ساختہ پرداختہ، یا جنھوں نے کالج کی ساخت وپرداخت کی تھی، کالج کی نیک نامی اور خوش حالی کو اپنی نیک نامی اور خوشحالی جانتے تھے اور موقع آنے پر دفاعی دستے اور انجمنِ صلیب احمر Red Cross دونوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ سارے عوامل براہِ راست یا بالواسطہ ذاکر صاحب کے

شعور پر اثر انداز تھے؛ اور کتنی مفید و موثر دن رات کی وہ صحبتیں تھیں، جو ان کو کالج میں منتخب مسلمان شریف طبقے کے ذہین اور حوصلہ مند ساتھی نوجوانوں کی حاصل تھیں، جہاں وہ اپنی اعلا ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو، اپنے ساتھیوں کے اعلا ذہن و اخلاقی صلاحیتوں سے براہ راست و ہمہ وقت کسر وانکسار میں بنتے اور سنورتے پاتے تھے۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کتنی وسعت کتنا تنوع اور کتنی گہرائی رکھتے ہیں اور فرد و جماعت کے روابط کو کس طرح استوار کرتے اور بابرکت رکھتے ہیں ان کا بتانا آسان نہیں ہے، لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت اور زندگی میں ان کی واضح جلوہ گری ملتی ہے۔

ذاکر صاحب کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کے ہر پہلو سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اس کی تمام دلچسپ اور صحت مند سرگرمیوں میں اس انہماک سے حصہ لیتے جیسے وہ ان کا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس میں جو کالج کی زندگی میں بڑے مقبول مشاغل تھے، عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تھے؛ لیکن ان سے لطف اٹھانے اور ان کے اسرار و رموز یا لطائف و ظرائف پر دلچسپ گفتگو کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ کوئی میچ یا تقریب کالج میں کہیں منعقد ہو، اس کے تماشائیوں میں ذاکر صاحب ضرور ہوتے۔ کسی قابلِ قدر ہنر کا ماہرانہ ادراک ہو یا نہیں، اس کے ہنرور کے بڑے قدرداں تھے اور اب بھی ہیں۔

کالج کی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی اس ادارے کا بڑا قیمتی بے مثل اور دل کش امتیاز تھا، جو اس وقت تک کسی دوسرے ادارے کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اس کے نوجوانوں کو ایک ناقابلِ شکست شیرازے میں منسلک رکھتا ہے، دوسری طرف اس کے ناموس کا نگہبان اور نشان بھی ہے۔ ذاکر صاحب اس ادارے کی اسی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی کی پیداوار ہیں، جب یہاں کی فضا محکم عقیدہ، صالح روایات، شائستگی، حوصلہ مندی اور وسیع النظری سے معطر و منور تھی۔ یہ عہد ام اے او کالج کی شادمانی، شہرت و شوکت کا سب سے نمائندہ، نمایاں اور ناقابلِ فراموش عہد تھا۔

ذاکر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے۔ طلبہ کے پسندیدہ اخلاق و اطوار، اساتذہ کی فرض شناسی اور طلبہ سے ہمدردی اور دوسری قابلِ قدر روایات کے اعتبار سے اٹاوہ علی گڑھ کا مثنیٰ کہا جاتا تھا۔ اس کے مشہور اور نیک نام ترین ہیڈ ماسٹر سیّد الطاف حسین مرحوم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے طلبہ جتنی ان کی عزت و محبت کرتے تھے، کسی اور زندہ شخص کی نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور استوار کرنے میں سیّد الطاف حسین کی توجہ و تربیت کا بڑا قیمتی حِصّہ ہے، جس کا اعتراف ذاکر صاحب نے ہمیشہ بڑے احترام و عقیدت سے کیا۔

کالج سے ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا۔ اس وقت ان کا ارادہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا کورس پورا کرنے کا تھا۔ لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا اور علی گڑھ واپس آکر بی اے میں داخلہ لے لیا، جس میں ان کے مضامین انگریزی ادب، معاشیات او فلسفہ تھے۔ ان مضامین سے ان کو فطری مناسبت تھی۔ ان کا مطالعہ انھوں نے بڑی محنت سے کیا ہو یا نہیں، بڑے شوق سے ضرور کیا۔ یہ اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ ذاکر صاحب طالب علمی کے عہد میں کسی مضمون یا تصنیف کا مطالعہ اتنی محنت سے نہیں جتنا شوق سے کرتے تھے۔ انھوں نے علم و فن میں جو عرفان و آگہی حاصل کی، اس سے معمولی دوکانداروں کی طرح اتنا فائدہ خود نہیں کمایا، جتنا اس علم و فن کے حدود کو آگے بڑھایا۔ بی اے کے امتحان میں نمایاں امتیاز حاصل کیا اور کالج میں اوّل آئے۔ ایم اے میں معاشیات کا انتخاب کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ٹیوٹر مقرر ہوئے؛ اس کے ساتھ قانون کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ اسی زمانے میں افلاطون کی مشہور کتاب ریاست کا ترجمہ اردو میں کیا، جسے بعد میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ معانی و مطالب، نیز اسلوبِ اظہار و ابلاغ کی رو سے بڑی فکر انگیز و دلکش تحریر ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے اس عہد کے ذہنی نشو و نما میں افلاطون اور ان کے استاد سقراط کی شخصیات اور عظیم فلسفیانہ افکار کا بڑا حِصّہ ہے۔ ذاکر صاحب کو ہر اچھے

خیال، عمل اور شخصیت سے کچھ ایسی مناسبت ہے اور ان کا ذہن بجائے خود آشنا اخاذ خلاق، حسن کار اور حسن آفریں ہے کہ بڑے سے بڑا خیال یا شخصیت ان کے فکر و عمل میں بڑی خوبصورتی سے پیوست ہو کر ایک نئی شان اور ایک نئی معنویت حاصل کر لیتی ہے۔

اس موقع پر اپنے ایک اور احساس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ابتدائے طالب علمی سے آج تک سر سید کی شخصیت، ان کے رفقائے کرام اور ان کے بنائے ہوئے ادارے سے مجھے جو شغف ہے، اس میں جہاں اور بہت سے عوامل کی کار فرمائی ہے، وہیں ذاکر صاحب کی شخصیت کو بھی بڑا دخل ہے جو تمام تر علی گڑھ کی فضا میں بالیدہ و برومند ہوئی اور علی گڑھ اور اس کے بانی کی بہترین آرزوؤں کی مظہر ہے۔ سر سید کی وہ آرزوئیں کیا تھیں اور کیسی تھیں، ان پر یہاں بحث کرنے کے بجائے اس پر منصفی سے غور کرنا چاہیئے کہ سر سید نے تعلیم و تربیت کے اعلا علمی اخلاقی اور قومی تصور کے پیشِ نظر جو پروگرام ہندوستان میں رہنے بسنے والے مختلف مذہب و مسلک کے پیروؤں کے لیے مرتب کیا اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں جس خلوص اور جوشِ عمل سے کیا اور جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے، اس کی مثال ہندوستان میں آج اکیانوے سال بعد بھی کہیں نظر آتی ہے یا نہیں۔ شاید یہ بات کچھ لوگوں کو عجیب معلوم ہو اس لیے کہ تحریکِ عدم تعاون کی پیروی میں علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے، جو ایک طور پر علی گڑھ کی مخالفت میں قایم کی گئی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جامعہ ملیہ کا قیام خود فرزندانِ علی گڑھ کا کارنامہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، عبد المجید خواجہ اور ذاکر صاحب ـــــ یہ سب علی گڑھ ہی کے تھے۔ یکسر بدلے ہوئے حالات میں قومیت کے بے پناہ جذبے کو ایک مثبت تعلیمی تحریک کی شکل دینا، اس کے لیے مصیبت اٹھانا، ایثار و خدمت کی مبارک اور شاندار روایت قایم کرنا جس نے ہندی مسلمانوں کی جدید ذہنی و اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کیا علی گڑھ کے تعلیمی مشن کی، علی گڑھ والوں ہی کی کوشش سے، مزید توسیع تھی۔

ذاکر صاحب نے غالباً اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کالج چھوڑا اور قومی تعلیم و ترویج کو اپنا

شعار بنایا اور خود کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ اس وقت ایسا کرنا ایک نہایت درجہ دشوار اور صبر آزما راستے کو اختیار کرنا تھا، لیکن انھوں نے یہ سب اسے شوق، خلوص اور قابلیت سے کیا جیسے ان کو اسی دن کا انتظار تھا۔ ایک خالص سیاسی تحریک کے طوفان کو تعلیم و تہذیب کی جوئے رواں میں تبدیل کر دینا آسان نہ تھا۔ ان کے اس اقدام میں علی گڑھ کے پیرِ دانا کے حسنِ خیال اور جوشِ عمل کی صداقت عظمت اور قومی ہمدردی کی بڑی مبارک نشانیاں ملتی ہیں، جس نے قوم کی ذہنی و اخلاقی تربیت کو ہر چیز پر مقدم رکھا اور اس طور پر سیاست کو تعلیم کا خادم اور تابع بنا کر قومی تہذیب کے تخلیقی ارتقا کے امکانات کو واضح اور روشن کیا۔ قومی تہذیب کی محرک و مویدّ صحیح معنوں میں اعلا تعلیم ہی ہوتی ہے۔ علی گڑھ تحریک دراصل اسی نکتے کا ایک دلنشین اظہار تھی۔ ذاکر صاحب نے جو فیصلہ کیا تھا، اس کے پیشِ نظر ان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قبل اس کے کہ وہ جامعۂ ملیّہ کے کاموں کو سنبھالیں، انھیں مزید تعلیم و تجربہ کے لیے باہر جانا چاہیئے تاکہ عصری مغربی تعلیم و تہذیب سے واقفیت نہ ہونے کے سبب سے ایسی دقتیں پیش نہ آئیں، جو آئندہ ایک ترقی پذیر تعلیمی پروگرام کی تشکیل و تحصیل میں مانع ہو۔

۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب جرمنی کے لیے روانہ ہوئے اور برلن یونیورسٹی میں اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کی سند لینے کے لیے داخلہ لیا۔ ساڑھے تین سال وہاں مقیم رہے۔ اس عرصے میں نہ صرف یہ کہ "برطانوی ہند میں زراعت" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی، بلکہ جرمنی اور دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدّن بالخصوص ان کے تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کو وہاں دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اس دوران میں ان تعلیمی تجربات کا خاکہ تیار کیا جو بعد میں ان کی رہنمائی میں جامعہ میں نافذ کیے گئے۔ یہاں بھی ذاکر صاحب کے عمل کا یہ انداز سرسید کے اس طریقِ عمل سے کس درجہ مماثلت رکھتا ہے۔ جو ان کے قیامِ انگلستان میں بروئے کار آیا جہاں سرسیّد نے اپنا تمام وقت اور توجہ قوم کے سود و بہبود سے متعلق تعلیمی پروگرام مرتب کرنے میں صرف کیا۔ برلن یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے استاد مشہور جرمن ماہرِ

معاشیات پروفیسر زومبارٹ Prof. SOMBART تھے جن کی اس وقت کے جرمنی کے اعلا علمی حلقوں میں بڑی منزلت تھی۔ اقتصادیات میں پروفیسر موصوف کا مخصوص مطالعہ معاشی نظام، خاص طور پر سرمایہ داری نظام، کے ارتقا، اس کی ہیئت، طریقۂ کار اور مقاصد سے متعلق تھا اور ان موضوعات پر ان کی بڑے معرکے کی تصانیف ہیں جن میں سے بعض کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر زومبارٹ کے علاوہ ان کے دوسرے پروفیسر، پروفیسر زیرنگ Prof. SERING تھے جن کی نگرانی میں ذاکر صاحب نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ "زراعتی معاشیات" لکھا تھا۔ پروفیسر زومبارٹ کے خیالات کا ذاکر صاحب کے اقتصادی نظریات پر نمایاں اثر پڑا۔ اس کا اندازہ ذاکر صاحب کے ان دو لکچروں کے مطالعے سے ہوتا ہے، جو انھوں نے مختلف موقعوں پر دیے اور بعد میں شائع بھی ہوئے۔ پہلے لکچر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی فرمائش پر دیے گئے جو "معاشیات: مقصد و منہاج" کے نام سے اردو میں چھپے؛ دوسرے لکچروں میں جو کیبکا بھائی پریم چند جی لکچر کے نام سے دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر CAPITALISM ESSAYS IN UNDER STANDING کے عنوان سے دیے گئے۔ ان کے علاوہ انھوں نے معاشیات کی دو مستند کتابوں کا ترجمہ کیا؛ ایک ایڈورڈ کینن EDWARD CANNAN کی "اصولِ معاشیات" اور دوسری فریڈرش لسٹ FRIEDRICH LIST کی کتاب "معاشیاتِ قومی" کا۔ اس طور پر کہہ سکتے ہیں کہ معاشیات میں ذاکر صاحب کی خصوصی دلچسپی ان مضامین سے تھی، جو بنیادی طور پر فلسفیانہ معاشیات یا معاشی عمرانیات سے متعلق تھے یوں ان کا معاشیات کا عام مطالعہ نہایت وسیع ہے اور وہ ان تمام جدید تبدیلیوں سے پورے طور پر آشنا ہیں جو اس علم میں بڑی تیزی سے راہ پاتی رہی ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لیے مخصوص و مسلسل مطالعہ درکار ہے۔

ذاکر صاحب کی دوسری دلچسپی تعلیم کے مضمون سے تھی۔ بعد میں کچھ ایسا ہوا کہ معاشیات کے بجائے تعلیم ہی ان کا خاص مضمون بن گئی۔ یہاں تک اب ملک کے اندر اور باہر وہ ایک ممتاز ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ جرمنی سے واپس آکر انھوں نے تعلیم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا

اور عمر کا بیشتر اور بہترین زمانہ اسی کی نذر کیا۔ یہاں تک کہ جدید ہندوستانی تعلیمی نظام کی تشکیل و تعمیر میں ان کے تعلیمی افکار کو بجا طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ذاکر صاحب نے اردو میں جو کچھ لکھا وہ "تعلیمی خطبات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں متعدد لکچر ہیں جو کتابی شکل میں یکجا نہیں ملتے، لیکن شائع ہو چکے ہیں اور ملک کے تعلیمی حلقوں میں معروف و مشہور ہیں۔ حال میں ان کی ایک کتاب THE DYNAMIC UNIVERSITY کے نام سے انگریزی میں شائع ہوئی ہے جو ان کی تخلیق فکر کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ ملک کی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی تاریخی خدمت اسی رپورٹ سے عبارت ہے، جو گاندھی جی کے ایما پر مرتب ہوئی اور عام طور پر "وار دھا ایجوکیشن رپورٹ"، کے نام سے معروف ہے۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار و نظریات کی ابتدائی تشکیل و تعمیر میں اس گہرے مشاہدے اور مطالعے کو خاص دخل ہے، جو ان کو جرمنی کے زمانۂ قیام میں میسّر آئے۔ اس میں دو نام قابلِ ذکر ہیں، جن سے ذاکر صاحب گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ ایک، مشہور جرمن عالم کرشن اسٹائنر KERCHANSTEINER دوسرے ممتاز و معروف سوئستانی ماہرِ تعلیم پستالوتی PESTALOZZI۔ اس وقت وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے کہ وہ جامعہ کو ایسا ادارہ بنانا چاہتے تھے جو ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نہ صرف بنیادی تعلیم گاہ، بلکہ تجربہ گاہ بھی ہو۔ قومی سیرت اور ذہن کی اساسی تعمیر اصلاً ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ معاشی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے، جس کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی دیہات میں بود و باش رکھتی ہے۔ انگریزی حکومت نے جو نظامِ تعلیم رائج کیا تھا، وہ کُل آبادی کی صرف ایک محدود تعداد کی تعلیمی ضرورتوں کو بھی ناکافی حد تک پورا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب اس کمی کو شدّت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ ان کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ قومی ترقی اور فلاح کے لیے ایسے جامع تعلیمی منصوبے کی تشکیل کی جائے، جو بچوں کی آزاد، صحت مند اور مبارک ذہنی

وجسمانی نشوونما اور تربیت میں اعلا قومی اقدار اور ایک حر کی معاشرے کو فروغ دینے میں معین ہو۔

ذاکر صاحب ہندوستان واپس آئے، تو یورپ کی بہترین متاع یعنی ترقّی یافتہ تعلیمی افکار و نظریات اپنے ساتھ لائے اور آتے ہی اپنے وعدے اور منصوبے کے مطابق جامعہ کے کاموں کو سنبھال لیا۔ یہ مہم جتنی اہم تھی، اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مادّی ذرائع اور وسائل کی اتنی ہی کمی تھی۔ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا، ان کی ہمت جواب دے رہی تھی، ابتدائی جوش اور ولولہ سرد پڑ رہا تھا، ملک کی سیاسی فضا تیزی سے مکدّر ہو رہی تھی؛ اور جامعہ کو پروان چڑھانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یہ محض ذاکر صاحب کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ تھکے ہارے ساتھی تازہ دم ہوئے اور انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں ایک عہد آفریں تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کی عظیم مہم میں دل و جان سے شریک ہو گئے جن لوگوں نے ذاکر صاحب کے وہ دن رات دیکھے ہیں ان کو یاد ہو گا کہ جامعہ کے جانبازوں اور ان کے شیخ نے کتنے دل شکن حالات میں کس دلجمعی اور پامردی کا ثبوت دیا۔ رضا کارانہ طور پر اپنے کو بے سرو سامان رکھ کر قوم کے لیے کیسے سازو سامان فراہم کیے۔ پسینہ پانی ایک کر کے کتنی سنگلاخ زمین کو کتنا زرخیز بنا دیا اور اتنا کچھ کر ڈالنے کے بعد اپنا کوئی حق نہیں جتایا۔ علم، تہذیب اور انسانیت کی خاطر اس جماعت نے جو کچھ کر دکھایا، اس کی یاد ملک و قوم کے دلوں کو ہمیشہ تازہ اور توانا رکھے گی۔

علی گڑھ سے جامعہ دہلی منتقل ہوئی، تو قرول باغ کے علاقے میں کرائے کے مکانات میں اس کا کام شروع ہوا۔ غالباً اس کی اپنی عمارت کوئی نہ تھی۔ اسکول اور کالج کہیں تھے، تو دفتر اور اقامت گاہیں کہیں اور۔ تعلیمِ بالغاں کا دفتر یہاں تھا، تو مکتبہ جامعہ وہاں۔ لیکن ان دشواریوں کے باوجود جامعہ کا کام دیکھیے، تو نہایت درجہ منظّم، مرتب اور بامقصد ادارے کا احساس ہوتا تھا۔ ہر کام قاعدے اور وقت کی پابندی سے انجام پاتا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس زمانے میں قرولباغ کی بستی بڑی نا صاف ناصحت مند، وحشت انگیز اور ویران تھی، لیکن جامعہ کے طفیل اس کی یہ خرابیاں ماند

پڑ گئی تھیں۔ وہاں جائیے، تو جامعہ، ذاکر صاحب، ان کے رفقا اور ان کے کاموں کے تصور سے ایسا محسوس ہوتا جیسے پورے علاقے کی فضا جامعہ کی فضا میں تبدیل یا تحلیل ہوتی جارہی ہو۔ جامعہ والے اس بستی کو اپنی بساط اور وسائل سے زیادہ صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتے، ذاکر صاحب کا مکان بہت مختصر لیکن اندر باہر صفائی، سادگی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ذاکر صاحب کی بوریہ نشینی میں سلطانی کی شان تھی جو ملنے جاتا، اسے احساس ہوتا کہ قوم کی تقدیر و تاریخ میں وہ مبارک موڑ آچکا ہے، جس کے ہم منتظر و متمنی تھے؛ اور اب جب کہ وہ مسندِ حکومت پر متمکن ہیں، صدرِ جمہوریہ کا ایوان اتنا مرکزِ حشمت و قوت نہیں معلوم ہوتا، جتنا ایک ایسے مامن کا جہاں اعلا مقاصدِ قومی کا تعیّن اور ان کے حصول کی مناسب تدابیر عمل میں آتی ہیں اور جس کا مکین نئے ہندوستان میں ایک مہذب، منصفانہ اور صلح کل معاشرے کا نقیب بھی ہے اور نمائندہ بھی۔

ذاکر صاحب کی قیادت میں رفتہ رفتہ ملک میں جامعہ کی ساکھ قائم ہوئی۔ اس کی افادیت و اہمیت کا احساس عام ہونے لگا۔ دلی کے ہجوم و ہیجان اور دار و گیر سے دور اوکھلے میں ایک وسیع قطعے پر اس کی عمارتیں بننا شروع ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے ایک اجلی، ستھری، تعلیمی بستی آباد ہوگئی۔ جامعہ کی عمارات دلی کی تاریخی و تہذیبی عمارات کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ذاکر صاحب کے اعلا تعمیری ذہن اور ذوق کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ہیئت و ساخت اور ان کے معنی و متن میں ذاکر صاحب کی امید و عزائم پیوست ہیں۔ حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو سرسید نے بڑے چاؤ اور امنگ سے بنایا جیسے کوئی اپنا گھر بناتا ہے اور وہ خود اس کے انجینیر، معمار، مزدور اور قلی تھے۔ کم و بیش یہی کیفیت ذاکر صاحب کی تھی جامعہ کو گھر مل گیا؛ کاموں میں وسعت اور برکت ہوئی؛ اس طور پر ملک میں ایک صحت مند اور امید افزا روایت کا اضافہ ہوا۔

جامعہ نے غالباً ۱۹۴۶ء میں اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کیے، تو اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک جشن منایا گیا۔ کس آشوب و آزمائش کا وہ دور تھا ملک میں سیاسی منافرت و عداوت اس درجہ پھیل گئی تھی کہ ایسا معلوم ہونے لگا تھا

جیسے یہاں نہ کبھی یگانگت تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ ایسے میں کسی ایسی تقریب کی طرح ڈالنا جسمیں سب اتفاق و یکجہتی سے شریک ہوں ناممکن العمل نظر آتا تھا۔ اسے ذاکر صاحب اور ان کے ادارے کی کرامت کہنا چاہیئے کہ ان کی دعوت پر جامعہ کے اس جشنِ جوبلی میں سبھی شریک ہوئے۔ ڈیس پر کون نہیں موجود تھا ـــــــ جواہر لال نہرو، محمد علی جناح، راج گوپال آچاری، مولانا ابوالکلام آزاد، سید حسین، نواب بھوپال، لیاقت علی خاں، عبدالمجید خواجہ۔ اس زمانے کی عصیاں و عداوت کے سیل کو ذہن میں رکھیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح یکجا نظر آئیں، وہاں کیسے کیسے لوگ یکجا ہو گئے ہوں گے۔

ذاکر صاحب ان دنوں علیل تھے۔ خطبہ پڑھنے اٹھے تو سب کی نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔ وہ خطبہ بھی کیا تھا! اور اس میں کیا کچھ نہ تھا۔ کتنی فکر انگیز اور سچی باتیں، کس خلوص، اعتماد اور دردمندی سے، کتنا سچّا اور پکّا آدمی، قوم و ملک کے کس قدر نمائندہ مجمعے کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہوا جیسے اس طوفان کا منہ پھر جائے گا، جو ہر اچھے فکر و عمل کو تہ و بالا اور تہس نہس کر رہا تھا، اور امید و الفت کا وہ سورج جو گہنا رہا تھا، از سرِ نو جگمگانے لگے گا۔ سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قوم کا ضمیر خود قوم سے مخاطب ہو

ذاکر صاحب کی اس تقریر سے طوفان تو نہ تھما، اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا، لیکن ملک کی آئندہ جو تاریخ لکھی جائے گی، اس میں اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ اس پُر محن دور میں انصاف، شرافت اور انسانیت کی حمایت میں، ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر، جن لوگوں نے اپنی آواز بلند کی اور تعصّب، تنگدلی اور جہالت سے نبرد آزما ہوئے، ان میں ذاکر صاحب کا نام بہت ممتاز ہو گا۔

جامعہ کی عام رہنمائی اور اس کے کاموں کی مسلسل نگہداشت کے علاوہ ذاکر صاحب کی بے شمار مصروفیات تھیں۔ واردھا تعلیمی رپورٹ کے شائع ہو جانے کے بعد خاص طور پر جب کانگرس نے غالباً ۱۹۳۷ ـــ ۱۹۳۸ء کے ہری پورسیشن میں اس کو پارٹی پروگرام کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا، ذاکر صاحب پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ آن پڑا۔ ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مختلف جلسوں

اور اداروں میں رپورٹ کی وضاحت کرنی ہوتی اور بحث مباحثے میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے جن کی بے شمار مصروفیتیں تھیں، اس لیے بنیادی تعلیمی پروگرام کی سربراہی کا سارا کام ذاکر صاحب کو سونپ دیا تھا۔ گاندھی جی کے اس اعتماد کا ذاکر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ دونوں اعلا اخلاقی رجحان رکھتے تھے، اس لیے ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ملک میں بنیادی تعلیمی پروگرام کو پارٹی یا اس کی حکومت کے اثر و اقتدار کو کام میں لاکر نافذ نہ کیا جائے، بلکہ آزاد بحث مباحثہ اور افہام و تفہیم کے ذریعہ اس سے صحیح واقفیت پیدا کرائی جائے اور یہی طریقہ کار خیال اور عمل میں حقیقی اتحاد و یکجہتی کا باعث ہوگا۔ یوں بھی ذاکر صاحب کو محض اپنی بات منوانے کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی زیرِ بحث مسئلے کے تمام پہلوؤں کی تشریح، وضاحت اور اس کے اسباب و نتائج کو دوسروں کو سمجھانے کی۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، بنیادی تعلیم کے منصوبے کا مقصد ملک میں ابتدائی تعلیم کو یکسر نئی اور صحت مند بنیادوں پر قایم کرنا تھا اور نوخیز نسل کو بامقصد بامعنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے نشوونما سے بہرہ مند کرنا تھا۔ عام ذہن مروّجہ تعلیمی نظام میں معمولی تبدیلیوں ہی کو کافی سمجھتا تھا، اس لیے جب یہ پروگرام سامنے آیا، تو کچھ عدم واقفیت کی بنا پر اور کچھ اس لیے کہ دیرینہ مفادات کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچے گا، اکثر مذہبی نقطہ نظر یا سیاسی عصبیت کے باعث اس کی طرح طرح سے تاویلیں کی گئیں اور مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ذاکر صاحب کو اس اسکیم کی جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ اس حوصلہ شکن اور صبر آزما صورتِ حال سے ذاکر صاحب جس مستقل مزاجی اور قابلیت سے عہدہ برآ ہوئے، وہ ان کا بڑا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ ملک میں جا بجا بنیادی تعلیم کا کام شروع ہوا۔ لیکن اتنے بڑے ملک میں اتنے بڑے کام کو ہر جگہ یکساں کامیابی سے پھیلانے میں بے شمار دشواریاں حائل تھیں۔ پھر یہ کہ سیاست اور مذہب کے دریائے بے پایاں و طوفانِ موج افزا، میں تعلیم کی کشتی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ بنیادی تعلیم کا کام جن توقعات اور حوصلے کے ساتھ شروع کیا گیا تھا وہ پورا نہ ہوا، لیکن اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے جنھوں نے اسے وضع کیا تھا، بلکہ ان پر ہے جو اسے

چلا نہ سکے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا، تو ذاکر صاحب دلی میں تھے۔ بحالی صحت کے لیے کشمیر جارہے تھے کہ جالندھر کا حادثہ پیش آیا جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔ دلی واپس پہنچے تو عالم میں انتخاب یہ شہر دہشت اور درندگی کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ مسلمانوں پر قہر و قیامت کا صور مسلسل پھونکا جارہا تھا۔ ان کے لیے عرصۂ حیات قبر کی طرح تیرہ و تنگ ہوچکا تھا۔ اور دلی کا گنج شائگاں گنجِ شہیداں کا سماں پیش کررہا تھا۔ مسلمان پارہ پارہ ہوچکے تھے۔ شقاوت و شیطنت کے اس مکروہ و مہیب منظر کے ساتھ انسانیت، محبت اور غیرت کی جھلک بھی دیکھنے میں آئی تھی۔ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ذاکر صاحب مولانا حفظ الرحمٰن، شفیق الرحمٰن قدوائی، بے بس اور بے سہارا مسلمانوں کو پناہ اور تشفّی دینے کے لیے ہر انجام و انعام سے بے پرواہ ہوکر سینہ سپر تھے۔ بالآخر آگ، خون اور خباثت کا عفریت قابو میں آیا۔ لیکن کس طرح، کس وقت اور کس قیمت پر؟ ہندوستانی انسانیت کی سب سے گرانمایہ شخصیت، عالمگیر صلح و آشتی کے عظیم پیامبر اور مذہب و اخلاق کے بہت بڑے نمونہ و نمائندہ، گاندھی جی کی جان کی نذر لیکر۔ جیسے دلّی والوں کے اس دیرینہ توہّم کی تصدیق ہوگئی ہو کہ جب تک وبا یا ابتلائے عام کسی بڑے آدمی کی جان نہیں لے لیتا، فرو نہیں ہوتی۔

بے بسی، بے قراری اور خطرے کے ان دنوں میں ذاکر صاحب نے جس اعتماد و عزم اور جس خلوص و خاموشی سے بگڑی اور بگڑتی ہوئی صورت حال کا مقابلہ کیا اور جس طرح تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور حوصلہ دلانے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں، اس کا اعتراف سب نے کیا۔ یہ عمل اگر ایک طرف ان کے سچّے اور پکّے مسلمان ہونے پر دلالت کرتا ہے، تو دوسری طرف ان کے سچّے اور پکّے وطن دوست ہونے کی بھی دلیل ہے۔ ذاکر صاحب شب و روز مصروف رہتے۔ جامعہ کے کاموں کے علاوہ طرح طرح کی دوسری ذمہ داریوں سے سابقہ دلّی کی مظلوم انسانیت کے تقاضے ان کی مسلسل توجہ چاہتے تھے۔ قومی حکومت کے تعلیمی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں تمام متعلق کمیٹیوں اور کونسلوں

میں شرکت کرنا لازمی سا ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کے رکن تھے جو حصولِ آزادی کے بعد تعلیم کے مسائل پر مفصّل رپورٹ پیش کرنے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد کے کچھ دن انھی مصروفیتوں کی نذر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ نے باتفاقِ آرا ذاکر صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔

علی گڑھ پر بڑا سخت وقت گزر رہا تھا، جیسے کسی لرزہ خیز زلزلہ کی زد میں ہو پورے ملک میں اس وقت ذاکر صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا جو اس عظیم علمی، تعلیمی، تاریخی اور تہذیبی ادارے کو بچانے اور بحال کرنے کی بیکران و بے امان ذمہ داری قبول کرنے کا اہل ہوتا یا اس کی ہمت کرتا۔ آزادی سے چند سال پہلے ہندوستانی سیاست نے جو رنگ و رُخ اختیار کیا تھا، اس سے علی گڑھ شدید طور پر متأثر ہوا تھا۔ اس لیے تقسیم ملک کے بعد پورے ملک میں تعصب و تخریب کے جو عناصر ابھرے، علی گڑھ ان کا خاص نشانہ بنا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لیے اور کسی کے بوتے کا نہ تھا کہ جو صورتِ حال رونما تھی اور تیزی سے بگڑتی جارہی تھی، اس میں کیا کرے، کہاں جائے، کیا ہوگا اور کس سے رجوع کرے۔ علی گڑھ کے چھوٹے بڑے سب دم بخود تھے۔ جو نہ ہونا چاہیئے تھا، اس کا ان کو احساس تھا، جو کچھ ہوا تھا اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار تھے۔ دوسرے جو چاہتے تھے، اس سے بھی بُرے بھلے واقف تھے۔ جو نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، ان سے بھی خاطر خواہ عہدہ برآ ہونے پر آمادہ تھے، لیکن یہ سب کیسے ہوتا اور کون کرتا، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

ستّر پچھتّر سال کی طویل مدّت میں اس ادارے نے جو اچھے اور بڑے کام کیے تھے، ان کو محض ایک سیاسی حادثے کی بنا پر نظر انداز کر دیا جائے، نہ مقتضائے انصاف تھا نہ قرینِ دانشمندی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات نے ملک کو اس طرح زیر و زبر کر دیا تھا کہ شاید ہی کوئی ادارہ، جماعت یا جگہ یا کس و ناکس اس سے متأثر ہونے سے محفوظ رہا ہو۔ علی گڑھ کے لیے جتنی غلط بات یہ تھی کہ وہ ایک اعلا تعلیمی ادارے کے منصب کو نظر انداز کر کے سیاست کے شور و فتن میں داخل ہوا۔ اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ ہوتی کہ اس کے بدلے

اس کو مٹا دینے کو عملِ نیک قرار دیا جاتا۔ اگر آزادی کے معنی ہندوستان میں ایک نئی انصاف پسند اور جمہوری ریاست کا قایم کرنا تھا، تو اس ریاست کے قیام اور کامیابی کی اوّلین شرط یہ تھی کہ ماضی کے ناخوشگوار واقعات اور حالات کے مہلک سایے اور اس کے اثرات سے مستقبل کو محفوظ کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے اس وقت علی گڑھ کی قیادت کی ذمّہ داری قبول کر کے اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیا کہ نئی ہندوستانی ریاست کا بنیادی مقصد ایک مہذّب، ترقّی پسند اور انصاف دوست معاشرے کو قایم کرنا ہے، اور علی گڑھ کی بقا اور توسیع کا کام اس مقصد کے حصول میں ایک موٗثر اور مبارک وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کوئی نیا خیال نہ تھا۔ ان کی پوری زندگی اس مقصد کی نہایت مستند، روشن اور دل کش تصویر و تعبیر رہی ہے۔

ذاکر صاحب علی گڑھ آگئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی: "یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعان، غم مخور"، عندلیب باغِ حجاز کی دعا پہنچی: "کلی کلی ہو تری گرمیِ نوا سے گداز"، اور محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب پھر ایک بار اپنی اسی کھوئی ہوئی فردوس میں آباد ہیں، جس کو اقبال نے آغوشِ مادر کہہ کر کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ دل کش بنا دیا تھا۔ یہ آنا علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمانِ وفا کی تجدید، ایک نئی زندگی کا طلوع اور نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم و اعلان تھا۔ شکستہ بال، دل گرفتہ اور پابستہ مرغانِ چمن فرطِ مسرت سے زمزمہ سنج ہو گئے: سلامٌ علیٰ نجد وھل من نجد!

ذاکر صاحب کی موجودگی ان کے کام کرنے اور کام لینے کا انداز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک حد تک سرسید کا عہد واپس آ گیا ہو اور تباہی اور مایوسی کے ریگزار میں تخلیق و تعمیر کے جا بجا نخلستان ابھرنے اور لہلہانے لگے ہوں۔ ذاکر صاحب مدّتوں سے یونیورسٹی کی ایکزیکیٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبۂ اقتصادیات کے ممبر رہے تھے۔ یوں بھی وہ یونیورسٹی اور اراکینِ اسٹاف سے ذاتی طور پر متعارف تھے، بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ ذاکر صاحب جب یہاں کے طالب علم تھے، اس زمانے سے آج تک جب کہ وہ جمہوریۂ ہند کے صدر رہیں، ان کی اعلا سیرت

وشخصیت، علم و فن سے شیفتگی، عوام و خواص دونوں میں احترام و محبت کی نظر سے دیکھے جانے اور طالب علموں سے ہمدردی رکھنے کا جو رچا جتنا علی گڑھ میں رہا اور اب تک ہے، شاید ہی کسی اور کا کبھی رہا ہو۔ ان کے ذہن میں یونیورسٹی کے آئندہ نشیب و فراز کے سارے پیچ و خم کا نقشہ تھا۔ اس لیے اس ادارے کے انتظام و انصرام میں جو ان کے لیے اتنا ادارہ نہیں جتنا گہوارہ تھا، کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ہر کام دیکھتے دیکھتے اس خوش اسلوبی سے انجام پانے لگا جیسے خوش اسلوبی سے انجام پانا ان کاموں کا خاصہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مواعظِ حسنہ اور سب و شتم کے ان خطباتِ افتتاحیہ سے ہم محفوظ ہو گئے جو ہر کس و ناکس اختیار کے نشہ یا اقتدار کی جستجو میں علی گڑھ آتا اور یہاں کی تواضع و تکریم سے آسودہ ہو کر ہم کو سنا جاتا۔ ذاکر صاحب کے آجانے سے دردِ درماندگی اور خوف و خواری کے وہ دن ختم ہوئے اور ہم کو اس ناقابلِ بیان و برداشت کلفت و کوفت سے نجات ملی۔ اس زمانے اور ان حالات میں یہ کارنامہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔ پھر انھی آنکھوں نے دیکھا کہ بڑے سے بڑا شخص خواہ وہ اپنے عہد کا کیسا ہی علامہ یا عالی جاہ کیوں نہ ہوتا، علی گڑھ آکر ہم کو خطاب کرنے کی جرأت کرتا تو سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا اور جو کچھ کہتا اور جس طرح کہتا، انداز وہی ہوتا جیسے استاد کے سامنے اس کی اجازت لے کر پورے آداب و اکرام کے ساتھ سعادت مند شاگرد مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے طریقۂ کار کا بڑا دل آویز پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کام کرنے یا کام لینے میں منصب کو بطور قوت یا سیاست کے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کو جتنا بھروسہ اپنی خیر اندیشی اور دوسروں کی اچھائی پر رہے، اتنا منصب پر نہیں جیتنے کا اس سے بڑا حربہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس حربے کا استعمال آسان نہیں۔ ذرا غفلت ہوئی اور آدمی خود اس کا شکار ہو گیا۔ علی گڑھ میں ذاکر صاحب محض وائس چانسلر نہ تھے جو بندھے ٹکے دفتری یا انتظامی طور طریقوں سے کام لینے اور کرنے کو سب کچھ جانتے ہوں؛ ان کی وائس چانسلری ایک عالی صفات

شخص کی قیادت تھی، جس پر نہ صرف علی گڑھ کو بلکہ اس کے باہر بھی ہر چھوٹے بڑے کو اعتماد وافتخار تھا۔ اس طور پر ذاکر صاحب کے عہد میں علی گڑھ نئے ہندوستان میں اعلا علمی، تعلیمی وتہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ علی گڑھ کا شروع سے یہی رول بھی رہا ہے۔ اپنے حسنِ عمل سے جب تک وہ اس کو ادا کرتا رہے گا، اس کی افادیت واہمیت مسلم رہے گی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اس طرح کے ادارے صرف اپنے اعلا بنیادی مقاصد کی توسیع، ترقی وتکمیل میں زندہ اور نفع بخش رہتے ہیں۔ ان کو مصالح ومقاصد کے تابع کرنا ایسا ہی ہے جیسے تازہ اور صحت بخش ہوا اور پانی کو مسموم ومتعفن کرنا اور رکھنا۔

انگریز اساتذہ کے عہد (ام اے او کالج) میں تفریحی ورزشی کھیلوں اور ان کی صحیح اسپرٹ SPORTSMAN SHIP کو تعلیم وتربیت اور معلومات زندگی کا جس طرح اور جس حد تک جز بنا دیا گیا تھا، جس کے سبب سے علی گڑھ کے عام طلبہ دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز تھے۔ اس کو ذاکر صاحب نے بڑے شوق، اصرار واہتمام سے ازسرِ نو نافذ کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں ام اے او کالج نے کھیلوں میں جو ناموری ونیک نامی حاصل کی تھی، وہ صرف کھیل کے میدان تک محدود نہ تھی، بلکہ یہاں کے طلبہ اور کالج کے جملہ متعلقین ومتوسلین کی روزانہ کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ علی گڑھ کے طلبہ آسمان سے نازل یا روس اور امریکہ سے آیا کرتے تھے، بلکہ ان میں اسپورٹس کی روح اس درجہ سرایت کر چکی ہوتی تھی کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر خود کھیل کے فن میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔ آج بھی جب کہ حالات سازگار نہیں ہیں علی گڑھ کے طلبہ میں اسپورٹس مین شپ کی روایت تازہ وتابندہ ہے اور یہ واضح علامت اس کی ہے کہ اس کی سرشت صالح ہے اور وہ ان روایاتِ عظیمہ، اور اقدارِ عالیہ کا احترام کرتے ہیں، جن کا ایک نام علی گڑھ بھی ہے۔

آج کل طرح طرح کے کھیلوں کو جو ترقی دی جا رہی ہے اور ان پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے، کسے نہیں معلوم، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان

کھیلوں سے "اسپورٹس مین شپ" نہ صرف معدوم ہو چکی ہے، بلکہ ناسمجھی سے اس کو ایسے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے، جو اسپورٹ کو عبادت اور ذمہ داری نہیں، پیشہ قرار دیتے ہیں۔ اور پیشہ بھی ادنیٰ درجے کا جیسے اسپورٹس کا مقصد ذہن و اخلاق کی شائستگی نہیں، لاٹھی چارج ہو۔ اسپورٹس بازاروں میں نہیں پنپتے، ان کی نشو و نما، علم و اخلاق کی مانند، اچھی تعلیم گاہوں میں، اساتذہ کی نگرانی اور تہذیبی روایات کے سائے ہی میں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے ایک موقع پر علی گڑھ کے کھلاڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا! عزیزو! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ کھیلوں کے میدان، بالخصوص علی گڑھ میں، تمہارے اچھے کھیلنے پر تمہارے ساتھی تمہاری تحسین کریں اور فریق مخالف کے اچھے کھیل پر خاموش رہیں یا اس کی کسی معذوری یا نارسائی پر اس کا مضحکہ اڑائیں۔ یہ کھیل اور شائستگی دونوں کے آداب کے خلاف ہے۔ اگر تم دیکھو کہ ایسا ہو رہا ہے، تو کھیل بند کر دو اور اس پر اصرار کرو کہ جب تک مقابل ٹیم کے کھلاڑیوں کے کھیل کی خاطر خواہ داد نہ دی جائے گی، تم کھیلنا ملتوی رکھو گے۔" ذاکر صاحب جانتے تھے کہ نئے ہندوستان کا جو نقشہ بنے گا اور اس کو جن نئے احوال سے سابقہ پڑے گا، اس میں صحیح و صالح خطوط پر نوجوانوں کی تنظیم کا مسئلہ سب سے اہم ہوگا۔ اس لیے وہ طلبہ میں زیادہ سے زیادہ "اسپورٹسمین شپ" پیدا کرنے کے خواہاں اور کوشاں تھے، اور ان کا خیال صحیح تھا۔ آج کے نوجوان میں ڈسپلن کے فقدان سے جو خطرہ ہے، وہ تمام دوسرے خطروں سے زیادہ ہے۔ سیاسی ناخداؤں کو کوئی سمجھائے کہ جب تک جمہور انام میں صحیح سیاسی و جمہوری شعور نہ پیدا ہو جائے، نوجوانوں کی تنظیم سیاسی مقاصد و مصالح کی سطح پر نہیں، اسپورٹس اور اخلاق کی سطح پر کرنا چاہیے۔ لیکن خود غرضی اور تنگ نظری اس کی مہلت یا اجازت نہیں دیتی، تو نوجوانوں کی موجودہ بے راہ روی کا ماتم کرنا صرف فعلِ عبث ہے۔

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ کم و بیش آٹھ سال رہا۔ اس عرصے میں کتنے بڑے ادارے میں کتنے بڑے کام انجام پا گئے، ان کا احاطہ

کرنا آسان نہیں۔ طلبہ کی اعلا ذہنی و اخلاقی تربیت و نشوونما کے لیے نئے مواقع اور نئی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ درس وتدریس کا کام زیادہ دلسوزی اور یکسوئی سے ہونے لگا۔ لیباٹریوں کے لیے ضروری اور جدید آلات و سامان فراہم کیے گئے۔ اساتذہ کی بڑی تعداد کو تعلیمی رخصت دے کر باہر بھیجا گیا، تاکہ وہ اپنے مضامین میں مزید لیاقت حاصل کر سکیں۔ سنجیدہ تصنیف و تالیف اور توسیعی خطبات کا بڑے پیمانے پر انتظام ہوا۔ طلبہ کی اقامتی زندگی اور سرگرمیوں کو زیادہ بامقصد، دلچسپ اور راحت رساں بنانے پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدابیر کو وسیع پیمانے پر نافذ کیا گیا۔ خوبصورت کارآمد اور ضروری عمارات تیار ہوئیں۔ یونیورسٹی کے خطے کو صحت بخش اور دل کشا بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر چمن بندی کی گئی اور باغات لگائے گئے۔ افتادہ زمینوں میں کاشتکاری شروع کی گئی۔ باہر کی علمی دنیا سے بہتر روابط قایم کیے گئے۔ انھوں نے دینیات و اسلامیات کے نصاب پر مستند علما سے نظرثانی کرائی اور اس کی خاطر خواہ تعلیم کا بندوبست کیا۔ قومی ورثے کی نگہداشت کے پیش نظر ایک مربوط اور فکر انگیز نصاب تیار کرایا اور اس کو نافذ کیا گیا۔ اسلامی علوم کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے ادارۂ علومِ اسلامیہ قایم کیا۔ شعبۂ تاریخ میں ازمنۂ وسطیٰ کی تحقیق و تدوین کے لیے ایک مستقل شعبۂ تصنیف و تالیف کھولا۔ قومی زبان کی توسیع و ترقی کے لیے بی اے اور بی ایس سی کی سطح پر لازمی اردو اور ہندی کا مناسب و معتبر نصاب رائج کیا۔ نوجوان طالب علموں کی بہتر مجلسی تربیت کے لیے ان کی انجمنِ اتحاد (یونیورسٹی یونین) کے قواعد وضوابط میں ایسی اصلاحات اور اضافے کیے گئے، جن سے اس کا کرکٹر زیادہ سے زیادہ جمہوری اور نمائندہ ہو گیا۔ اس کی خیابان بندی اس طور پر کرائی گئی کہ طلبہ اطمینان اور یکسوئی سے مطالعہ کریں یا گلگشت سے لطف اندوز ہوں۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی اسکیم منظور کرائی۔ یونیورسٹی لائبریری بالخصوص مخطوطات کے شعبے کی از سرِ نو تنظیم و توسیع ہوئی اور کتب خانہ کے لیے ایک علیحدہ، خوبصورت، کشادہ اور مناسب حال عمارت کی تجویز منظور کرائی۔ خواتین کے کالج کے اخراجات کی پوری ذمہ داری

ور کفالت یونیورسٹی سے منظور کرائی۔ یہ کالج علی گڑھ کے نامور فرزند شیخ عبداللہ مرحوم کی مجاہدانہ کوشش سے عرصے سے قائم ہے، مسلم یونیورسٹی سے ملحق تھا لیکن محدود و مالی وسائل کے سبب سے اپنے توسیعی پروگرام کو پورا کرنے سے معذور تھا۔ بورڈنگ ہاؤس اور ان کے کامن روم کی سرگرمیوں کو زیادہ باقاعدہ بنایا۔ انجینرنگ کالج، پالی ٹیکنک اور ان کی کارگاہوں (ورکشاپ) کے کاموں کو ترقی دی اور ان میں طلبہ کے داخلے کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یونیورسٹی ہسپتال اور ہلتھ سروس کے کاموں کو وسیع تر اور منظم تر کیا اور لائق طبی عملہ فراہم کیا۔ جن سے بحیثیتِ مجموعی طبی سہولتوں میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ طبیہ کالج کے نصاب میں مفید اور دور رس تبدیلیاں کی گئیں اور اس کے انتظام و انصرام کو زیادہ وسیع اور مستحکم بنیادوں پر قایم کیا گیا۔ مجوزہ میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیے حکومت کی باقاعدہ منظوری اور اعانت حاصل کی۔ امراضِ چشم کی مخصوص تعلیم اور تحقیقات کے لیے انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ یونیورسٹی کے املاک اور اراضی کا باضابطہ ریکارڈ تیار کرایا اور ان میں اضافے کیے۔ لائق اساتذہ، طالب علموں اور اہلِ علم کے نہ صرف ذاتی طور پر ہمت افزائی کی بلکہ ان کے کاموں کے لیے کثیر رقمیں حکومت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے فراہم کیں۔ ذاتی اثر و اعتبار سے جتنے کثیر عطیات حاصل کیے، اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے اور کلیتاً بدلے ہوئے حالات میں شاید ہی کبھی جمع کیے گئے ہوں۔ کیمپس کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کے پیشِ نظر تفصیلی منصوبہ مرتب کیا گیا، جس کا بڑا حصہ ذاکر صاحب کے عہد میں نافذ ہوا اور بقیہ بعد میں پورا کیا گیا۔ لائبریری، آرٹس فیکلٹی، جیالوجی اور فزکس کے نئے معمل، پالی ٹکنگ اور انجینرنگ کالج میں بڑے پیمانے پر ترمیم و توسیع، یونیورسٹی ہسپتال کی عمارت میں اضافہ اور ضروری ردوبدل، یونین کی عمارت کی توسیع وغیرہ جن کی تکمیل بعد میں ہوتی رہی، ان کا نقشہ اور ان کی تعمیر کے لیے ضروری رقم کی منظوری، یہ سب ذاکر صاحب ہی کے عہد میں طے پا چکے تھے۔

یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کے علاوہ ذاکر صاحب انجمن ترقی اردو

اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی صدر تھے۔ انجمن کا دفتر انھی کے ایما سے علی گڑھ منتقل ہوا۔ ان کی رہنمائی میں اس کی نئی تنظیم عمل میں آئی، مالی حیثیت سے مستحکم ہوئی اور اس کے کاموں کا آغاز ہوا۔ کانفرنس ایک مضمحل ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔ ذاکر صاحب نے اس کو سہارا دیا اور فعال و کار آمد بنایا۔ نابینا اسکول کو سرپرستی میں لے کر اس کی بنیادوں کو مضبوط اور اس کے مقاصد کو بارآور کیا۔ ہونہار اور ضرورتمند طالب علموں کی امداد اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ سر سید ڈے ایک عرصے سے رسمی، روایتی انداز سے منایا جاتا تھا، ذاکر صاحب نے اس کو اس طرح منانے کی طرح ڈالی جو نہ صرف اس دن کی اہمیت کو واضح اور دلنشین کرے، بلکہ علی گڑھ کے فرزندوں میں اس کے ذریعہ شعورِ ذات اور انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرے۔ یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں اور ان کے کمروں کو ادارے کی شایانِ شان نہایت نفاست سے مزین کرایا۔

غرض اتنا کچھ ہوا کہ ملک میں علی گڑھ کو نہ صرف ایک مثالی تعلیم گاہ کا درجہ حاصل ہوا، بلکہ وہ ایک ایسی تہذیب و شائستگی کا ترجمان بن گیا جو اصلاً اسلامی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی دوسری تمام تہذیبوں کی اعلا روایات و اقدار کو انسانیت کا ناقابلِ تقسیم ورثہ تسلیم کرتے ہوئے، ہندوستان کی تعمیرِ نو میں ایک اہم اور بیش بہا کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس طور پر مستقبل میں علی گڑھ ایک ہم آہنگ، وسیع المشرب اور مہذب قومی زندگی کے فروغ و استحکام کی علامت و بشارت بن گیا۔ یہ خوش آئند تبدیلی سب کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ تھی، لیکن اس کے محرک اور روحِ رواں ذاکر صاحب تھے۔

علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مقصد ہندی مسلمانوں کی اعلا ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنے تھے جو ایک طرف ان کو قومی زندگی میں ایک فعال اور ترقی پذیر جماعت کی حیثیت دلانے میں معین ہوں اور دوسری طرف ملک میں اسلامی تہذیب کی بامعنی اور تخلیقی نشو و نما میں مدد دیں۔ اس طور پر ایک بوقلموں متوازن ہندوستانی تمدن کے صحت مند

ہم آہنگ اور بابرکت ارتقا کے فروغ کا باعث ہوں۔ یہ ادارہ نوجوان نسلوں کی کیسی تربیت کرنا چاہتا تھا اور ان سے کیا توقعات رکھتا تھا، اس کی وضاحت اس ایڈرس میں ملے گی جو اس کی تاسیس کے موقع پر دیا گیا تھا، جس کا یہ اقتباس ہے:

".....THAT THIS COLLEGE MAY EXPAND INTO A UNIVERSITY WHOSE SONS SHALL GO FORTH THROUGH OUT THE LENGTH AND BREADTH OF THE LAND TO SPREAD THE GOSPEL OF FREE ENQUIRY, OF THE LARGE HEARTED TOLERATION AND OF PURE MORALITY....."

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا عہد علی گڑھ تحریک کے اس بنیادی نصب العین کی پیروی و پابندی کا رہا۔

ذاکر صاحب کا نہایت درجہ قابلِ قدر اور تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شدید تباہی اور یکسر مسماری کے ماحول میں تخلیق و تعمیر کے کاموں کا آغاز کیا۔ ان کا یہ عمل اس حدیث شریف کے مطابق تھا، جس میں آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اگر مجھ کو یہ یقین ہو کہ کل قیامت آنے والی ہے، تب بھی میں آج کھجور کا ایک نیا پودا زمین میں نصب کروں گا۔ اس قولِ پاک میں انسانیت کی تعمیر و تخلیقی تربیت کے لیے کتنی بشارتیں ملتی ہیں! اس وقت ذاکر صاحب کے اس عمل سے مایوس و ملول دلوں کو کیسی اور کتنی تسکین و تقویت نصیب ہوئی، اس کا تصوّر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بے غرض خدمت کا تصوّر عام کیا اور یہ بتایا کہ بے لوث خدمت بالآخر تخریبی عناصر پر غالب آتی ہے۔ انھوں نے اچھّے اور بڑے کام کو خود اپنا انعام جاننے اور ماننے پر زور دیا اور اسے عزّتِ نفس اور اطمینانِ نفس حاصل کرنے کا وسیلہ بتایا، تعصّب اور تنگ نظری کے مقابلے میں شرافت اور انسانیت پر قایم رہنے کا درس دیا۔ جہالت اور گمراہی کا سب سے موثّر علاج تعلیم و تہذیب سے کرنا سکھایا، مہذّب اور ایماندار رہنے کے لیے کوئی قیمت وصول کرنے کے بجائے قیمت ادا کرنے کی اہمیت جتائی، مایوسی کے اندھیرے میں امید اور حوصلے کے دیے کو روشن

رکھنے کی ذمہ داری کا احساس دلایا، ہندی مسلمانوں کو ہندوستانی انسانیت کا جزو لاینفک جان کر ان کی خدمت کو ہندوستان کی خدمت اور خیر اندیشی قرار دیا، اور ان پر ہندوستانی ریاست کی تمام ذمہ داریوں کو اپنانے کی ضرورت کو واضح کیا، علی گڑھ کو قوم کی امانت جان کر اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو ظاہر کیا۔ اس طور پر ہندوستان کی غیر مذہبی جمہوریت کی لاج رکھی۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے یہ آٹھ سال علی گڑھ اور ملک دونوں کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں جب وائس چانسلری کی میعاد کے پورے ہونے میں تقریباً سوا سال باقی تھا، ذاکر صاحب نے علی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا، جو انتہائی غیر متوقع تھا۔ سب نے اسے شدت سے محسوس کیا اور کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دیں، لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہ فیصلہ انھوں نے کن اسباب پر کیا، اس کی وضاحت نہ انھوں نے کی، نہ دوسروں کو دریافت کرنے کی جرأت ہوئی۔ قیاس آرائی بہت ہوئی، لیکن بیشتر غلط تھی۔ ذاکر صاحب اجتماعی ذمہ داری کا بڑا گہرا احساس رکھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے ذاتی خواہش اور نفع کو اجتماعی مفاد و مقاصد پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ اس لیے اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے علی گڑھ چھوڑا ہوگا، تو ان کے نزدیک یہ فیصلہ ان کی ذات کے لیے نہیں، بلکہ ادارے کے مفاد میں تھا۔ ذاکر صاحب نے کالج چھوڑا، تو جامعہ کو سنبھالا۔ پھر وقت آیا، تو جامعہ کو چھوڑ کر علی گڑھ کی ذمہ داری قبول کی۔ علی گڑھ سے جانے کے بعد قومی حکومت کی رکنیت اختیار کی۔ قومی خدمت کا مطالبہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے ہوا، ذاکر صاحب نے قبول کیا۔ ہر ایسے کام کو فرض جانا اور اس کو اس طرح انجام دیا کہ اس کام کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ لیکن جب کبھی یہ محسوس کیا کہ وہ مفوضہ فرائض کے مطالبات کو اس طرح پورا نہیں کر سکتے جس کا وہ متقاضی تھا، تو اس سے دست بردار ہو گئے۔

ذاکر صاحب طبعاً ہر شخص کو اپنا سمجھتے ہیں، یا اس میں اچھا بننے کی صلاحیت دیکھتے ہیں، یا اس کو اچھا بنا لینے کی اپنے میں صلاحیت پاتے ہیں۔ اخلاقی

نقطۂ نظر سے یہ اصول جتنا اعلا وارفع ہے، سیاست یا انتظامی مصالح کے اعتبار
سے اتنا ہی ناقابلِ عمل، مضر یا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تاریخ ہی سے نہیں، روزمرّہ
کے حالات و حوادث میں بھی اس کی تصدیق ملتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے کو بھی
اچھا سمجھنے لگتے ہیں، جو ناسزا کا مرتکب ہوتا، اپنے مسلک کا تقاضا اور اپنا کارنامہ
سمجھنے لگتے ہیں، جو ناسزا کا مرتکب ہوتا، اپنے مسلک کا تقاضا اور اپنا کارنامہ
سمجھتا ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ کسی ناسمجھ یا شریف آدمی سے کوئی لغزش
سرزد ہو جائے اور اس کی خبر کسی مفسد کو مل جائے، تو وہ اس راز کو افشا نہ کرنے کے
معاوضے میں طرح طرح کے تاوان وصول کرتا ہے اور بدنصیب گناہگار اپنی شہرت
اور ناموس بچانے کی خاطر اپنی ہر متاعِ عزیز کو قربان کرتا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کے
یہاں اس کی نوعیت اور طرح کی ہے۔ وہ اپنی نیک نامی کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں،
اس لیے کہ وہ ہمیشہ سے مسلّم اور بے داغ رہی ہے، بلکہ اپنے سکونِ خاطر کو بچانے
کے لیے جو ان کو بہت کم میسّر آتا ہے اور جس کے مرتکب یہی اہلِ غرض ہوتے ہیں،
ان کے مطالبات پورے کرتے رہتے ہیں، بعینہٖ اس بدنصیب کے مانند جس کا ذکر
اوپر آیا ہے۔ مختصر یہ کہ اہلِ غرض ذاکر صاحب سے اپنے سیئات کا انعام پاتے رہتے
ہیں اور خود ذاکر صاحب اپنے حسنات کا تاوان ان کو ادا کرتے رہتے ہیں اور جب
تک فریقین بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں، یہ کاروبار یوں ہی چلتا رہے گا۔ کام کرنے اور شاید
کام لینے کا ایک اسٹائل یہ بھی ہے، لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ یہ فتنہ ایک بار راہ
پا جائے، تو کسی نہ کسی وقت اپنا سر ضرور اٹھائے گا۔ پھر وہ سب کچھ ہو جائے گا جو
جلد بدیر ایسے میں ہوا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نالائق یا فتنہ پرداز کو ذاکر صاحب
جتنا جلد پہچان لیتے ہیں، دوسرا شاید نہ پہچان سکتا ہو۔ نیز وہ ان عناصر کو جس طرح قابو
میں رکھ سکتے ہیں، دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ لیکن منصب کے دوران میں، ورنہ اس سے
کنارہ کش ہونے کے بعد وہ عناصر و عوامل جیسا کہ ان کا معمول ہے، اپنی پوری تخریبی
قوتوں سے ابھرتے ہیں جن کو ذاکر صاحب نے اپنے عہد میں کسی نہ کسی مصلحت
کی بنا پر انگیز کیا تھا یا اپنے طور پر قابو میں رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام اقدار اور رادارے
منصوبے، مقاصد اور نیک ارادے جن کی حفاظت اور ترقی کی امانت و عنانت

ان کے سپرد کی گئی تھی، ان کی علیحدگی کے بعد ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب جرائم کی اصلاح کر سکتے ہیں، جرائم پیشہ کا استیصال نہیں کر سکتے۔ اسے اچھے اور بڑے آدمی کی بڑائی بھی کہہ سکتے ہیں، اور اس کی معذوری بھی! بہرحال یہ جام و سندان باختن کا معاملہ ہو یا نہیں، اندیشہائے دور دراز کا مسئلہ ضرور ہے۔

ذاکر صاحب میں ایک خاصہ یا خوبی اپنے قبائلی اجداد کی ملتی ہے، یعنی صوفیہ، فقرا اور اہل اللہ سے ارادت۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کے کشف و کرامات پر اتنی نظر نہیں رکھتے، جتنی ان کے پاکیزہ کردار پر۔ اس سے ان کی اخلاقی و ذہنی در و بست میں توانائی اور نظر میں رفعت و رافت آئی ہے۔ معلم و مرشد کا قران ذاکر صاحب میں آج سے نہیں، بہت دنوں سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس قران کو ہر سطح اور ہر موقع پر ملحوظ رکھنا کبھی کبھی فتنے اور فتور کا بھی باعث ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو کر ادجع طور سے اپنے ساتھیوں میں واپس تشریف لائے تو سامری کی فتنہ پردازی اور گئو سالہ کی گرم گفتاری پر بے اختیار ہو گئے اور حضرت ہارونؑ پر، جن کے سپرد کمپ کا ڈسپلن کر گئے تھے، پیش دستی کر بیٹھے۔ رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی ایک قبطی کو بنی اسرائیل پر ظلم کرتے دیکھ کر حضرت نے ایک گھونسے سے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ پیغمبروں میں یہ روایت صرف حضرت موسیٰ کے حصے میں آئی۔ اس پر کسی ستم ظریف نے یہ کہا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار میں صرف ایک پیغمبر پٹھان تھے، یعنی حضرت موسیٰؑ ذاکر صاحب کے سامنے قایم گنج کے ہم وطنوں کی اس طرح کی کتنی روایات تھیں، لیکن انھوں نے اپنے وطن، اپنے سرحدی قبائلی اجداد اور حضرت موسیٰؑ کی روایات نیز اقبال کے مشہور مقولہ "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد" کو نظر انداز کر کے حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہو جانے کی روایت کو کس طرح ترجیح دی تعجب سے خالی نہیں۔

ایک بات ذہن میں اکثر آئی ہے۔ وہ یہ کہ داستان کوئی لکھے، ڈراما میرا دیکھا ہوا ہے، اور مولانا محمد علی کا فقرہ یاد ہے، جو کچھ اس طرح کا تھا: جامعہ ملیہ کو قایم کرنا اور فروغ دینا اتنا مقصود نہیں ہے، جتنا ام اے او کالج کو

قبضے میں لینا اور راہ پر لانا منظور ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کتنی کڑی قربانی دے کر اور آزمائش میں پڑ کر اس کا پتہ یکسر بدل دیا اور جامعہ کو بجائے خود ایک مستقل مقصد بنا دیا اور کتنا عظیم الشان مقصد! ان کے عہد میں ان کے غیر معمولی ایثار و اثر سے ہندوستان میں جامعہ ایک نادر الوجود ادارہ تھی۔ لیکن ذاکر صاحب جامعہ سے علیحدہ ہوئے تو جامعہ بھی شعلۂ مستعجل بن کر رہ گئی۔ علی گڑھ اور جامعہ دونوں کو ذاکر صاحب ملے۔ ایک نے ذاکر صاحب کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا، دوسرے کو ذاکر صاحب نے پالا پوسا اور پروان چڑھایا لیکن اگر کسی دیوانے کو یہ کہتے بھی سنا جائے، تو فرزانے کیا کہیں گے کہ علی گڑھ سے ٹوٹ کر جامعۂ ملیہ اسلامیہ خانۂ خدا بنی ہو یا نہیں، علی گڑھ آج بھی خانۂ خلق اللہ ہے۔

ذاکر صاحب دلّی سے علی گڑھ گئے، تو خیال تھا کہ تھوڑے دنوں ان کو آرام و سکون ملے گا جس کی ان کو بڑی ضرورت تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہاں پہنچتے ہی حکومتِ ہند نے ان کو یونیسکو کے اجلاس میں جو اسی سال دلّی میں منعقد ہو رہا تھا، اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ اس اجلاس میں یونیسکو نے ان کو اپنی مجلسِ منتظمہ کا رُکن منتخب کیا۔ اور اس سلسلے میں انھیں یورپ جانا پڑا۔ اس مجلس کے دو وقفوں میں ذاکر صاحب علاج کے لیے جرمنی گئے۔ وہیں وزیرِ اعظم کا پیغام پہنچا کہ بہار کی گورنری پر تقرر کرنا چاہتے ہیں اور وہ ذاکر صاحب کا جواب نفی میں قبول نہ کریں گے۔ جو لوگ ذاکر صاحب کو جانتے ہیں، وہ اس کا احساس آسانی سے کر سکتے ہیں کہ ان کا دل اس عہدے کو آسانی سے قبول کر لینے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوا ہوگا؛ اور اس قسم کی دعوت محض وزیرِ اعظم کی طرف سے موصول ہوتی تو بہت ممکن ہے، وہ معذرت کی کوئی صورت نکال لیتے، لیکن ان کے لیے پنڈت جی کی بات کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ گاندھی جی کے بعد اگر کسی کے منشار کو پورا کرنے میں ان کو دلی خوشی ہوتی، تو وہ پنڈت جی تھے۔ ذاکر صاحب آمادہ ہو گئے اور غالباً اپریل ۱۹۵۷ء میں پٹنہ جا کر گورنری کا چارج لے لیا۔ مسلسل پانچ سال تک اس کی ذمہ داریوں سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہوتے رہے۔ ان کو حکومت

اور عوام کا وہ مثالی اعتماد اور تعاون حاصل رہا، جسے اہالیانِ بہار اور حکومتِ ہند مدتوں نہ بھلا سکیں گے۔

گورنر کی آئینی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ صرف مخصوص حالت میں صدرِ ہند کے نمائندۂ خاص کی حیثیت سے اسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ورنہ عام طور پر ریاستی حکومت کا سارا کام وزیرِ اعلا اور اسکی کابینہ انجام دیتی ہے اور گورنر محض ایک مشیر کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے مشورے کی پابندی پر ریاستی حکومت بالکل مجبور نہیں ہوتی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کے اعلا ذہن اور اخلاقی صفات کا نتیجہ تھا کہ حکومت ان کے مشورے کی طلبگار ہوتی اور اس پر عمل کرتی۔ اس کے ساتھ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ راج بھون جو ریاست کی عام زندگی سے الگ تھلگ، حکومت کے سب سے بڑے نمائندہ کا ایک سرد اور سنسان مسکن تھا اور صرف سرکاری تقریبات کے موقعوں پر اس بیمار کے منہ پر مضمحل سی رونق آجاتی، ذاکر صاحب کی موجودگی سے اربابِ علم و فن، طلبہ، شرفا اور ضرورت مندوں کا ماویٰ و ملجا بن گیا۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تزیین و آرائش میں ذاکر صاحب نے جو دلچسپی لی، اس کا صحت مند اور خوشگوار اثر ہر شخص نے محسوس کیا۔ انھوں نے وہاں کے مقررہ قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی اس خوش اسلوبی سے کی اور کرائی کہ یہ گرانیٔ طبع کا باعث بننے کے بجائے گوارا اور پسندیدہ معلوم ہونے لگے۔

ذاکر صاحب موقع اور محل کے مناسبِ حال عمل پر قدرت رکھتے ہیں ان کی طبیعت میں بیک وقت اثر پذیر اور اثر انداز ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کا غیر معمولی رسا ذہن آسانی سے ان اسرار و رموز کو پالیتا ہے۔ جو دوسروں کی سمجھ میں مسلسل مشاہدے اور مطالعے سے بھی بہ مشکل آتے ہیں۔ ان کی یہ صفت علم و حکمت کے دقائق اور غوامض ہی کی عقدہ کشائی پر قادر نہیں ہے، بلکہ زندگی میں نت نئے پیش آنے والے پیچیدہ اور نازک مسائل کے سلجھانے میں بھی کارگر ہوتی ہے۔ بہار میں وہ نہ صرف ایک ہر دلعزیز گورنر تھے، بلکہ ریاست کے ایک محترم بزرگ، دانشوروں اور طالب علموں کے ہمدرد و قدردان

اور حکومت کے معتبر مشیر اور عوام کے خیر خواہ تھے۔ اس زمانے میں بہار کے جن لوگوں سے ملنا ہوا، وہ ذاکر صاحب کی گورنری کو ریاست کے لیے باعثِ امتنان و افتخار سمجھتے تھے۔

۱۹۶۲ء کے انتخابات کے بعد جب نئی مرکزی حکومت بنی، تو ذاکر صاحب کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں، ان سے ملک کا ہر چھوٹا بڑا واقف ہے اور اب پچھلے مئی ۱۹۶۷ء سے وہ صدرِ جمہوریہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے ہے۔ لیکن حکومت کا ایک عالی مقام عہدے دار ہونا ذاکر صاحب کے لیے اتنا وجہِ امتیاز نہیں، جتنا یہ کہ ان کی حیثیت ایک اعلا مدبّر اور رقائد کی ہے، جو ہماری تہذیب کی اعلا اقدار کا حامل و مبلّغ، ہندوستانی ریاست کے بنیادی عقائد کا نگہبان، انصاف، انسانیت اور شرافت کا پیکر و پیامبر، اور ہندوستان میں عالمگیر انسانیت کے اتحاد و یگانگت کا بے لوث خادم بھی ہے اور اس کا گرانمایہ مخدوم بھی۔ حکومت اور ریاست کا کاروبار جیسا کچھ ہوتا ہے، اس سے تھوڑا یا بہت کون نہیں واقف ہے۔ مصلحت کی خاطر کیا کیا نہیں ہوتا اور جو اس کام میں پڑتا ہے اس کو کیا کچھ کرنا سننا یا سہنا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب کے حصّے میں یہ سب آیا ہو تو کیا عجب۔ لیکن ملک کے سنجیدہ طبقے کو اس کا یقین ہے کہ ذاکر صاحب بااصول اور صالح سیاست کے راستے سے کسی حال میں تجاوز نہ کریں گے۔ اور حکومت و ریاست کے کاموں میں ہمیشہ انصاف پسندی اور روشن خیالی سے کام لیں گے۔ ذاکر صاحب کا نہ صرف یہ عقیدہ ہے، بلکہ عمل بھی ہے کہ اعلا مقاصد صرف اعلا وسیلوں سے حاصل ہوتے ہیں اور اعلا مقاصد ادنیٰ وسیلوں کے استعمال کا کبھی جواز نہیں بن سکتے۔ حکومت کے فیصلوں کے خوب و زشت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن ذاکر صاحب اپنا فریضہ پورا کرنے میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ اس کا اعتراف ان کے سارے ہم وطن کرتے ہیں، خواہ وہ کسی مسلک و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

ذاکر صاحب کے لیے نئی اور نادر چیزوں میں بڑی کشش ہے، چاہے وہ چیزیں اتنی مختلف ہوں جتنا گلاب کا پھول یا جیالوجی کا کوئی عجوبہ، نئی چال کی تصویر اور مصوری ہو یا پرانے زمانے کا کوئی مخطوط، "شریعت "طریقت، تصوف، کلام،" پر کوئی قدیم تصنیف ہو یا مغرب کے جدید ترین ناول اور افسانے۔ یہ "اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں" اظہارِ واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب گھر پر ہوں گے تو ان سے چند ہی گز کے فاصلے پر یہ ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر رونق افروز ملیں گی۔ کوئی صاحبِ فن ہو، اس سے گفتگو اُس سطح سے کریں گے جو فن اور فنکار دونوں کے حسبِ حال ہو۔ ایسے میں بعض فنکاروں نے کچھ اس طرح بھی محسوس کیا ہے جیسے ذاکر صاحب کے سامنے عرضِ ہنر کرنے میں محتاط رہنا فن سے مقدم یعنی فرزانگی ہے۔ ذاکر صاحب کے فکر کی تازہ کاری اور تخئیل و ذوق کی رنگارنگی، ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کو کبھی باسی یا دوراز کار اور ان کی نفع رسانیوں کو کبھی کم نہ کر سکیں گی، جس طرح فطرت کی تازہ کاری رنگارنگی اور نفع رسانی میں آج تک نہ کوئی فرق آیا، نہ آئے گا۔ زندگی اسی کا نام ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے "ہر دم جوان ہے زندگی"، یہ صلاحیتیں زیادہ تر فطری ہوتی ہیں، لیکن اس میں اس تربیت کو بھی بڑا دخل ہے جو فرد کو اپنی تاریخ و تہذیب کی اعلا روایات، صحت مند، پُر آزمایش ماحول اور محترم بزرگوں اور ممتاز ساتھیوں سے میسّر آتی ہے، ام اے او کالج کی تعلیم و تربیت کے یہی وہ عوامل تھے، جن کے کسر و انکسار میں ذاکر صاحب کی شخصیت بالیدہ ہوئی اور برگ و بار لائی اور کیسے عجیب اور عظیم عوامل تھے وہ، "گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را"، بقولِ غالب۔

علم، مذہب، اخلاق اور انسان دوستی کے پیر و پیکر کبھی اپنی افادیت و اہمیت نہیں کھوتے، اس لیے کہ وہ اقدارِ عظیمہ کے امین و حامل ہوتے ہیں۔ وہ جتنے معمر اور نحیف ہوتے جاتے ہیں، ان کا فیض اور فضیلتیں اتنی ہی زیادہ وسیع، مؤثر اور محکم ہوتی جاتی ہیں، بر خلاف سیاسی لیڈروں یا سرکاری و نیم سرکاری عمّال یا عہدہ داروں کے جو باعتبارِ منصب و عہدہ کتنے ہی اثر و اقتدار کے مالک

کیوں نہ ہو جائیں، ان سے سبکدوش یا محروم ہوتے ہی اتنے کس مپرسں اور نامراد ہو جاتے ہیں جیسے وہ اپنے دورِ منزلت کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہوں۔ ایسی عبرت ناک مثالیں ہر شخص ہر روز، ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ جن اعلا صفات اور خدمات کی بنا پر ذاکر صاحب نے عام دلوں میں عزّت و محبّت کی جگہ پیدا کرلی ہے، وہ ہمیشہ ترقی کرتی رہے گی خواہ وہ کسی سیاسی یا ملکی عہدے پر متمکّن رہیں یا نہ رہیں۔ وہ نائب صدر اور صدر کے مناصب پر فائز نہ ہوتے، جب بھی ان کے مرتبے میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان عہدوں کی سربراہی ان کو سونپی نہ گئی ہوتی، تو کیا عجب وہ عوام اور خواص میں اور زیادہ مقبول و محترم ہو جاتے۔ ذاکر صاحب کی منزلت کا مدار مناصبِ جلیلہ پر نہیں، بلکہ اخلاقِ فاضلہ پر رہا ہے۔ اور اخلاقِ فاضلہ میں ذوق و ذہانت اور علم و دانش کا اضافہ ہو جائے، تو شخص اور شخصیت کی گرانمایگی لازوال ہو جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔ انھوں نے کثرت سے سفر کیے ہیں۔ ہر سطح پر ہر طرح کے ذہنوں سے گوناگوں مسائل پر گفت و شنید کے مواقع آئے ہوں گے۔ ان کو افہام و تفہیم سے ہموار کرنے میں ذاکر صاحب کی کتنی اور کیسی کیسی اعلا ذہنی اور اخلاقی صلاحیتیں بر سرِ کار آئی ہوں گی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسے موقع پر ان سے بہت قریب یا ان کی زندگی کی سرگزشت سے واقف ہوں گے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھنے میں ذاکر صاحب بڑی انصاف پسندی اور ہمدردی سے کام لیتے ہیں۔ اس اصول یا عقیدہ پر کاربند ہونا آسان نہیں، اس لیے کہ اس میں دوسرے کے حق بجانب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ سیاست اور ڈپلومسی کی دنیا میں ایسے حق شناس اور عالی ظرف کم ملیں گے جو اس خطرے کا سامنا کر سکیں۔ تنازعے کے تصفیہ کے لیے ایسا فارمولا دریافت کر لینا، جس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق اور کم سے کم اختلاف ہو، ذاکر صاحب کا ایسا ہنر ہے، جس میں ان کا ہمسر مشکل سے ملے گا۔

اس کی مثالیں اس زمانے میں دیکھنے میں آئیں، جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، کانفرنسوں، کونسلوں اور کمیٹیوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا موقع آیا ہوگا، جب اتفاقِ آرا کے بجائے کثرتِ آرا سے متنازعہ فیہ مسئلہ کا تصفیہ ہوا ہو۔ طریق کار بالعموم یہ ہوتا کہ زیرِ بحث مسئلے پر ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ اپنا نقطۂ نظر نہایت اطمینان اور شرح و بسط سے پیش کرے۔ صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب بھی اس میں حصّہ لیتے۔ گفتگو کے بعد ذاکر صاحب اپنی تجویز پیش کرتے، اور وہ ایسی جامع و مانع ہوتی کہ تمام ممبر اس پر متفق ہو جاتے اور یہ محسوس کرتے کہ زیرِ بحث مسئلے کا بحیثیت مجموعی وہی تصفیہ مناسب حال تھا، جو ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا جیسے تنازعہ اور اس کا تصفیہ دونوں بیک وقت ان کے سامنے آتے ہوں۔ اس کا سب سے اچھا اثر یہ ہوتا کہ میٹنگ کے بعد کسی ممبر کے ذہن میں اپنے ساتھیوں کے خلاف کوئی کاوش یا کدورت نہ پیدا ہوتی، نہ باقی رہتی۔ اعلا تعلیم گاہوں میں یہ روایت اور فضا کتنی مفید اور مبارک ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس صورت حال سے ہو سکتا ہے، جو عام طور پر آج کل چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں میں نظر آتی ہے اور ملک کی بھلائی اور بڑائی چاہنے والوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے ذاکر صاحب کے عہد میں اور انھی کی رہنمائی میں طلبہ کی مجلسِ اتحاد (یونیورسٹی یونین کلب) کے قواعد و ضوابط میں بڑی وسعتِ نظر سے ایسی اصلاح و اضافے کیے گئے کہ خود طلبا ان سے زیادہ حقوقِ آزادی کے کبھی طلبگار نہیں ہوئے۔ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی یونین کو جتنے جمہوری حقوق ملے ہوئے ہیں کسی دوسری یونیورسٹی کی یونین کو نصیب نہیں ہیں۔ اسے ذاکر صاحب کا فیض کہیے، یا طلبہ کا احساسِ ذمّہ داری و فرض شناسی کہ ان کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں طلبہ نے یونین کے راستے سے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو ان کے اور اس ادارے کی بہترین توقعات اور روایات کے شایانِ شان نہ ہو۔

ذاکر صاحب کے ارد گرد ہر طرح کی مخلوق مل سکتی ہے، سوائے اس

نسل کے جسے عرفِ عام میں مصاحب یا درباری کہتے ہیں پہلے کبھی کسی رئیس اور ریاست کا مرتبہ اس پیمانے سے ناپتے تھے کہ اس پر کتنا قرض ہے اور اس کے گرد کتنے مصاحب ہیں۔ رئیس اور ریاست تو اپنی شامتِ اعمال سے ختم ہو گئے، لیکن ہماری شامت اعمال سے ان کے اسنار ریار روایات باقی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ قرض حکومت کے اور مصاحب نیتاؤں کے حصے میں آئے۔ ذاکر صاحب کو اچھے لوگوں میں بیٹھ کر اچھی باتیں کرنے کا بڑا شوق اور سلیقہ ہے، بالخصوص طلبہ، اساتذہ اور ارباب فن و کمال سے۔ ایسے میں ان کا انداز حاکمانہ ہوتا ہے نہ مربیانہ، بلکہ نہایت درجہ احترام و دلنوازی کا۔ اپنی شان کے مطابق بات کرنا سب کو آتا ہے۔ بالخصوص جب وہ شان مشتبہ ہو، لیکن دوسروں کے نازک، شریفانہ احساس اور اس کی ذہنی و اخلاقی سطح کو ملحوظ رکھ کر اس طرح گفتگو یا پرسشِ احوال کرنا کہ مخاطب کی تشفی ہو اور اسے اچھے سے اچھے کام کرنے کی ترغیب ملے، ذاکر صاحب کی سلامتِ طبع، دلسوزی اور دانشمندی کی نمایاں دلیل ہے۔ البتہ وہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ آدمی کو جو مخصوص ذمہ داری اور فرائض ہوں، وہ ان سے مختلف، فروتر مسائل پر گفتگو کرے اور اس میں اعانت کا خواستگار رہا یا داد پانے کا متمنی ہو۔ لیکن اس اچھا سمجھنے یا نہ سمجھنے کی اہمیت اکثر باقی نہیں رہتی، جب گدائے مبرم جن کی بے شمار اقسام ہیں اپنے مطالبے کو ان سے منوا کر رہتا ہے۔

ذاکر صاحب کا یہ عمل اکثر ایک فارمولے کی بنا پر ہوتا ہے، جس کا قصہ انھوں نے ایک بار بڑے لطف سے سنایا تھا۔ ذاکر صاحب جامعہ کے ابتدائی دور میں قرول باغ میں مقیم تھے۔ ان کی اور ان کے رفقا کی زندگی جس "پیغمبری وقت" سے گزر رہی تھی، وہ سب جانتے ہیں۔ ایک دن کوئی مولوی صاحب تشریف لائے اور ذاکر صاحب سے تادیر ان تمام امور پر گفتگو کرتے رہے، جن کا ہر غیر مسلم کو مشرف باسلام ہوتے وقت اقرار کرنا اور ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ان مواعظ کو اس احترام و عقیدت سے سنا جیسے اس طرح سننا بھی ایمان کا جزوِ لازم ہو۔ لیکن جب مولوی صاحب نے عقائد میں

ایک عمل کا اضافہ کیا یعنی کچھ روپے مانگے، تو ذاکر صاحب کی سنجیدگی، سراسیمگی میں منتقل ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور بڑی نرمی اور نوازش سے فرمایا "میں جانتا ہوں زمانہ سازگار نہیں، زندگی پائیدار نہیں۔ مجھے ایسی فرمائش نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن اب جب کہ کر چکا، تو اس کو پورا کرنا لازم آتا ہے۔" مولوی صاحب کا مطالبہ کسی نہ کسی طرح پورا کیا گیا۔ یہ فارمولا تفریح بھی ہے، ٹریجڈی بھی! اور ذاکر صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ کب اور کہاں تک یہ تفریح ہے، اور کہاں پہنچ کر یہ ٹریجڈی بن جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کی آب و ہوا، میں مصاحب اور درباری پنپ نہیں سکتے۔ جب تک وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، کسی بھلے آدمی کو اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ ذاکر صاحب کے گرد ایسے مختلف الاوضاع اور اتنے کثیر المقاصد منصوبے کے اشخاص جمع رہتے ہیں یا ایسے موانع ہوتے ہیں کہ عرضِ حال کا نہ موقع ملتا ہے، نہ اس کی ہمت ہوتی ہے۔ درباری یا مصاحب دُور دُور تک نظر نہ آتے۔ سبب یہ تھا کہ طالب علم ہوں یا ارکینِ اسٹاف، ذاکر صاحب ان سے جس شفقت و عزت سے پیش آتے، اسی شوق سے یہ بھی ضرور دریافت کرتے کہ اس نے مطالعہ کے لیے کیا مضامین انتخاب کیے ہیں، کیا پڑھا ہے، اور کس ڈھنگ سے پڑھا ہے، فلاں کتاب یا مصنّف کے مطالعہ کا موقع ملا ہے یا نہیں۔ اسی طرح ارکینِ اسٹاف سے بھی بعنوانِ شائستہ یہ پوچھتے کہ وہ کیا پڑھاتا ہے، کیا کتابیں، کن مصنفین کی مطالعہ میں رہتی ہیں، نصاب کیا ہے، کیا ہونا چاہیئے، شعبہ کی ترقی کی کیا اسکیم پیشِ نظر ہے، کیا مضامین لکھے اور شائع کیے، طلبہ اور شعبہ کے رفقائے کار سے کتنا اور کیسا ربط ہے، اور اسی طرح کی دوسری باتیں۔ آرٹ ہو یا سائنس، انجینیرنگ ہو یا ڈاکٹری، اسپورٹس ہوں یا صحت و صفائی کے منصوبے، امورِ دین ہوں یا مسائلِ مملکت ان سب پر ذاکر صاحب کی نظر حیرت انگیز حد تک جامع و معتبر ہے۔ اس لیے اصحابِ متعلقہ ان پر نیاز ارخیالات کرنے کے مواقع یا مواخذے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے، تاوقتیکہ ان کو ان مسائل پر عبور نہ ہوتا اور ان کی خدمات

بحیثیت مجموعی قابلِ اعتنا نہ ہوتیں، اور یہ وہ مواقع تھے جو درباریوں اور مصاحبوں کے لیے ناسازگار اور ناقابلِ تسخیر تھے۔ پھر بھی یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ زمین کتنی ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو، شعرائے کرام اشعار نکال ہی لیتے تھے۔

عام طور پر منفی خوبیاں قابلِ لحاظ ہوتیں مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شخص آبرو باختہ، برخود غلط، ابن الوقت، بد باطن، جھوٹا، بدچلن یا ہرزہ سرا نہیں ہے تو یہ اس شخص کی کوئی تعریف نہیں ہے اس لیے کہ یہ عیوب عام طور پر شریف لکھے پڑھے آدمی میں یوں بھی نہیں ہوتے، نہ ہونے چاہیئے۔ لیکن جب بدحالی، بدنظمی اور بے غیرتی عام ہو اور اخلاقی بندشیں تیزی سے ٹوٹ رہی ہوں، اس وقت سلبی صفات ایجابی خوبیوں کی ہم سطح ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ ایجابی صفات تقریباً معدوم ہو چکی ہوتی ہیں۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی سے آج تک کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو کوئی پہلو مجہول یا مبہم نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کبھی کوئی بات اضطراراً یا تفریحاً ایسی نہیں کی، جو شرافت و شائستگی کے آئین کے خلاف ہو۔ کسی موقع پر اور کسی حال میں کوئی سخیف یا سوقیانہ کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ اپنی کسی برتری کا بھولے سے بھی اظہار نہیں کیا۔ کسی کی ہتک یا آزاری نہیں کی۔ مخالفوں ہی سے نہیں، دشمنوں سے بھی تحمّل و تواضع سے پیش آئے۔ اپنی بات منوانے کے لیے نہ گلے پر زور دیا نہ زبان کو آلودہ کیا، بلکہ سنجیدگی اور مساوات کی فضا کو ہر طرح سے برقرار رکھا۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں وہ جس ہمدردی، وسیع النظری اور دانشمندی سے کام لیتے ہیں وہ ان کی اعلا ذہنی و اخلاقی قابلیت کا ثبوت ہے۔ آدمیوں کے جنگل میں وہ چند ہی ایسے افراد میں ہیں، جو احساسِ کمتری سے مغلوب ہو کر احساسِ برتری کی نمائش طرح طرح کی خفیف الحرکتی سے نہیں کرتے۔ ذاکر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں، ہر شخص سے خوش ہو کر عزت و محبّت سے ملتے ہیں۔ ملنے والے سے کبھی نہ اکتائیں گے۔ کسی بدنصیب کی آبروریزی میں دلچسپی لینا درکنار، اس خیال کو بھی ذہن میں نہ آنے دیں گے، بلکہ اس کی ہر طرح سے پردہ پوشی کریں گے۔ انھوں نے کبھی احسان نہیں جتایا۔ بظاہر یہ بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں

شک نہیں کہ یہ بڑے ظرف وضبط کا کام ہے جیسے جذباتِ غضبیہ وشہوانیہ کو قابو میں رکھنا۔ پوشاک ہمیشہ دیسی کپڑے کی سادہ، سجل، ستھری، بیشتر سفید پہنی۔ ان کے جسم پر کسی نے کاواک، ملگجا، بوسیدہ یا داغدار لباس نہیں دیکھا۔ مہمان کی تواضع وتکریم میں وہ بہت ہی فیاضی وفخر سے کام لیتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو تحائف دینے اور ان کے لیے پھل اور مٹھائی وغیرہ خریدنے میں روپے کا نہیں، صرف اپنے حوصلے اور عزیزوں دوستوں سے محبت اور ان کے احترام کا خیال رکھتے ہیں، اور یہ باتیں اس وقت سے ہیں جب وہ نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، نہ بہار کے گورنر، نہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور صدر بلکہ صرف ذاکر صاحب تھے اور آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے۔

ذاکر صاحب کو تحریر اور تقریر پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، ان کے خطبات، تراجم اور مضامین ہمارے علم وادب میں قیمتی اور مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوّں کے لیے بھی کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں، جو شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ذاکر صاحب کا منفرد اسلوب ہے۔ ان کا متوازن، متجسّس، شائستہ، شفاف وشگرف ذہن، پاکیزہ، شریفانہ اور نازک احساس، شگفتہ ادبی ذوق، بیدار د تربیت یافتہ شعور، وسیع د متنوع مشاہدہ، علم اور تجربہ، انسانیت سے عشق اور خدائے واحد پر ایمان، ان کی تحریر وتقریر کو غیر معمولی کشش، قوت، حسن اور تاثیر بخشتے ہیں۔ ذاکر صاحب حتیّٰ الوسع تحریر وتقریر سے بچتے ہیں، اس لیے کہ ان کاموں کے لیے جتنا وقت یا فرصت درکار ہوتی ہے، وہ ان کو بہت کم میسّر آتی ہے ایسے مشاغل کے لیے وہ اسی وقت آمادہ ہوتے ہیں، جب گریز کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہ کام سخت ذہنی اور جذباتی فشار میں انجام پاتا ہے۔ وہ اصلاً تکمیل پسند ہیں، اس لیے خود اپنے کاموں سے بہت کم مطمئن ہوتے ہیں۔ بڑے ذہن کا احساس اکثر یہی ہوتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھ دیا ہے، وہ اپنے موضوع پر اجتہاد واستناد کا

درجہ رکھتا ہے۔ سادگی، اعتقاد اور جوشش جو اچھی ادبی تحریر کی اہم خصوصیات بتائی جاتی ہیں، ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر میں ان کا بڑا اچھا اظہار و امتزاج ملتا ہے۔ وہ حشو و روائد سے یکسر پاک ہوتی ہیں اور پڑھنے اور سننے والے کو ہمیشہ ایک نئے خیال انگیز اور قیمتی تجربے سے آشنا کرتی ہیں، جس سے تعمیری و تخلیقی فکر و عمل کی کتنی راہیں کھلتی اور روشن ہوتی ہیں۔ کتنے مختلف النوع مواقع اور مشکل، نازک اور خصوصی موضوعات پر کس کثرت سے ذاکر صاحب کو تقریر کرنی پڑتی ہے، لیکن ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے نئی اور وقیع بات کہی۔ یہ فن اور فیض کم کسی کے نصیب میں آیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اب کس کو ندا کی آواز پر وہ کدھر اور کہاں جاتے ہیں۔ سعدیؒ کا دیدہ و دل بہر حال ان کے ہمراہ اور جگر کا یہ شعر زبان پر رہے گا۔

نیتِ شب بخیر اے ساقی
بزمِ جم کیا ہے، ساغرِ جم کیا!

یوسف حسین خاں

ذاکر میاں

آباو اجداد

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ مغربی دوآبے کے سرکش لوگوں کی روک تھام کے لیے بادشاہ بلبن نے پٹیالی اور کمپل میں افغانوں کی بستیاں آباد کیں اور خود چھ مہینے یہاں ٹھہر کر گڑھیاں تعمیر کرائیں۔ پٹیالی وہی جگہ ہے جہاں امیر خسرو پیدا ہوئے تھے۔ یہ اب ضلع ایٹہ میں ہے۔ کمپل ضلع فرخ آباد میں گنگا کے کنارے واقع ہے۔ یہاں گنگا کے کنارے کنارے کئی میل تک افغانوں کے خاندان آباد کیے گئے تھے کہ وہ کھیتی باڑی کریں اور ضرورت پر شاہی فوج میں بھرتی ہو کر ملک میں امن و امان قایم رکھنے اور منگولوں کی روک تھام کے لیے ہندوستان کی سرحد پر اپنی وفاداری اور بہادری کے جوہر دکھائیں۔ اس علاقے میں افغانوں کی آبادکاری کا یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ مغلوں کی فتوحات سے پہلے خلجیوں اور لودھیوں کے زمانے میں بھی یہاں وقتاً فوقتاً افغان قبیلے آکر آباد ہوتے رہے جن میں غلزئی، خٹک اور بنگش کی تعداد زیادہ تھی۔

جہانگیر کے عہد میں سرحدی آفریدیوں اور شنواریوں نے مغلیہ سلطنت کے خلاف زبردست شورش برپا کر دی تھی۔ مہابت خاں نے دیکھا

کہ وہ زور زبردستی سے قابو میں نہیں آتے۔ اس پر اس نے انھیں تالیفِ قلب کے ذریعے سے رام کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے قبائلی سرداروں کو انعام و اکرام سے نوازا اور ان کی ہر طرح سے دلجوئی کی۔ انھیں سرداروں میں اللہ داد خان بھی تھے، جو بعد کو نواب رشید خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ جب اللہ داد خان جہانگیر کے دربار میں پیش ہوئے، تو بادشاہ نے انھیں اختیار دیا کہ شمالی ہندوستان میں جو افغان آبادیاں ہیں، ان میں سے جہاں بھی چاہیں، سکونت اختیار کرلیں۔ انھوں نے پرگنہ کمپل کو پسند کیا، چنانچہ یہ انھیں جاگیر میں دے دیا گیا۔ یہاں انھوں نے گنگا کے کنارے ایک گڑھی تعمیر کرائی جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ بستی اس وقت سے مئو رشید آباد کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی خدمات کے صلے میں شاہجہان نے انھیں نواب رشید خان کا خطاب عطا کر کے تلنگانے کے صوبے کا ناظم (گورنر) مقرر کیا، نیز چار ہزار ذات اور تین ہزار سوار کے منصب سے نوازا۔ نواب رشید خان شاہجہانی عہد کے بڑے کامیاب گورنروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ دکن میں بہت عرصے تک رہے، لیکن گنگا کے کنارے کی یاد ہمیشہ ان کے دل کو مسوستی رہی۔ چنانچہ انتقال سے قبل انھوں نے وصیت کی کہ مجھے گنگا کے کنارے دفن کیا جائے۔ یہاں انھوں نے اپنے محل کے ساتھ نہایت عمدہ باغ لگوایا تھا۔ ان کے بیٹے الہام اللہ خان نے اپنے باپ کی وصیت پر عمل کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ نواب رشید خان نے اپنی زندگی ہی میں اپنا مقبرہ بنوالیا تھا۔ یہ عمارت شاہجہان کے عہد میں بنی تھی، جب کہ مغلیہ فنِ تعمیر اپنے شباب پر تھا اور اس میں بڑی نفاست اور نزاکت آگئی تھی، لیکن نواب رشید خان کے افغان کیرکٹر کو دیکھتے ہوئے ان کے مقبرے کی تعمیر میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس سے بجائے نزاکت کے، قوت کا اظہار ہو جو مغلوں سے پہلے کے فنِ تعمیر کی خصوصیت تھی۔ یہ مقبرہ اب حکومتِ ہند کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔ نواب رشید خان کے ایما پر مئو رشید آباد میں بنگشوں کی آباد کاری ہوئی۔

اس علاقے میں افغانوں کی وسیع پیمانے پر تیسری آبادکاری محمد شاہ کے زمانے میں ہوئی۔ محمد خان بنگش نے اپنے بیٹے قایم خان کے نام پر قایم گنج آباد کیا۔ اس نئی بستی میں سرحد سے آفریدیوں کو بلا کر بسایا گیا۔ ہمارے مورثِ اعلا حسین خان جو مدھ آخون (بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے، اسی زمانے میں ہندستان آئے عمر بھر درس و تدریس ان کا مشغلہ رہا۔ انھوں نے خاصی طویل عمر پائی، کوئی سو کے لگ بھگ۔ وہ عالم کے ساتھ صوفی با صفا تھے؛ قایم گنج کے سینکڑوں پٹھانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کی عمر کے ساتھ ان کے حلقۂ ارادت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا مزار قایم گنج کے سب سے قدیم قبرستان تند و خان میں ہے۔ مدھ آخون کی اولاد گڑھی، سریاں اور شکل خیل میں خوب پھلی پھولی۔ انھیں محلّوں میں ہماری ددھیال کی عزیزداری تھی۔

حسین خان (مدھ آخون) کے بعد تین پشت تک سپہ گری کا پیشہ ذریعۂ معاش رہا۔ حسین خان کے بیٹے احمد حسین خان اور پوتے محمد حسین خان رجواڑوں کی فوج میں ملازم تھے۔ ہمارے دادا غلام حسین خان نے حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی۔ وہاں سے پنشن لی تو قایم گنج آ گئے اور کاشتکاری اور باغات لگانے میں وقت گذارنے لگے۔ وہ بڑی آن بان کے شخص تھے۔ اگرچہ خود دولتمند نہ تھے، لیکن دولت مندوں سے اپنی عزت کرانا جانتے تھے ان کا اپنے زمانے کے بڑے دلیر اور بہادر لوگوں میں شمار ہوتا تھا بڑے ذکی الحس اور غصہ ور تھے، لیکن غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ بردباری اور انکساری سے پیش آتے تھے۔ نہایت وجیہ اور باوقار تھے؛ قد اونچا، جسم بھاری اور گٹھا ہوا، رنگ سرخ و سپید، بھنویں اور ڈاڑھی گھنی۔ جس محفل میں بیٹھتے، حاضرین کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ انھیں درویشوں سے بڑی عقیدت تھی۔ اس زمانے میں قایم گنج میں ایک درویش تھے، کرم علی شاہ؛ وہ ان کی ناز برداری کرتے اور ان کی ہر خواہش کو پورا کرتے تھے۔

انھیں شیر کے شکار کا بھی شوق تھا۔ بندھیل کھنڈ میں ایک دفعہ ان کی شیر سے مڈبھیڑ ہو گئی، تو تلوار سے اس کے کئی ٹکڑے کر ڈالے۔ شیر نے انھیں زخمی کر دیا تھا جس سے کئی مہینے فریش رہے۔ جب ٹھیک ہو گئے تو پھر شکار کے

یے بند میں کھنڈ گئے۔ ان کی جلالی طبیعت خاص شان رکھتی تھی۔ اس کے برخلاف ہمارے نانا نبی داد خان طبیعت کے بہت نرم تھے۔ انھیں کبھی کسی نے غصے ہوتے نہیں دیکھا۔ ان کا مسلک صلح کل تھا۔ انھیں بھی فوج سے پنشن ملتی تھی۔

ہمارے والد فدا حسین خان قایم گنج کے تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں تلاش روزگار میں حیدر آباد چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر یہی بیس سال کی تھی۔ یہاں انھوں نے مراد آبادی برتنوں کی تجارت شروع کی۔ کچھ مدت بعد جب ان کے ایک مقامی وکیل صاحب سے ذاتی تعلقات بڑھے، تو ان کے یہاں سے قانون کی کتابیں لاکر پڑھنے لگے اور پھر بعض دوستوں کے مشورے پر وکالت کا امتحان دیا، تو اول درجے میں کامیاب ہو گئے۔ اب انھوں نے تجارت چھوڑ، وکالت کا پیشہ اختیار کیا، اور اورنگ آباد میں دفتر کھول لیا۔ خدا نے ان کے کام میں برکت دی۔ اورنگ آباد ہی میں انھوں نے آئینِ دکن نام کا قانونی رسالہ جاری کیا، جس میں حیدر آباد ہائی کورٹ کے نظائر شائع ہوتے تھے۔ آئینِ دکن عرصے تک ریاست حیدر آباد کے آئین و قوانین کا اہم ماخذ خیال کیا جاتا تھا اور وکالت پیشہ لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

"آئینِ دکن" کی اشاعت سے ان کی شہرت حیدر آباد تک پہنچ گئی اس پر ۱۸۹۲ء میں وہ حیدر آباد چلے آئے، یہاں انھوں نے بیگم بازار میں دفتر قایم کر لیا۔ چند سال میں ان کی وکالت کو ایسا فروغ حاصل ہوا کہ لوگ تعجب کرتے تھے۔ ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز ان کی محنت اور ان کی دیانت داری میں مضمر تھا۔ بیگم بازار میں انھوں نے زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر وہاں دو منزلہ مکان بنوایا۔ یہ نواب دولت خان کی حویلی کے متصل تھا۔ والد نے قانون پر بیس سے اوپر کتابیں تصنیف اور تالیف کیں جن میں شرح قانون فوجداری بہت مقبول ہوئی۔

والد کی وکالت حیدر آباد میں ایسی کامیاب رہی کہ عرصے تک لوگوں میں اس کا چرچا رہا۔ انھیں ہائی کورٹ کی جی کا عہدہ پیش کیا گیا تھا لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ وہ کوئی مقدمہ اس وقت تک نہیں لیتے تھے، جب تک انھیں اس کے حق بجانب ہونے کا یقین نہ ہو جاتا۔ انھوں نے اپنی سولہ

سترہ سال کی وکالت میں بہت کچھ کمایا۔ بیگم بازار کے دو منزلہ مکان کے علاوہ قایم گنج میں بھی ایک پختہ مکان تعمیر کروایا۔ وہ اتنا روپیہ چھوڑ گئے تھے کہ ہم تین بھائیوں نے اپنے خرچ پر یورپ میں اعلا تعلیم حاصل کی۔

سات بھائی

ہماری والدہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کاش میرے کوئی لڑکی ہوتی لیکن قضاو قدر نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ ان کے یہاں سات لڑکے پیدا ہوئے۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خان تھے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول میں داخل ہو گئے اور یہاں سے دسویں درجے تک تعلیم حاصل کر کے علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں داخلہ لے لیا، یہاں سے ایل ایل بی کے بعد حیدر آباد میں کچھ عرصہ وکالت کی۔ پھر محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ تین سال کے قریب وہاں کام کیا تھا کہ دق کے موذی مرض نے آن دبوچا جس سے وہ جان بر نہ ہو سکے۔ ہمارے منجھلے بھائی عابد حسین خان تھے۔ میں نے متعدد جاننے والوں سے ان کی غیر معمولی ذہانت کی تعریف سنی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جو ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے، کہا کرتے تھے کہ عابد حسین خان کی طرح کے ذہین لوگ شاذونادر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بھی دق کا شکار ہوئے۔

ہمارے تیسرے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خان ہیں جنھیں ان کے چھوٹے بھائی ذاکر میاں کہتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے فخر خاندان ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ماسٹر عبدالغنی جو ایک نومسلم انگریز تھے، ان کے پہلے استاد تھے اٹاوہ سے میٹرک کرنے کے بعد یہ بھی ۱۹۱۳ء میں ایم اے او کالج میں ایف ایس سی کلاس میں داخل ہوئے، اور اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے، لیکن صحت کی خرابی کے باعث پھر علی گڑھ آ گئے اور بی اے میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے آئے۔ یہ ان کی زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کی قابلیت اور ذہانت کا سکہ اپنے ہم عصروں میں بیٹھا ہوا تھا۔ علمی قابلیت کے علاوہ ان کی سیرت کی چمک دمک بھی انہوں

اور غیروں کے لیے جاذبِ نظر تھی۔ قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لینا تھے جن کی تیاری طالب علمی ہی کے زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ ایم اے او کالج کی یونین کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے جو کسی طالب علم کے لیے، سب سے بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔

ہمارے چوتھے بھائی زاہد حسین خان تھے۔ ان کے متعلق میں نے متعدد لوگوں سے سنا کہ وہ ہمارے دادا سے مشابہت رکھتے تھے۔ قدرت نے انھیں ہم سب میں سب سے زیادہ حسین، صحت مند اور قوی بنایا تھا۔ یونانی مجسموں کا سا کھڑا سیک نقشہ، گٹھا ہوا جسم، قد و قامت میں کڑیل جوان تھے۔ رنگ بھی ہم بھائیوں میں سب سے زیادہ اُجلا تھا۔ طبیعت میں تحکمانہ شان تھی۔ جو بات دل میں بیٹھ جائے، اسے پورا کر کے چھوڑیں، چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ذاکر میاں سے پونے دو سال چھوٹے اور مجھ سے تین سال بڑے تھے۔ کبھی کبھی ان کی ذاکر میاں سے اَن بَن ہو جاتی تھی جو اگرچہ عمر میں ان سے بڑے، لیکن جسمانی قوت میں کم تھے۔ ہر خاندان میں اوپر تلے کے بھائیوں میں اکثر چلتی رہتی ہے؛ اس کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی بڑا مسئلہ در پیش ہو۔ اکثر اوقات، مجھے یاد ہے، ذاکر میاں، زاہد میاں سے کتراتے تھے اور ان کے منہ نہیں لگتے تھے؛ البتہ حکمتِ عملی سے انھیں قابو میں رکھتے تھے۔ کبھی جب کھٹ پٹ ہو جاتی تو کئی کئی دن بات چیت تک بند رہتی، لیکن پھر خود ہی میل ملاپ ہو جاتا۔ ان دونوں کے جھگڑے ہمارے بڑے بھائی مظفر حسین خان طے کیا کرتے تھے۔ آج نصف صدی کے بعد جب میں ان بچکانی لڑائیوں اور ناچاقیوں کو یاد کرتا ہوں اور اپنے حافظے کو کھنگالتا ہوں تو مجھے اس میں عجیب و غریب بصیرتیں اور سبق پوشیدہ ملتے ہیں۔ مجھے اُس وقت بھی یقین تھا اور اب بھی ہے کہ اس اَن بَن میں زیادتی زاہد میاں کی طرف سے ہوتی تھی۔ ذاکر میاں کے مزاج میں، ان کے جسم کی طرح، نرمی اور ملائمت تھی۔ جسم سے زیادہ وہ دماغ سے کام لیتے اور حکمتِ عملی سے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ زاہد میاں کی زیادتیوں کو بڑے صبر اور تحمل سے برداشت کرتے تھے

انھیں بُردباری اور درگذر کی جو مشق بچپن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں ملی، آئندہ چل کر وہ ان کی سیرت کا جوہر بن کر نکھری اور اس سے انھوں نے ملک و ملّت کے بڑے بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کی طبیعت میں نرمی اور بُردباری کے علاوہ جو ننھیال کی دین ہے، جراُت اور حوصلہ مندی ددھیال سے ورثے میں ملی ہے، جس کی بدولت ارادے کی پختگی اور مقاصد کی والہانہ لگن ظہور میں آئی، جس کے بغیر عمل تاثیر سے محروم رہتا ہے یہ نہ ہو تو دل میں کچھ ہونے کی تمنا، قیادت کے عزائم اور حوصلہ مندیاں اپنا جوہر نہیں دکھا سکتیں۔ انھیں کے باعث انسان ایثار و قربانی کے لیے آمادہ ہوتا ہے

میں نے ددھیال اور ننھیال کے اثرات کا جو ذکر کیا تو اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زندگی میں جسمانی اور نفسی موروثی خصوصیات ہی سب کچھ ہیں۔ دراصل انسان کے حیاتیاتی امکانات اور ماحول کے اثرات محدود ہیں۔ اخلاقی عمل کی توجیہ، انسانی ارادے کی کارفرمائی کے بغیر ممکن نہیں یہ درست ہے کہ ہر انسان کی اندرونی فطرت اس کے عمل کا دائرہ معیّن کر دیتی ہے، جس کے اندر ہی اسے رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی نیت اور ارادہ اس کا کیرکٹر بنانے میں ممد و معاون ہوتے ہیں کیرکٹر ہمارے ارادے کی عادتوں سے عبارت ہے جس کے تحت ہم اپنی خواہشوں اور اپنے عمل کو شعوری طرح سے منظم کرتے ہیں۔ ددھیال اور ننھیال کے جسمانی اور نفسی ورثے کے علاوہ ذاکر میاں کی زندگی کی تشکیل میں ان کی نیت اور ان کی نیکی کا بڑا دخل ہے۔ ان کی سیرت کا جوہر بڑی ریاضت کے بعد چمکا ہے، جس کی تہہ میں زبردست قوّتِ ارادی کارفرما رہی ہے۔ انسانی کیرکٹر میں ظرف اور ضبط بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد پیدا ہوتا ہے! اور اس کے بغیر انفرادی زندگی دوسروں کے لیے مفید اور موثر نہیں بن سکتی۔

زاہد میاں کے قوی اور صحت مند جسم میں بھی دق کے جراثیم نے راہ پالی اور انہیں نحیف و زار کر دیا۔ وہ ایم اے او کالج میں ایف اے میں پڑھتے تھے جب ان پر اس نابکار مرض کا حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر

اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔

بھائیوں میں مَیں پانچواں ہوں۔ میں ۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں بیگم بازار والے مکان میں پیدا ہوا۔ میری بسم اللہ کے کچھ دنوں بعد ہم سب والد کی علالت کی وجہ سے قایم گنج چلے آئے۔ مجھ سے چھوٹے بھائی جعفر حسین خان تھے، جن کا بچپن ہی میں چھ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

ہمارے سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خان ہیں۔ ان کی پیدائش والد کے انتقال کے تین ماہ بعد قایم گنج میں ہوئی۔ قایم گنج میں ہمارے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خان اور یہ محمود حسین خان پیدا ہوئے؛ باقی ہم سب نے حیدرآباد میں جنم لیا۔ ۱۹۱۱ء میں والدہ کے انتقال کے بعد محمود میاں کی پرورش چچی صاحبہ نے کی۔ وہ میرے ہی ساتھ اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول، گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ دلّی میں رہے۔ ۱۹۲۸ء میں جرمنی چلے گئے اور ہائیڈل برگ سے انھوں نے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ واپسی پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ان کا پہلا تقرر ہوا۔ بعد کو وہ عرصے تک اسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آج کل کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے اسی اثنا میں کراچی سے دس میل دور جامعہ قایم کی ہے، جہاں اعلا تعلیم کا انتظام ہے۔ یہاں کا نصابِ تعلیم وہی ہے جو کراچی یونیورسٹی کا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں انھوں نے اپنی جامعہ کے لیے اسقدر شاندار اور وسیع عمارتیں کیسے بنوالیں، جنھیں دیکھے بغیر اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اتنا بڑا کام تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ یہ ان کی نیک نیتی، ارادے کی مضبوطی، اور حوصلہ مندی کا نتیجہ ہے۔

ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں

ہندوستان میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں مسز اینی بسنت کی ہوم رول کی تحریک نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں آزادی کی خواہش پیدا کر دی تھی، لیکن عوام ابھی بے حس و حرکت تھے۔ انگریزی حکومت کی بوکھلاہٹ نے ہندوستان کی سیاست میں وہ کام کر دیا جو معمولی حالات میں شاید صدیوں

میں نہ ہوتا۔ جلیان والا باغ کے قتلِ عام نے پورے ملک میں آزادی کا صُور پھونک دیا۔ بجھے ہوئے دلوں میں آزادی کی امنگ نے جنم لیا۔ جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک کیا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی سامراج کے خلاف نفرت کا جذبہ اُبھر آیا اور خلافت کی تحریک نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلمانوں کو جھنجوڑ کر غفلت کی نیند سے بیدار کر دیا۔ اس تحریک کے روحِ رواں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی اس تحریک کے لیڈروں میں تھے۔ مہاتما گاندھی نے ترکِ موالات کی آواز بلند کی، ۔۔۔تو خلافت تحریک کے سب حامی ان کے یار و مددگار بن گئے۔ اس تحریک کا ایک جزیہ تھا کہ طلبہ اسکول اور کالج چھوڑ کر آزادی حاصل کرنے کے لیے قومی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیں۔ مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈروں نے ترک موالات کا یہ پیغام اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے طلبہ کو پہنچایا۔ اس زمانے میں ایم اے او کالج علی گڑھ کی باگ ڈور ڈاکٹر ضیاءالدین کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے طلبا کے قائدوں کو ملانے کی پوری کوشش کی، تاکہ وہ ترکِ موالات کے اثر سے محفوظ رہیں۔ ڈاکٹر ضیاءالدین نے ذاکر میاں کو ولایت کے لیے اسکالرشپ کا لالچ دیا۔ یوپی کے صدر بورڈ آف ریونیو مسٹر فری منٹل نے سرکاری ملازمت کا سبز باغ دکھایا۔ لیکن جب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ انھیں اس تحریک میں ملک و قوم کی خاطر حصّہ لینا ہے، تو پھر کسی کی کوئی تدبیر ان کی رائے کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ذاکر میاں ان طلبہ کے قائد تھے، جو مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اولڈ بوائز لاج سے پولیس کی مدد سے نکلوائے گئے تھے۔ ان طلبہ کو اصرار تھا کہ انھیں آزاد فضا میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ چنانچہ قوم کے سربرآوردہ اصحاب نے فیصلہ کیا کہ ایک قومی تعلیمی ادارہ قایم کیا جائے جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) ہوگا۔ نیشنل اس اعتبار سے کہ اس کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں گڑی ہوں گی اور مسلم اس لحاظ سے کہ وہ اسلامی تعلیم و تمدن سے اپنی قوت اور تازگی حاصل کرے گا۔

جامعہ ملّیہ کا قیام

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ایم اے او کالج کی جامع مسجد میں ہوا۔ مولانا محمود الحسن کے متبرک ہاتھوں سے اس کی تاسیس کی رسم ادا ہوئی۔ چونکہ مولانا محمود الحسن خود علالت کی وجہ سے ان دنوں بہت کمزور اور ناتواں تھے۔ اس لیے ان کا خطبہ ان کے شاگردِ رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا تھا۔

مولانا محمد علی اور جامعہ

جامعہ کی ابتدا شدید دینی جذبے کے سایے میں ہوئی۔ ایم اے او کالج کے آسایش اور آرایش والے کمرے چھوڑ کر نوجوانوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ایک دو دن نہیں مہینوں کاٹ دیے۔ علی گڑھ کے طلبا کو اپنی مادرِ علمی سے محبت نہیں، عشق تھا۔ یہاں کے در و دیوار کو دیکھ دیکھ کر جس کی ایک ایک اینٹ میں ماضی کی داستانیں اور حوصلہ مندیاں خوابیدہ تھیں ان کے ذہن و تخیل کی پرورش ہوتی تھی۔ جب یہ در و دیوار روح کے لیے قیدخانہ بننے لگے تو خود علی گڑھ کے فرزندوں نے انھیں ڈھا دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے دلوں کی بستی آباد کرنے کے لیے اسے ویران کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ کرشن آشرم کے صحن میں خیموں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ مولانا محمد علی نے جو جامعہ کے پہلے پرنسپل تھے، انھیں خیموں میں اپنے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان درسوں کا موضوع تھا، "اسلام اور اسلامی زندگی"۔ جب بولتے تو فصاحت و بلاغت کا دریا بہا دیتے۔ گھنٹہ، دو گھنٹے، چار چار گھنٹے متواتر تقریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ سننے والے ہیں کہ کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے سننے سے سیری ہوتی ہی نہیں۔ صبح ناشتے کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہوتا تو ڈیڑھ دو بج جاتے۔ لیکچر دینے والے اور لیکچر سننے والے ایسا لگتا جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوں۔ یہ دنیا بلند مقاصد کی دنیا تھی۔ مولانا محمد علی درس کے دوران میں اقبال کی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے اشعار کی توضیح کرتے۔ لڑکے نوٹ لکھ رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا نے جو فرمایا ہے اس میں سے کچھ رہ جائے

لفظ بہ لفظ نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ درس کے بعد آپس میں مقابلہ کرکے اپنے اپنے نوٹ مکمل کر لیتے۔ بعض طلبا زود نویس تھے، ان کی تحریروں کی بڑی مانگ رہتی تھی۔ ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ مولانا کی تقریر میں سے ایک حرف بھی نہ چھوٹنے پائے۔

مولانا محمد علی کا بولتے بولتے گلا پڑ جاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ ان کے دینی جذبے کا اخلاص غیر مشتبہ تھا، اس لیے ان کی ہر بات دل پر اثر کرتی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت سے ہر نوجوان میں ایک نیا عزم، نیا ولولہ اور نیا دینی احساس پیدا ہو گیا۔ ان کی اندرونی زندگی میں اخلاقی نشوونما کی ایک خاص لگن پیدا ہو گئی، جس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ مولانا کے درسوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے، جیسے کوئی مدتوں سے بھولی ہوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہو۔ صبح، فجر کی نماز کے بعد، پابندی سے قرآن کی تلاوت ہوتی۔ ترجمے اور تفسیریں پڑھی جاتیں۔ نماز اور روزے خوشدلی سے کیے جاتی، نہ کہ جبر ملنے کے ڈر سے۔ ان سب باتوں میں چاہے کسی کو لوما بنیت نظر آئے، لیکن ان کا اخلاص غیر مشتبہ ہے، جس سے نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس دینی جذبے کا مقصد نمائش نہیں تھا بلکہ اپنی ذات کی اصلاح، اسلامی تعلیم کے ذریعے سے۔ بعض نوجوان جو ایم۔ اے۔ او کالج میں چرغم کے اصول کو ماننے والے کھلنڈرے مشہور تھے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھتے اور مسجدوں میں گڑگڑاتے۔ یہ منظر مسلمان نوجوانوں کی اجتماعی زندگی میں بھلا کا ہے کو پھر کبھی دیکھنے میں آئے گا؛

حکیم اجمل خان اور جامعہ

جامعہ کے نصب العین میں ایسی جاذبیت تھی کہ مولانا محمد علی کے علاوہ ملت کے دوسرے زعمانے بھی اس ادارے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حکیم اجمل خان جامعہ کے پہلے امیر مقرر ہوئے، مزاج کے لحاظ سے وہ مولانا محمد علی کی ضد تھے: خاموش، متوازن، نہایت سنجیدہ اور متین۔ ان کی ہر بات نپی تلی ہوتی تھی۔ فاونڈیشن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے جامعہ کے اخراجات کی

تکمیل ان کے ذمے تھی۔

حکیم صاحب کے ذاتی تعلقات اس قدر وسیع تھے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے جامعہ کے لیے روپیہ لے آتے تھے۔ جامعہ والوں کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں سے لاتے ہیں۔ شروع شروع میں جامعہ کے اخراجات کی کفالت مرکزی خلافت کمیٹی کرتی رہی، لیکن جلد ہی وہ اس بار سے سبکدوش ہو گئی۔ اس کے بعد مدتوں حکیم صاحب کا دستِ غیب جامعہ والوں کی دست گیری کرتا رہا۔

عبدالمجید خواجہ کی پرنسپلی

کراچی کے مقدمے کے بعد مولانا محمد علی جیل بھیج دیے گئے اور اب ان کی جگہ عبدالمجید خواجہ جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ انھوں نے جامعہ کی سیاسی فضا کو تعلیمی فضا میں تبدیل کرنے کا اہم فریضہ ادا کیا، جس کے لیے جامعہ کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ بڑے دریا دل اور سیر چشم آدمی تھے، قومی کاموں میں بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ جامعہ پر ان کا سب سے بڑا یہ احسان ہے کہ ذاکر میاں کے ۱۹۲۲ء میں جرمنی چلے جانے کے بعد، انھوں نے ان کی واپسی تک جو ۱۹۲۶ء میں ہوئی، جامعہ کو سنبھالے رکھا۔ ان کے زمانے میں جامعہ واقعی ایک تعلیمی ادارہ بن گئی جو بعض لیڈروں کو پسند نہ تھا۔

برلن میں ذاکر میاں کا قیام

ذاکر میاں کا جرمنی میں قیام تقریباً ساڑھے تین سال رہا۔ اگرچہ انکا خاص مضمون معاشیات تھا، لیکن فلسفۂ تعلیم سے انھیں ہمیشہ سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ جرمنی میں اس موضوع کے بڑے ماہر موجود تھے۔ ان کی صحبت میں انھیں اپنی علمی پیاس بجھانے کا موقع ملا۔ جس کے باعث ان کی شخصیت کا خاص رنگ نکھرا اور اس کے اظہار کی نت نئی شکلیں آیندہ پیدا ہوئیں۔ جرمنی کے جن پروفیسروں سے انھوں نے خصوصی علمی استفادہ کیا، ان میں زومبارٹ، زہرنگ، اسپرانگر، کوئلر، پروفیسر مٹوخ اور رکرشن اشٹائنو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا۔ ذاکر میاں

نے برلن یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔
جرمنی میں ذاکر میاں کے قیام کے زمانے میں بعض ہندستانی انقلاب پسند بھی وہاں مقیم تھے۔ قدرتاً ان سے ان کے ذاتی تعلقات پیدا ہو گئے۔ ان میں سے آچاریہ، دت اور چٹو پادھیائے کا انھوں نے کبھی کبھی ذکر کیا ہے۔ چٹوپادھیائے، مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی سامراجیت کے خلاف اور محکوم قوموں کی حمایت میں صرف کی۔ وہ مستقل طور پر برلن میں رہتے تھے۔ ویسے اکثر یورپ کے دوسرے ملکوں میں گھومتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ فرانس آئے تو میں شاہد سہروردی کے ساتھ ان سے ملا تھا۔ ان کی بیوی اگنس اسمیڈلے ایک امریکی خاتون تھیں، جن کے خیالات اپنے شوہر کی طرح انقلاب پسند تھے۔ وہ چٹوپادھیائے کے انتقال کے بعد چین چلی گئی تھیں، جہاں انھوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ اب معلوم ہوا ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

ذاکر میاں برلن میں ہندستانی طلبہ کی انجمن کے صدر تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان کی تقریریں جو انھوں نے جرمن زبان میں کی تھیں، بیحد پسند کی گئیں۔ ہمبرگ اور بریسن میں انھوں نے "انجمنِ خواتین برائے امن و آزادی" کے زیرِ اہتمام جو تقریریں گاندھی جی سے متعلق کی تھیں، انھیں گاندھی جی کے مضامین کے جرمن ترجمے میں دیباچے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

اس زمانے میں برلن میں فارسی زبان کی کتابوں کی طباعت کے لیے ایک مطبع تقی زادہ نے قایم کیا تھا، جس کا نام کاویانی پریس تھا۔ مطبع کے منیجر غنی زادہ سے ذاکر میاں کے دوستانہ مراسم تھے۔ ذاکر میاں نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کمپوزنگ کا کام سیکھنا چاہتا ہوں۔ غنی زادہ نے کہا، بہت اچھا پریس حاضر ہے۔ چنانچہ یہ کمپوزنگ سیکھنے کے لیے کاویانی پریس جانے لگے۔ جب کافی مہارت ہو گئی، تو اپنے ہاتھ سے دیوان غالب کمپوز کر کے وہیں سے شائع کیا اور اس کے پورے اخراجات اپنی جیب سے برداشت کیے۔ یہ دیوان چھوٹے سائز پر ہے۔ کاغذ نہایت اعلا درجے کا لگایا گیا ہے۔ بیل دار جدول اور

دو رنگی چھپائی نے اسے نہایت دیدہ زیب بنا دیا ہے، ایسا کہ اس شان کا دیوانِ غالبؔ اس سے پہلے کہیں نہیں چھپا تھا۔ اس کی جلد بھی نہایت خوبصورت اور پاکیزہ ہے اس پر لکھاوٹ اور رنگوں کی ہم آہنگی اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ جلد میں ایسی نرمی ہے کہ چھوؤ تو ایسا محسوس ہو جیسے اس کے اندر نرم اور نازک ننھے ننھے پتلے پتلے گدوں کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ غالب کی جو تصویر دی گئی ہے، یہ لائپزگ کے ایک مشہور مصوّر نے بنائی تھی۔ اردوے معلیٰ..... اور یادگارِ غالب میں غالب کے چہرہ بشرے سے متعلق جو معلومات ملتی ہیں، ذاکر میاں نے یہ اس جرمن مصوّر کے اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دی تھیں۔ اس نے ان کی بنا پر غالب کی شخصیت کا جو تصور قائم کیا، اسے اپنی تصویر میں خطوط اور رنگوں کے لطیف امتزاج سے پیش کر دیا۔ اسے یقیناً مصور کا کمال کہنا چاہیے کہ اس نے غالبؔ کی شخصیت کے جوہر کو صحیح طور پر سمجھا اور اپنے موقلم سے اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔ اب غالبؔ کی یہی خیالی تصویر اپنے فنی کمال کے باعث اصلی خیال کی جاتی ہے۔ خدا معلوم، جسے اصلی تصویر کہتے ہیں وہ بھی اصلی ہے کہ نہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے تیار کرنے میں بھی کسی باکمال مصوّر کے تخیّل اور چابکدستی کو دخل ہو۔

جب کاویانی پریس کا مطبوعہ دیوان غالب ہندستان پہنچا تو اصحابِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت جلد یہ ایڈیشن ختم ہو گیا اور چونکہ مانگ ہنوز موجود تھی، مکتبۂ جامعہ کو برلن سے دوسرا ایڈیشن منگانا پڑا۔ حکیم اجمل خاں نے اسے دیکھا تو اتنا پسند کیا کہ انھوں نے اپنے کلام کا مجموعہ دیوان شیدا بھی اسی کاویانی پریس میں طبع کروایا۔ یہ بھی اسی دیوان غالب کے سائز پر ہے اور اسی کی طرح دیدہ زیب بھی۔

جرمنی سے واپسی

فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپسی پر ذاکر میاں جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ حکیم صاحب پہلے سے امیرِ جامعہ تھے۔ اب ذاکر میاں کو حکیم صاحب کے ساتھ کام کرنے اور انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

انجمن تعلیم ملّی

۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کے انتقال پر ڈاکٹر مختار احمد انصاری امیرِ جامعہ ہوئے۔ وہ شروع ہی سے جامعہ کے ساتھ وابستہ رہے تھے اور اس ادارے کے دلی خیر خواہوں میں تھے۔ اس زمانے میں جامعہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی۔ سیاسی تحریک کے دب جانے کی وجہ سے جامعہ کو روپیہ ملنا بند ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استادوں کو کئی کئی مہینے تک تنخواہیں نہ دی جا سکیں۔ غرض سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ قرض لے کر کب تک کام چلتا۔ اب ذاکر میاں نے امنائے جامعہ کو لکھا کہ اگر جامعہ کو قایم رکھنا ہے، تو اس کے چلانے کا انتظام کیا جائے؛ اور اگر اسے بند کرنے کا قصد ہے، تو اس فیصلے سے بھی مطلع کیا جائے۔ اس خط کا جواب یہ ملا کہ مناسب ہوگا اگر جامعہ بند کر دی جائے، اس لیے کہ روپیہ جمع کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس پر ذاکر میاں نے اپنے ساتھیوں کو لکھا کہ کیا وہ اس کے لیے آمادہ ہیں کہ جامعہ کے کسی حصّے کو بچائیں اور اسے بند نہ ہونے دیں۔ سبھوں نے یہ جواب دیا کہ روپیہ نہ ہو، تو نہ ہو، ہم بلا معاوضہ کام کریں گے۔

اب جامعہ کو چلانے کی غرض سے "انجمنِ تعلیمِ ملّی" کا قیام عمل میں آیا، جس میں بعض امنا کے علاوہ گیارہ استادوں نے بھی حیاتی رکن بننا قبول کیا۔ رکنیت کی شرط یہ تھی کہ وہ بیس سال اور اگر زندگی اس سے قبل ختم ہو گئی تو آخری وقت تک جامعہ کی خدمت کا عہد کرتے ہیں اور کبھی ایک سو پچاس روپیہ سے زیادہ معاوضہ طلب نہیں کریں گے۔ بعد میں اس انجمن میں ۴۲ ارکان ہو گئے۔ اس تعلیمی انجمن کا قیام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جو لوگ اس انجمن کے رکن بنے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ زمانے کے تیور بگڑے ہوئے ہیں، حالات ناموافق ہیں، سیاسی ردِعمل اور بد دلی سے جذبات سرد پڑ چکے ہیں، ہمتیں پست ہیں اور امنگوں کا ابھار ختم ہو چکا ہے؛ لیکن آفریں ہے جامعہ کے ان مخلص کارکنوں پر! انھوں نے انجمنِ تعلیمِ ملّی کی رکنیت قبول کی، اور اپنے دلوں کو عزائم اور حوصلوں سے آباد رکھا اور آیندہ اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ اگر نیّت بخیر ہو اور کسی حالت میں بھی خلوص اور جذبۂ خدمت کا دامن ہاتھ سے

نہ چھوٹے، تو خدا ضرور مدد کرتا ہے۔

حلقۂ ہمدردانِ جامعہ

اب انجمنِ تعلیمِ ملی کے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا کہ جامعہ کی مالی حالت کو کس طرح سے سدھارا جائے اور اس کے مستقل اخراجات کی کفالت کی کیا سبیل ہو۔ بالآخر غور و فکر کے بعد یہ بنیادی فیصلہ کیا گیا کہ جامعہ کا مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے، اس لیے اسے امداد کے لیے بھی عوام ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ امیروں میں جو اعانت پر آمادہ ہوں، ان کے عطیات خوشی اور تشکر کے ساتھ قبول کیے جائیں۔ لیکن جامعہ کی آمدنی کا اصلی ذریعہ عوام النّاس ہونے چاہییں جن کی خاطر یہ سارے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ یہ بنیادی اصول طے ہو جانے کے بعد ۱۹۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ قایم ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ جامعہ کو چلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے قلیل مقدار میں امداد لی جائے جو ان پر گراں نہ گزرے۔ حافظ فیاض احمد، خواجہ عبدالحی اور شفیق الرحمٰن قدوائی نے اس حلقے کا انتظام سنبھالا اور اسے وسعت دینے کے لیے اپنی مساعی صرف کیں۔ ان کی نیک نیتی اور مستعدی کے سبب سے ہمدردانِ جامعہ کا کام خوب چل نکلا اور خدا نے اس میں بڑی برکت دی۔ ملک میں دس ہزار سے زیادہ اشخاص نے اس حلقے کی رکنیت قبول کی، جن میں اکثر و بیشتر چھوٹی چھوٹی رقمیں چندے میں دیتے تھے۔ شروع میں سب ملا کر پانچ چھ ہزار روپے ہوئے تھے لیکن بعد میں سالانہ پچاس ساٹھ ہزار روپے تک جمع ہو جاتے تھے۔ اس طرح جامعہ کا مسلم عوام سے گہرا رابطہ قایم ہو گیا۔ جب جامعہ کے کام میں ترقی ہوئی تو حیدرآباد، کشمیر، بھوپال، اور رام پور سے بھی امداد منظور ہو گئی۔ جامعہ نگر میں جہاں چند سال پہلے ہُو کا عالم تھا، اب وہاں عمارتیں بننا شروع ہو گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے اس لق و دق میدان میں کوئی منتر پھونک دیا ہے جس سے عمارتیں زمین سے خود بخود اُگ آئی ہیں اور بستی بسنے لگی ہے۔ بستی بسنا کبھی سہل نہیں ہوتا، یہ بستے بستے بستی ہے، اور اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں اور کھکھیڑیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ جامعہ کے کام میں خدا نے جو برکت دی

اسے نیکی کا کرشمہ اور اچھی نیت کا پھل کہنا چاہیئے۔ آج ان عمارتوں کی قیمت پچاس ساٹھ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ کہاں وہ زمانہ کہ نامساعد حالات سے بددل ہوکر اُمناے جامعہ اسے بند کرنے کی فکر میں تھے، اور کہاں یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کہ اسے دیکھ کر حاسد اور مخالف، اپنے اور بیگانے، سب اچنبھے میں پڑ گئے اور تھڑدلوں کے حوصلے بلند ہونے لگے۔

تعلیمِ بالغان

تعلیمِ بالغان کی طرف بھی جامعہ والوں نے خاص توجہ دی۔ یہ ہمارے ملک کی تعلیمی ترقی کے لیے بڑا اہم مسئلہ تھا، جسے اربابِ جامعہ نے عملی طور پر حل کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ اسے محض تقریروں اور مضمونوں کے ذریعے سے حل کرنا ممکن نہیں تھا؛ اس کے لیے عمل کے میدان میں اترنا ضروری تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ادارۂ تعلیم و ترقی قایم ہوا جس کے روحِ رواں شفیق الرحمن قدوائی تھے۔ پہلی ضرورت یہ تھی کہ بالغوں کی تعلیم کے لیے لٹریچر فراہم کیا جائے۔ جو رسائل لکھے جائیں ان میں جامعہ کے بنیادی مقاصد کو نمایاں کیا جائے یعنی جنھیں تعلیم دی جائے ان میں سماجی صلاحیتوں کو ابھارا جائے تاکہ وہ مل جل کر کام کر سکیں۔ ان میں اپنی ذات پر بھروسہ اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ خدا کے نیک بندے، اپنے دیس کے سچّے خادم اور سارے انسانوں کی بھلائی چاہنے والے بن جائیں۔ اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں۔ محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور محبت سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کی کوشش کریں۔ ادارہ تعلیم ترقی نے دو سو رسالے شائع کیے جنھیں ملک میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس ادارے کے قیام سے عوام نے پورا فائدہ اٹھایا جن کے ساتھ جامعہ کا گہرا تعلق قایم ہو گیا۔

اوکھلے کی نئی بستی

کالج اور اسکول کی عمارتوں کے علاوہ استادوں کے مدرسے کی عمارت بھی نہایت شاندار بن گئی جس کا نقشہ مسٹر ہائنس نے بنایا جو جرمنی کے

رہنے والے ہیں اور جامعہ والوں سے بہت قریبی ربط رکھتے ہیں۔ یہاں بنیادی تعلیم دینے والے استادوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ ہے۔ یہاں مختلف ریاستوں کی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں سے چنے ہوئے استاد تعلیم کے لیے بھیجتی ہیں۔ چونکہ بنیادی (بیسک) تعلیم سے ذاکر میاں کا شروع سے تعلق رہا ہے۔ اس لیے یہ مناسب تھا کہ اس نئے تعلیمی تجربے کے متعلق استادوں کی تعلیم کا انتظام جامعہ میں کیا جائے۔ یہ ضرورت اس مدرسے سے پوری ہوگئی اور ملک کے ہر حصّے سے استاد ٹریننگ کے لیے یہاں آنے لگے۔

بیسک ایجوکیشن

۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے ذاکر میاں کو بیسک (بنیادی) تعلیم کی نیشنل کمیٹی کا صدر بنایا۔ گاندھی جی کا بیسک تعلیم کا جو تصوّر تھا، اس میں بچوں کی تعلیم خود مکتفی ہونی چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ چرخے اور تکلی کے ذریعے سے بچے کو سب مضمون پڑھائے جا سکتے ہیں۔ جب یہ اسکیم ذاکر میاں کے سپرد کی گئی تو انھوں نے اسے خالص تعلیمی رنگ دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے جو اسکیم مرتب کی اس میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ بچّے جو ہاتھ سے کام کریں وہ تخلیقی ہو۔ اس کے لیے یہ لازمی نہیں کہ وہ معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہو۔ ملک کے مختلف حصّوں میں جو صنعت و حرفت ہیں انھیں کے توسط سے طلبہ کے لیے کام کے مواقع نکالنے چاہییں۔ جن علاقوں میں کپاس کثرت سے ہوتی ہے، وہاں چرخا اور تکلی تعلیمی اغراض کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں؛ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہو یہ بھی ضروری نہیں کہ بچوں کا کام خود مکتفی ہو۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو اندیشہ ہے کہ تعلیم کا معیار گر جائے گا۔

بنیادی تعلیم کی قومی کمیٹی کی صدارت قبول کرنے سے دس سال پہلے سے ذاکر میاں جامعہ کے ابتدائی اسکول میں مقصدی طریقِ تعلیم (پروجکٹ میتھڈ) کا تجربہ کر رہے تھے اور اس کے خاطر خواہ نتائج نکل رہے تھے۔ اس طریقے میں مختلف منصوبوں کے ذریعے سے بچّوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں کتاب کے بجائے کسی کام کو مقصد یا منصوبہ قرار دے کر علم حاصل کرنے کے

وسائل مہیا کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں بچوں کے کام سے، جو مقصود بالذات ہوتا ہے، کسی آمدنی کی توقع نہیں کی جاتی۔ گاندھی جی کی اسکیم میں بچوں کی تعلیم کو خود مکتفی بنانے کا خیال پیش کیا گیا تھا۔ اور ان کے پیروؤں نے جو ہر بات پر آنکھ بند کر کے آمنّا و صدقنا کہنے کے عادی تھے، یہ نہیں سوچا کہ اگر ایسا کیا گیا تو تعلیمی لحاظ سے یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہو جائے گی۔ ذاکر میاں نے واردھا کے جلسے میں اس موضوع پر جو تقریر کی، اس میں یہ بات واضح کر دی کہ اس اسکیم کو معاشی لحاظ سے نہیں بلکہ خالص تعلیمی لحاظ سے چلانا چاہیے۔ اس طرح وہ مقصدی طریقِ تعلیم (پروجکٹ میتھڈ) کی ایک شکل ہو جائے گی اور اس میں ہاتھ کے کام کو جو اہمیت دی جائے گی وہ جدید نظریۂ تعلیم کے عین مطابق ہو گی۔ اس طرح وہ سب ماہرینِ تعلیم جو کام یا دستکاری کو بچوں کی تعلیم میں خاص اہمیت دیتے تھے، اس کے حامی بن جائیں گے۔ گاندھی جی نے یہ بڑی دانشمندی کی کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کا کام بنیادی تعلیم کی قومی کمیٹی کے ذمے کر دیا۔ اس کمیٹی نے دوسروں کی رہنمائی کے لیے ڈھائی سو صفحوں کی ایک رپورٹ مرتب کی جس میں اس کے متعلق تمام امور پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ مثلاً بنیادی تعلیم کے اصول، اس کے مقاصد، استادوں کی تعلیم، نگرانی اور امتحان کے طریقے، نصابِ تعلیم اور مقامی حالات کے مطابق دستکاری کو چننا جس کے ذریعے سے بچے کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس اسکیم میں سفارش کی گئی کہ سب بچوں کے لیے تعلیم لازمی اور مفت ہونی چاہیئے۔ تعلیم کا ذریعہ ہر بچے کی مادری زبان ہو گی علم حاصل کرنے کا ذریعہ دستکاری یا چرخے کو قرار دیا جائے گا جو ملک کے مختلف حصوں کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ ہوں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایک ہی طرح کا کام سکھایا جائے۔ یوں خالص تعلیمی مقاصد کی شمولیت سے یہ اسکیم جدید تعلیمی نظریات سے ہم آہنگ ہو گئی۔

موجودہ زمانے کے یورپی اور امریکی ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ کام یا (اکٹی وٹی)، کا طریقِ تعلیم میں خاص مقام ہے۔ اسے نظرانداز کر کے جو کتابی تعلیم دی جاتی ہے وہ مصنوعی اور غیر حقیقی ہو جاتی ہے۔ ذاکر میاں

نے بھی اس مسئلے پر بہت غور و فکر کیا ہے اور اپنے خطبات میں کئی جگہ اس کی نسبت اپنے خیالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

قومیت اور اسلامیت

قومی تہذیب کے لحاظ سے یہ بحث بڑی اہم ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم میں ان کے مخصوص تمدّنی مظاہر کا تحفظ کس حد تک ضروری ہے اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں جو مذہبی اور لسانیاتی اقلیتیں ہیں ان کی حیثیت قومی نظامِ تعلیم میں کیا ہو۔ اس خصوص میں ذاکر میاں نے اپنے کاشی ودیاپیٹھ والے خطبے میں بعض بنیادی امور کی جانب اشارے کیے ہیں جن کا اطلاق آج بھی اس طرح ہوتا ہے جیسا کہ کچھ سال پہلے ہوتا تھا۔ اس خطبے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیبی ہستی قابلِ قدر ہے جس کا مٹنا پوری ہندوستانی قوم کے لیے زبردست نقصان ہوگا ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس خطبے میں ذاکر میاں کے اس اصول کا پرتو صاف نظر آتا ہے کہ قومیت اور اسلامیت ایک دوسرے کی ضد اور نقیض نہیں ہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہمارے قومی زندگی کا یہ تقاضا ہے کہ ان موانع کو دور کیا جائے جو اس مقصد کے حصول میں سنگِ گراں بنے ہوئے ہیں۔

جامعہ ملّیہ کے مقاصد کے متعلق بھی ذاکر میاں نے اپنے خیالات کے ظاہر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلامیت اور قومیت ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں۔ جامعہ کا تعلیمی مشن یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے اندر سموئے

ان کے نزدیک جامعہ ملّیہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا نقشہ یعنی ان کے مذہب (اسلام) اور ہندوستانی تہذیب میں ان کے مقام کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔" وہ چاہتے ہیں کہ علم محض روزی کی خاطر نہیں بلکہ زندگی کی خاطر سیکھا جائے تاکہ اس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجائے۔ جامعہ ملّیہ

اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ وہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔

ذاکر میاں نے مختلف موقعوں پر جو خطبات دیے ہیں ان سے ان کے فلسفۂ تعلیم کے علاوہ ان کی اسلامیت اور قومیت، دینداری اور وطن پرستی کا تصور واضح ہوتا ہے۔ یہ سب ہماری تہذیبی زندگی کے بڑے اہم مسائل ہیں جن پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ انشاپرداز کی حیثیت سے ذاکر میاں کے اسلوب کی تازگی اور قوت، برجستگی اور متانت اور جوش بیان؛ کلام کی تاثیر کی ضمانت ہیں صفحے کے صفحے پڑھ جائیے، زبان و بیان میں تصنع کہیں نام کو نہیں۔ آمد ہی آمد ہے، آورد کا کہیں پتا نہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ان کی پاکیزہ اور نکھری ہوئی شخصیت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ یہ شخصیت ہے کس کی؟ ایک نیک دل اور نیک نیت انسان کی جو بیک وقت دیندار اور وطن دوست ہے، خوش معاملہ ہے، راستباز ہے۔ جس کی دیانت اور صداقت پر آج تک کسی نے انگشت نمائی نہیں کی۔ خدا نے دل اور دماغ دونوں کے اعلا اوصاف سے نوازا ہے۔ یہ اوصاف فطری بھی ہیں اور اکتسابی بھی۔ وہ بڑے ہی عالی ظرف؛ بڑے مآل اندیش، بڑے منکسر المزاج اور متواضع، بڑے متحمل اور صابر ہیں۔ مزاج میں چشم پوشی، درگزر اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ہر معاملے میں قطعی رائے رکھتے ہوئے اس کے اظہار میں اس کا خیال رہتا ہے کہ کسی کے دل کو چوٹ نہ لگے، نہ کسی کی ذلت و توہین ہو۔ اگر کسی کی رائے سے اختلاف ہے تو اس کی تالیفِ قلب کا سلسلہ برابر برابر جاری رہتا ہے کہ سننے والے کو ناگواری کم سے کم ہو۔ حق گوئی کی جرأت اور انکسار پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔

اعلا سیرت

آئیے، ذرا دیکھیں کہ اعلا انسانوں میں کون سی ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کے باعث ہم ان کی عظمت کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سب سے

اول تو یہ کہ ان کے دل انسانی ہمدردی سے معمور ہوتے ہیں۔ انسانیت دنیا کے کسی کونے میں دکھی ہو ان کے دل میں ٹیس ہوتی ہے۔ اس میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دکھی کا مذہب، یا اس کی قومیت کیا ہے اور اس کا کس نسل سے تعلق ہے یہ دلسوزی کی صفت قدرِ مشترک ہے جو دنیا کے سب اعلا پائے کے انسانوں میں ملتی ہے۔ یہ دلسوزی محض زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں ہوتی بلکہ انھیں خدمتِ خلق کے لیے ابھارتی ہے۔ یہ بے غرضی اپنوں اور پرایوں میں فرق و امتیاز نہیں کرتی۔

ذاکر میاں میں دو اور صفات ایسی ہیں جن سے ان کی انسان دوستی کا خمیر بنا ہے۔ وہ ہیں صداقت اور جرأت۔ اگرچہ وہ بے حد خلیق اور منکسر المزاج ہیں اور کبھی کسی کی دل آزاری یا توہین نہیں چاہتے، بایں ہمہ اگر ضرورت آپڑے تو حق بات کہنے میں تامل بھی نہیں کرتے۔ چند سال ہوئے دہلی میں قومی یک جہتی کی کانفرنس (نیشنل انٹگریشن کانفرنس) ہوئی تھی جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے وزیر اور کانگریس کے سب بڑے بڑے نیتا شریک تھے۔ قومی یک جہتی پر بہت سی تقریریں ہوئیں۔ بعض مقرروں نے بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی، گفتگو دلچسپ مگر حقیقت سے دور تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مرض کا جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے وہ اوپری ہے۔ اندرونی بیماری پر نظر نہیں گئی، یا لوگ دیدہ و دانستہ نظر بچا گئے تاکہ خود فریبی کو ٹھیس نہ لگے۔ ذاکر میاں کو تقریر کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہماری قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ذات پات کا نظام ہے جس کی جڑیں ہماری زندگی میں اتنی گہری پیوست ہیں کہ آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ ہمارا دستورِ اساسی اسے مانے یا نہ مانے، وہ بھی ان رسم و رواج کو یکایک نہیں بدل سکتا جو ہزارہا سال سے سماجی زندگی پر چھاتے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود معاشرہ اپنے اخلاقی ارادے کی قوت سے انھیں بدلے۔

صبر و تحمل کی صفت بڑے ریاض کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ذاکر میاں بعض اوقات نہایت خود غرض، جھوٹے اور متفنّی لوگوں کو انگیز کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کی بد طینتی سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان کی فراست بلا کی ہے

کوئی چاہے کہ جھوٹی سچی باتوں یا للّو پتّو سے انھیں رام کرلے تو وہ بڑی غلطی میں ہے
خوشامد سے انھیں نفرت ہے۔ وہ بہت جلد ہر ایک کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔
جنھیں اچھا نہیں سمجھتے، ان کے ساتھ بھی اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ احمقوں اور کوڑھ
مغزوں کو بھی بڑے صبر سے جھیلتے ہیں۔ میں نے انھیں بعض اس قسم کے لوگوں سے
باتیں کرتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں گھر واپس جاتے ہیں کہ ہم نے
اپنی لیاقت کا کیسا سکہ بٹھا دیا۔ بیوقوف کہیں کے! ذاکر میاں چاہتے ہیں کہ وہ اپنی
اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور ازالۂ وہم کی نوبت نہ آئے۔ سبب یہ کہ وہ کسی کا دل
نہیں دکھانا چاہتے۔

اعلا سیرت کی تعمیر میں جہاں اقدارِ عالیہ سے گہرا لگاؤ ضروری ہے،
وہیں یہ بھی لازم ہے کہ فکر کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو تاکہ آدمی ان تمام معاملات
میں جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے یا اجتماعی زندگی کے مسائل سے ہے، صحیح
نتائج اخذ کرسکے۔ قدرت نے ذاکر میاں میں غیر معمولی فراست اور فکری قابلیت
ودیعت کی ہے۔ وہ جلد اپنی رائے قایم کرلیتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ صحیح ہوتی ہے
ان کی ہر بات میں سنجیدگی، متانت اور وزن ہوتا ہے۔ رائے قایم کرلینے کے بعد
اس پر عمل کرتے ہیں۔ ذہن کی تیزی اور سلامتیِ طبع ایک جگہ کم جمع ہوتی ہیں،
لیکن ذاکر میاں میں یہ دونوں موجود ہیں۔ اسی طرح عقلی اور وجدانی صلاحیت
بھی ایک شخص میں کم ملتی ہے۔ لیکن غیر معمولی اشخاص میں ان دونوں کے جمع
ہوجانے سے بڑے بڑے کام ظہور میں آتے ہیں جن سے پوری سوسائٹی
فائدہ اٹھاتی ہے۔

انشا پردازی

ایک اعلا انسان اور ماہرِ تعلیم ہونے کے علاوہ ذاکر میاں کا شمار اردو
زبان کے چوٹی کے انشا پردازوں میں ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ادب میں
ادبیت کہاں سے آتی ہے، لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ادبیت خلوص
کے بغیر جلوہ گر نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہر مخلص شخص
اعلیٰ درجے کا ادیب نہیں ہوجاتا۔ ادیب کے لیے ازبس لازمی ہے کہ اس میں

اظہارِ خیال کی قابلیت بھی ہو، ورنہ کسی کے خیالات کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں اگر وہ ان کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا تو ان کی خوبی اس کا اندرونی تجربہ ہو کر رہ جائیگی جس میں دوسرے شرکت نہیں کر سکیں گے، بالکل اسی طرح جیسے گونگے کے منہ کا گڑ۔ اظہارِ خیال کی اعلا قابلیت اور اخلاص دونوں مل کر ادب کا جادو جگاتے ہیں۔ یہ دونوں صفتیں ذاکر میاں کی تحریروں میں موجود ہیں۔ ان کے طرزِ تحریر میں کہیں کہیں خطیبانہ شان آگئی ہے، لیکن اس میں آورد اور تصنّع کا نام نہیں۔ ان کی تحریروں سے سچّی جذباتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے جو فکر میں سموئی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ حقیقی ادیب کا سب سے بڑا دشمن کون ہے، تو میں اس کا فوراً یہ جواب دوں گا کہ تصنّع۔ جس تحریر میں تصنّع ہو گا وہ کبھی تخلیقی ادب نہیں بن سکتی۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے ادبی ملمّع کاری کہہ سکتے ہیں، جو آج کل ہمارے نام نہاد انشا پردازوں کے یہاں بہت عام ہے۔ شوق ہے کہ کہے جائیں، اگرچہ کہنے کے لیے کچھ ہے نہیں۔ یہ کہیں مرصّع نگاری کا روپ دھارتی ہے اور کہیں شاعرانہ طرزِ بیان کی صورت اختیار کرتی ہے۔ خلوص کی کمی کے باعث کلام کا اصلی مقصد یعنی تاثیر نہیں حاصل ہوتی۔ لفظ روح کے قالب ہیں، اگر ان کی تہ میں اصلیت اور صداقت کی کارفرمائی نہ ہو۔

ذاکر میاں کے طرزِ تحریر میں خلوص کے ساتھ جوش اور ولولہ، تازگی اور قوت ہے جو ان کی شخصیت کا عطیہ ہے۔ انھیں کچھ کہنا ہو، تو اسے بالکل فطری انداز میں کہہ دیتے ہیں۔ بعض دفعہ دوسری مصروفیتوں کے باعث وہ اپنی تحریر پر نظرِ ثانی تک نہیں کر پاتے۔ اس کے باوجود عبارت میں کہیں ڈھیلا پن اور جھول نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دریا کی روانی کی طرح لفظوں کے قافلے پے در پے رواں دواں ہیں، جن کی توانائی اور دل آویزی جاذبِ قلب و نظر ہوتی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ان کی تحریروں اور تقریروں سے متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بجا طور پر ذاکر میاں کا شمار اردو کے صاحبِ طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔

انسان دوستی اور اسلام

ذاکر میاں کی انسان دوستی خاص کر اسلام کی تعلیم سے اپنا نور اور بصیرت حاصل کرتی ہے۔ ویسے ان کا زندگی کا نقطۂ نظر عالم گیر ہے۔ ذہنی طور پر وہ عقل پسند اور جذباتی طور پر ایک مذہبی انسان ہیں۔ جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے دیکھا ہے وہ ان کے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ان کے اخلاص و عقیدت اور بے ریا اور بے تصنع زندگی کا اقتضا ہے۔ ان کی عبادت نمایش کے لیے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اظہارِ عبودیت کے لیے ہے۔ جس طرح ان کے پالے پوسے ہوئے ادارے جامعہ ملیّہ اسلامیہ میں قومیت اور اسلامیت کے اصول کو ملا کر بطور نصب العین رکھا گیا ہے اسی طرح ذاکر میاں کی زندگی میں یہ دونوں اصول تحلیل ہو کر ایک ہو گئے ہیں اور ان کی ہم آہنگی ہی سے ان کی سیرت کے خدوخال نمایاں ہوئے ہیں۔ نہ قومیت ان کی اسلامیت پر انگشت نمائی کرے اور نہ اسلام قومیت کو راندۂ درگاہ اور مردود ٹھہرائے۔ ہمیں ان کی تحریروں میں متعدد ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں فصاحت و بلاغت اور جوشِ بیان کے علاوہ ان اصول کا صحیح امتزاج پیش کیا گیا ہے۔

حسن شاہ کا اثر

نوجوانی میں ذاکر میاں کی سیرت و کردار پر ایک صوفی اور درویش حسن شاہ کا گہرا اثر پڑا جو ہمارے دادا کے دور کے عزیز ہوتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے وہ اور اپنے رنگ میں منفرد۔ گرمیوں کی تعطیل میں ہم سب بھائی قایم گنج آتے، تو حسن شاہ دن بھر ہمارے یہاں رہتے تھے۔ صبح آتے اور شام کو جاتے، لیکن کھانا ہمارے یہاں نہیں کھاتے تھے یہیں پور میں

عبدالعلی خان کے یہاں ان کا قیام رہتا تھا۔ صبح نو دس بجے وہاں سے کچھ کھا کر آتے اور شام کو واپسی پر وہیں جا کر کھاتے۔ ہمارے یہاں دن میں چائے ضرور پی لیتے تھے اور پان بھی شوق سے کھاتے تھے۔ وہ فرخ آباد کے شاہ طالب حسین مجیب کے ارشد خلفا میں سے تھے اور انھیں اپنے شیخ کے ساتھ بدرجۂ کمال عقیدت اور وارفتگی تھی۔ مزاج پر جذب غالب تھا، اس لیے کبھی کبھی اپنے معمولات میں شدت اختیار کر لیتے تھے۔ حضرت مجیب کے عقیدت مندوں میں کثرت سے ہندو صاحبان بھی تھے۔ چونکہ آپ نومسلم تھے، آپ کے اکثر و بیشتر عزیز کائستھ تھے۔ ایک دفعہ حسن شاہ کسی ہندو عقیدت مند کے ماتھے پر قشقہ دیکھ کر بھری محفل میں اعتراض کر بیٹھے؛ یہ حضرت مجیب کے صلح کل مشرب کے خلاف تھا اس پر حضرت نے حسن شاہ کو اسی محفل میں سب کے سامنے حکم دیا کہ قشقہ لگا کر پہلے یہاں سے کشمیر اور پھر وہاں سے جنوبی ہند میں رامیشورم تک پیدل جاؤ، اور وہاں سے بڑے پروہتوں کی چٹھیاں لا کر دو، جن میں تمہاری وہاں حاضری کی تصدیق ہو۔ حسن شاہ نے بلا تامّل اپنے شیخ کے ارشاد کی تکمیل کی اور اس سفر کی تکمیل کر کے ڈھائی سال بعد فرخ آباد واپس آئے۔

حسن شاہ اپنے شیخ کے انتقال کے بعد درگاہ سے وابستہ رہے۔
ایک روز فجر کی نماز سے کچھ قبل درگاہ کی مسجد میں صفائی کر رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہ اس وقت صرف ایک لنگوٹی باندھے اطمینان سے جھاڑو دینے میں مشغول تھے کہ ان کے پیر بھائی شاہ افتخار الحق جو جید عالم تھے، نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوئے۔ انھوں نے حسن شاہ پر اعتراض کیا کہ یوں خانۂ خدا میں لنگوٹی لگائے پھر رہے ہو، اس سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ حسن شاہ برافروختہ ہو گئے۔ آؤ دیکھا، نہ تاؤ، جھٹ لنگوٹی کھول کر شاہ افتخار الحق کے منہ پر دے ماری اور کہنے لگے کہ "ہم تو یوں ہی آئے تھے اور یوں ہی جائیں گے۔ خدا نے ہمیں یوں ہی پیدا کیا ہے، لباس کی بدعت تو مولویوں نے نکالی ہے۔" شاہ افتخار الحق جو حسن شاہ کی جذبی کیفیت سے واقف تھے، یہ سن کر چپ ہو رہے۔ جب بھندن میاں کو جو شاہ طالب

حسین مجیب کے خلیفہ اور جانشین ہوئے تھے، اس واقعہ کا علم ہوا، تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس پر حسن شاہ درگاہ سے چلے آئے اور پھر کبھی وہاں قدم نہیں رکھا۔

حسن شاہ کو مطالعے کا بیحد شوق تھا۔ ایک لکڑی کے صندوق میں پہیے لگوا کر ایک گاڑی بنوالی تھی، جس میں کتابیں بھر لیتے تھے۔ گاڑی کے اگلے حصّے میں لوہے کا کنڈا تھا، جس میں رسی ڈال کر اگر کسی ایسے مقام پر جاتے جہاں صاف سڑک ہو صندوق کو کھینچ کر لے جاتے۔ لیکن اگر کہیں ایسی جگہ جانا ہوتا جہاں کا راستہ اونچا نیچا ہے، تو ایک گزی کی رنگین خورجی میں کتابیں بھریں، خورجی کو کاندھے پر اس طرح ڈالا کہ اس کا ایک حصّہ آگے اور دوسرا پیچھے لٹک گیا اور چل کھڑے ہوئے۔ ہمارے یہاں گاڑی لانے میں دشواری تھی اس لیے اسی خورجی میں کتابیں لایا کرتے تھے۔

حسن شاہ ہم سب بھائیوں میں ذاکر میاں کو بہت چاہتے تھے۔ ان سے اپنی فارسی کی کتابیں جو تصوف پر تھی، نقل کرواتے۔ ذاکر میاں کا کہنا ہے کہ اس نقل کرنے کے سبب سے میرا اردو کا خط اچھا ہو گیا۔ ایک مرتبہ ذاکر میاں بیمار پڑ گئے، تو حسن شاہ روزانہ صبح آکر خود اپنے ہاتھ سے ان کا قارورہ حکیم احمد شیر خان کے یہاں لے جاتے تھے جو سبحان پور میں ہمارے مکان سے کوئی پون میل پر رہتے تھے۔ کبھی انھیں روپے دیتے کہ قریب کے محلے میں فلاں غریب آدمی کو دے آؤ؛ کبھی کسی بیوہ کے یہاں روپے بھجواتے۔ برسوں اسی طرح ان کا معمول رہا۔ کتابیں نقل کروانے کے علاوہ ذاکر میاں کو ان کے مطالب و معانی بھی سمجھاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ذاکر میاں کی روحانی تہذیب کی اور انھیں تصوّف کی اعلا قدروں سے روشناس کیا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ حسن شاہ جب دوپہر میں کوٹھی میں لیٹتے اور یہ شعر گنگناتے، تو ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس میں خسروؒ نے دھنیے کے روئی دھنکنے کا صوفی تاثر ظاہر کیا ہے:

در پے جانانِ جان ہم رفت، جان ہم رفت
رفت رفت رفت، جان ہم رفت
این ہم رفت و آن ہم رفت
آنہم رفت این ہم رفت، آنہم، آنہم۔ آنہم۔ آنہم رفت

حسن شاہ کو کیمیا اور دوائیں تیار کرنے کا بھی شوق تھا۔ ان کے مرید جو کچھ دیتے وہ یا تو غریب غربا پر تقسیم کر دیے یا دوائیں خریدتے کتابیں انھیں خریدنا نہیں پڑتی تھیں۔ ان کے معتقدین کو ان کے اس شوق کا علم تھا، وہ تحفتاً نہیں پیش کرتے تھے۔ ان کے ایک پیر بھائی نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ کسی دوا کو جوش دے رہے تھے۔ جوش کے بعد اسے ایک شیشے میں انڈیلا تو شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس وقت روزے سے تھے اور افطار میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ بس طیش میں اٹھے، صراحی میں سے پانی کٹورے میں انڈیل، غٹ غٹ پی گئے۔ پانی پیتے جاتے اور کہتے جاتے تھے، "تم نے ہمارا شیشہ توڑا، ہم نے تمہارا روزہ توڑا"۔ بعد میں جب خیال آیا تو اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے پورے سال بھر روزے رکھے۔
ان کا ۱۹۱۰ء میں متھرا کے قریب کسی گاؤں میں انتقال ہوا۔ ان کا سارا سر و سامان ایک جوڑا کپڑا اور کچھ کتابیں تھیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ سے کچھ اوپر تھی۔

تفریحی مشاغل

انسان کی سیرت کے اندرونی رجحانوں کا پتا اس کے تفریحی مشاغل سے لگتا ہے۔ ذاکر میاں کے تفریحی مشاغل کتب بینی کے علاوہ دو ہیں؛ باغبانی اور رہبر لنے پتھر جمع کرنا۔
ایک ماہرِ تعلیم کی جو نئی نسل کے ذہن اور جذبات کی نشو و نما اور تہذیب چاہتا ہو، باغبانی کے مشغلے سے خاص مناسبت ہے۔ جس طرح تعلیم و تربیت کے ذریعے سے وہ ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں شخصیت اپنے

کمال کو پہنچے، اسی طرح باغبانی میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قدرت نے پودے میں جو صلاحیت پوشیدہ رکھی ہے، اس کا پوری طرح سے اظہار ہو۔ پھول کھلے تو ایسا کھلے جو کھلنے کا حق ہے، نہ کہ مرا ہوا، مرجھایا ہوا، جھلسا ہوا۔ باغبانی کے شوقین بیجوں کے ملانے سے ان کے رنگ اور جسم بدل دیتے ہیں۔ اور یہ تبدیلی الکل پچو نہیں ہوتی بلکہ کسی خیال، کسی منصوبے کے تحت ہوتی ہے اس طرح باغبانی بھی تعلیم کی طرح ایک تخلیقی فن ہے۔

جب ذاکر میاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، تو وہاں ہر طرف خاک اڑتی تھی۔ بیشک نئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں، لیکن کسی نے اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا کہ چمن بندی کر کے گرد و پیش کو بھی جاذبِ نظر بنایا جائے۔ پرانی عمارتوں پر ویرانی برستی تھی۔ ذاکر میاں کی توجہ سے نہ صرف نئی عمارتوں کے چاروں طرف ہی چمن بندی ہوئی، بلکہ تمام پرانی عمارتوں کے گرد و پیش کو بھی کیاریوں، پودوں اور پھولوں سے خوب صورت بنایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ طالبِ علم بجائے خاک پھانکنے کے کیاریوں اور گھاس کے تختوں پر آکر بیٹھیں؛ وہاں پڑھیں، ہنسیں، بولیں اور اس طرح ان کا دل لگے اور یونیورسٹی کی رونق میں اضافہ ہو۔ یوں سات آٹھ سال میں یونیورسٹی کی کایا پلٹ گئی۔ جن لوگوں نے کچھ عرصہ قبل یونیورسٹی کو دیکھا تھا، وہ اب اسے دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔

پھولوں میں ذاکر میاں کو گلاب بہت پسند ہے۔ یہ ہے بھی پھولوں کا بادشاہ۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ہر گوشے میں گلابوں کی کیاریاں لگوائیں۔ ہر رنگ کے گلاب، لال، پیلے، گلابی اور سفید۔ اسٹاف کے بعض لوگوں کو بھی اپنے گھروں میں گلاب باغ لگانے کا شوق پیدا ہوا۔ یونیورسٹی میں ہر سال گلابوں کی جو نمائش ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں شروع ہوئی تھی، اب بھی ہوتی ہے۔ اس میں نارنجی، ارغوانی، سیاہ، سبز، اور فاختئی رنگ کے گلاب بھی دیکھنے میں آئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا گلاب باغ خاص کر دیکھنے کے لائق ہے۔ ہر سال دو ایک انعام

ان کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کی زمین ویسے بھی گلاب کے لیے موزوں اور سازگار ہے۔ یونیورسٹی میں کہیں بھی نکل جائیے، گلابوں کی بہار دکھائی دے گی۔

گلاب کے علاوہ ذاکر میاں کے زمانے میں یونیورسٹی میں بوگن ویلیا کا بھی کثرت سے رواج ہوا۔ ہر طرف اس کی باڑھ نظر آتی ہے۔ جب بوگن ویلیا بہار پر آتی ہے، تو یہ بڑا دلفریب منظر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایس ایس ہال کے باہر کمروں کی دیواروں کے متوازی یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ بوگن ویلیا کی بہار کے زمانے میں باہر کے جو سیاح علی گڑھ آتے ہیں، وہ ایس ایس ہال کے باہر کے منظر کی ضرور تصویر کھینچتے ہیں۔ پروفیسر حبیب الرحمن نے بوگن ویلیا کے مختلف رنگ تخلیق کیے، جن کی شہرت علی گڑھ کے باہر تک پہنچی۔ قدرت نے پودے اور پھول پیدا کیے، انسان اپنی تخلیقی صلاحیت سے ان کے رنگ روپ اور ان کی جسامت میں تبدیلی کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت انسانی تصرف کی وجہ سے ہزاروں قسم کے گلاب اور بوگن ویلیا موجود ہیں۔ ہر ملک میں رنگ برنگی تخلیق جاری ہے اور بوگن ویلیا کی اقسام میں برابر اضافہ ہو رہا ہے

ذاکر میاں کا تخلیقی ذہن انسانوں کے علاوہ نباتات کو بھی خوب سے خوب تر اور حسین سے حسین تر بناتا ہے۔ وہ جب بہار کے گورنر تھے، تو پٹنہ کے راج بھون میں تین سو سے اوپر مختلف گلاب کی قسمیں تھیں۔ ان میں سوائے چند کے جو باہر سے منگوائے تھے، سب وہیں کے گلاب باغ کے تھے پھول جیسی نازک چیز بغیر مستقل توجہ اور ذاتی لگاؤ کے نشوونما نہیں پا سکتی۔

دیوگڑھ میں ایک صاحب بھٹاچارجی نامی گلابوں کے بڑے ماہرِ خصوصی ہیں۔ انھوں نے مختلف گلابوں کے میل سے نئے نئے رنگ تخلیق کیے ہیں وہ پٹنہ کے راج بھون میں آئے، تو ذاکر میاں کے گلابوں کے شوق اور ان کے انہماک کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ پٹنہ سے واپس جا کر انھوں نے اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین"، رکھا؛ ان کا یہ گلاب ہندوستان بھر میں اور

ہندوستان کے باہر بھی اب اسی نام سے مشہور ہے۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے بھی بوگن ولیا کی ایک تخلیق کا نام "ذاکر یانا" رکھا ہے جس میں گلابی اور نارنجی رنگوں کی آمیزش سے لطیف تدریجی کیفیت پیدا کی ہے۔ دونوں رنگ الگ الگ رہتے ہوئے ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ بنگلور میں کروٹن نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ وہاں کے ایک ماہر نے بھی ذاکر میاں کے پودوں اور پھولوں سے شوق کو دیکھ کر اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے جس کی رنگا رنگی میں لطیف ہم آہنگی ہے۔ جو ذوقِ نظر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہماچل پردیش کے سابق گورنر راجہ صاحب بھدری نے جو گلے ڈیولس کے بڑے ماہر اور شوقین ہیں، اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے۔ یہ ایک پھول دار درخت ہے جس کے پتے تلوار کے نمونے کے ہوتے ہیں۔

جس زمانے میں ذاکر میاں وائس پریسیڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے ان کی کوٹھی کے گلاب باغ میں گلابوں کی چار سو سے زائد قسمیں موجود تھیں۔ دوست احباب ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے گلاب تحفتاً بھیجتے رہتے تھے، اس لیے کہ انہیں معلوم ہے کہ ذاکر میاں کو اس سے جو خوشی ہوتی ہے وہ اور کسی تحفے سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ انگلستان اور فرانس اور جرمنی سے گلاب تحفے میں آئے جو وائس پریسیڈنٹ کے گلاب باغ کی رونق بنے۔ جب گلاب کا موسم ہوتا، تو اس باغ کی ہر کیاری کی بہار دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔

ذاکر میاں کا دوسرا شوق پرانے پتھر جمع کرنے کا ہے۔ ایسے پتھر جو کسی زمانے میں نباتی یا حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے تھے لیکن کروڑوں سال زمین کے نیچے دبے رہنے سے کیمیاوی عمل کے باعث پتھر میں تبدیل ہو گئے۔ ذاکر میاں کے پاس سب سے پرانا پتھر (فاسل) ۲۵ کروڑ سال پہلے کا ہے۔ اس پر ان درختوں کی پتیوں کا عکس ہے جن سے کوئلہ بنتا ہے۔ وہ الجیریا سے ایک پتھر لائے، جو ہو بہو گلاب کی شکل کا ہے۔ ویسی ہی گلاب کی سی پنکھڑیاں لیکن پتھر کی۔ اسے وہاں ریگستان کا گلاب کہتے ہیں۔ آسٹریلیا کے گورنر جنرل لارڈ کیسی نے ایک دودھیا پتھر بطور تحفہ بھیجا تھا، جو نیلگوں رنگ کا ہے، یہ بھی کروڑوں

سال پرانا ہے۔ روسی اکاڈمی کے رکن دناگروڈاف نے ذاکر میاں کے فاسلوں کے ذخیرے کو دیکھا، تو روس واپس جاکر یورال کے پہاڑ میں جو بلوری پتھر ہوتے ہیں ان کا ایک مجموعہ تحفے کے طور پر بھیجا جس میں رنگ برنگ کے کرسٹل ہیں یہ بلوری پتھر بھی قدرت کا عجیب وغریب کارنامہ ہے۔ جماداتی فطرت کے انبار میں صرف کرسٹلوں میں نظم وترتیب اعلا درجے کی ملتی ہے۔ یہی نظم وترتیب د آرڈر، جمادات کے مقابلے میں نباتات میں بڑھتا ہے اور پھر انسان میں اپنے پورے کمال پر نظر آتا ہے۔ کرسٹل میں ارتقا کے قانون کا ہمیں پہلا قدم دکھائی دیتا ہے۔

جامعہ کے ساتھ

ذاکر میاں نے جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ میں ۲۲ سال گزارے۔ اس ادارے کے بانی مولانا محمد علی تھے، لیکن اس کی تعمیر کا کام ذاکر میاں کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس بائیس سال میں ہر قسم کے نشیب وفراز آئے۔ انگریزی حکومت کو جامعہ کا استحکام ناگوار تھا۔ چنانچہ حکومتِ ہند کے اشارے پر حیدرآباد سے جو امداد ملتی تھی وہ بند کر دی گئی۔ اس طرح ہر قسم کی پریشانی اور تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا۔ انجمن تعلیمِ ملّی کے ارکان نے عہد کیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہیں لے گا۔ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ تنخواہ بھی پابندی سے نہیں ملتی تھی۔ کبھی پون سو مل گئے، اور کبھی سو۔ لیکن چونکہ سبھوں کے دل میں خدمت کا جذبہ تھا، اس لیے انھوں نے خوشدلی کے ساتھ مالی پریشانیوں کو برداشت کیا۔ جس مستقل مزاجی سے یہ بیس سال جامعہ والوں نے گزارے، اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں بے نفسی اور ایثار کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ انجمن تعلیمِ ملّی کے ارکان نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنی عمر کے بیس سال جامعہ کی خدمت میں گزاریں گے۔ ذاکر میاں اور ان کے ساتھیوں نے جس پامردی اور استقلال سے اپنے اس عہد کو پورا کیا وہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ ان کے عمل کا محرک خدمتِ خلق کا شدید جذبہ رہا ہو،

ورنہ ان حالات میں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔

جامعہ میں ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ذاکر میاں کے جرمنی کے ساتھیوں میں تھے۔ ان دونوں کو ذاکر میاں نے جامعہ کی خدمت پر آمادہ کیا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ذاکر میاں کو جامعہ میں اپنے تعلیمی تجربوں میں جو کامیابی ہوئی، اس میں ان دونوں اصحاب کے مکمل تعاون کا بڑا حصّہ ہے۔ انھوں نے ہر قسم کی سختی برداشت کر کے جامعہ کے مقاصد کے حصول کے لیے ذاکر میاں کا ہاتھ بٹایا اور حقِ رفاقت ادا کیا۔ ذاکر میاں ہمیشہ اس کا اعتراف کھلے دل سے کرتے ہیں۔ ان دونوں کی خدمات بھی جامعہ کی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔

ذاکر میاں کے جامعہ کے ساتھیوں میں جو اندرونی صفات تھیں انھیں اُجاگر ہونے کے مواقع ملے اور ان میں سے بعض نے ادبی اور علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ عابد حسین صاحب اس وقت اردو زبان کے بہترین مترجم ہیں۔ ان کی تحریریں سنجیدہ، سلیس اور پر مغز ہوتی ہیں۔ عبارت ایسی گٹھی ہوئی اور چست ہوتی ہے کہ اس میں ایک لفظ اِدھر اُدھر نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں کے چناؤ کا انھیں خاص سلیقہ ہے۔ ان کا اسلوب علمی مطالب کے ادا کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کو انگریزی لکھنے میں بڑا ملکہ ہے۔ بہت کم ہندوستانی ہیں جو اتنی عمدہ انگریزی لکھنے پر قدرت رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ اردو میں بھی انھوں نے اپنے اسلوب کی راہ دوسروں سے الگ نکالی ہے۔ ان کی تحریروں میں معنویت اور چونکا دینے والا سبک پن ہوتا ہے، ایسا کہ کہیں ہو، پہچانا جاتا ہے۔ ذاکر میاں کے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ جانے کے بعد سے اب تک وہ جامعہ کے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) ہیں۔ ان کے زمانے میں جامعہ نے کافی ترقی کی۔ قومی حکومت قایم ہو جانے سے جامعہ کی مالی حالت سدھر گئی ہے۔ اب جامعہ کا بجٹ دس لاکھ سالانہ کے لگ بھگ ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری

ذاکر میاں کم و بیش آٹھ سال مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے

شروع میں انھیں علی گڑھ جانے میں پس وپیش تھا، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے اصرار پر انھوں نے یہ خدمت قبول کی۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے یہ انتہائی انتشار کا زمانہ تھا۔ تقسیم ملک کی وجہ سے یہاں کے اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد پاکستان چلی گئی تھی۔ مسلمانوں میں علم وفن میں اعلا لیاقت کے لوگوں کی کمی ویسے ہی تھی، اب جبکہ اساتذہ کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی، تو یہ سوال پیدا ہوا کہ یونیورسٹی کے مسلم کردار کو قایم رکھتے ہوئے کام کیسے چلایا جائے۔ مسلم یونیورسٹی کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے انھوں نے سوچا کہ مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ وہاں کے ہونہار نوجوانوں کو اعلا تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھیجا جائے اور وہاں سے ان کی واپسی تک کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم کام چلایا جائے۔ یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔ چند سالوں میں یہ نوجوان اعلا تعلیم پانے کے بعد علی گڑھ آگئے اور انھوں نے وہاں کی تعلیمی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔ اس کے علاوہ تین ریسرچ اسکیمیں حکومتِ ہند سے منظور کرائیں۔ ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز قایم کرنے کی اسکیم تھی تاکہ مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں پر ریسرچ ہو۔ دوسری اسکیم شعبۂ تاریخ میں ہندوستان کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ پر تحقیق کرنے کی تھی۔ تیسری اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم تھی۔ یہ تینوں اسکیمیں ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں منظور ہوئیں اور حکومتِ ہند نے بڑی فراخدلی سے ان کے اخراجات کے لیے رقوم منظور کیں۔

مسلم یونیورسٹی میں میڈیکل کالج قایم کرنے کی تجویز عرصے سے اس ادارے کے اربابِ حل وعقد کے پیشِ نظر تھی، لیکن یوپی گورنمنٹ کے ٹال مٹول کے سبب سے یہ خواب ۱۹۶۱ء سے قبل شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی اس کے ایک شعبے یعنی بصر (اپ تھلمالوجی) کا انسٹی ٹیوٹ گاندھی اسپتالِ چشم (گاندھی آئی ہاسپٹل) کی شرکت میں نومبر ۱۹۶۵ء میں قایم کیا گیا۔ گاندھی آئی ہاسپٹل میں عملی کام کے مواقع تھے، تاکہ انسٹی ٹیوٹ میں جو ریسرچ ہو اس کے متعلق تجربے وہاں کیے جائیں۔ حکومتِ ہند نے بھی انسٹی ٹیوٹ کے لیے امداد منظور کی۔ شروع ہی سے انسٹی ٹیوٹ کے کام کی اچھی شہرت رہی ہے، اور اب بھی ہے۔ یہاں دور دور

سے مریض علاج کے لیے آتے ہیں۔

ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں کافی ترقی ہوئی۔ نئے اسٹاف کا تقرر ہوا۔ جب ذاکر میاں مسلم یونیورسٹی گئے ہیں تو اس وقت اس کا بجٹ پندرہ لاکھ بھی نہیں تھا۔ اور جب وہاں سے آئے تو پچاس لاکھ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اداروں، خاص کر تعلیمی اداروں کی زندگی میں سب سے بڑی چیز ان کی ساکھ ہے۔ ان کے عہد میں مسلم یونیورسٹی کی گری ہوئی ساکھ پھر سے اونچی ہو گئی اور وہاں کی اسناد قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں۔

مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں ذاکر میاں کو جن کام کرنے والوں سے سابقہ پڑا، ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ کچھ واقعی قابل تھے؛ کچھ قابلیت کے دعویدار تھے، لیکن اندر سے خالی ڈھول تھے۔ کچھ ایسے تھے، جو چالاکی، چرب زبانی اور درباداری سے اپنی اہلیت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے معلمی کا پیشہ غلطی سے اختیار کر لیا؛ انہیں کسی اور محکمے میں ہونا چاہیئے تھا۔ ذاکر میاں ان میں سے ہر ایک کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ لیکن اپنی مروّت اور عالی ظرفی میں انھوں نے اپنی واقفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ یہ ضرور تھا کہ کبھی ان صاحبوں کی نسبت ذکر کرتے تو افسوس کا اظہار کرتے کہ پتّا مار کر اپنا کام کیوں نہیں کرتے؛ خالی خولی باتوں سے کام تھوڑی ہوتا ہے۔

علمی ذوق

ذاکر میاں کا علمی ذوق بہت بلند معیار کا ہے۔ انتظامی مصروفیات کی وجہ سے علمی کام کے لیے جتنا وقت چاہیئے، اتنا وہ نہیں دے سکے؛ لیکن ان حالات میں بھی انھوں نے جو کچھ کیا، وہ ہمارے بعض پروفیسروں کے کام سے زیادہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے الٰہ آباد کی ہندوستانی اکاڈمی کی دعوت پر "معاشیات، مقصد اور منہاج" کے موضوع پر تین مقالے پڑھے، جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کی فرمائش پر ۱۹۴۵ء میں "سرمایہ داری" پر دس لیکچر دیے، جنھیں پہلے دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا تھا؛ اور اب اس کا دوسرا

ایڈیشن ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی نے شائع کیا ہے۔ ان میں سرمایہ داری کا علمی جائزہ لیا گیا ہے کہ کن خاص حالات میں اس کے مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو انسانوں کی ان گنت خواہشات اور ضروریات ہیں، دوسری طرف ان کی تشفی کے وسائل محدود ہیں۔ اس وجہ سے اس اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے جسے ہم معاشی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے اصول و قوانین کا باہر سے مطالعہ ممکن نہیں، انھیں صرف سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی لیے معاشیات افہامی علم کہا گیا ہے جیسا کہ زومبارٹ نے واضح کیا ہے۔ ان لکچروں میں اسی نقطۂ نظر سے مسائل کو پیش کیا ہے۔

انھوں نے جرمن ماہرِ معاشیات فریڈرش لسٹ کی کتاب "قومی معاشیات" کا اردو میں ترجمہ شائع کیا۔ ترجمہ سلیس، شستہ اور رواں ہے۔ یہ کتاب معاشیات کی بلند پایہ تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ ہر ملک کی معاشی حالت وہاں کے مخصوص احوال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے لیے آزاد تجارت کا اصول ٹھیک ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب ملکوں پر اس کا اطلاق ہونا چاہیئے بعض ملک ایسے ہیں کہ اگر ان کی صنعتوں کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا گیا، تو وہ کبھی صنعتی ترقی نہیں کر سکتے۔ مثلاً انیسویں صدی کا جرمنی لیجیے؛ وہاں صنعتی ترقی کے امکانات تھے، لیکن ان کو بروئے کار لانے کے لیے صنعتوں کو باہر کے مقابلے سے محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ ہندوستان کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔

"مملکت اور اخلاق" کے موضوع پر احمد آباد کے لاسکی انسٹی ٹیوٹ کی فرمایش پر جو لکچر دیا تھا، وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ اخلاقی اصول مملکت کے لیے نصب العین کا کام دیتے ہیں۔ مملکت کی کوشش رہتی ہے کہ انھیں جہاں تک ہو سکے عمل میں لائے۔ لیکن بایں ہمہ سیاست اور نظم و نسق کی عملی ضروریات کی تکمیل کے لیے مملکت کو اپنے خاص مصالح کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ بجز ایسا کیے کوئی مملکت کامیابی سے نہیں چل سکتی۔ اس طرح ہر مملکت اپنے وجود کے اسباب کا تعین کرتی اور مصالح ملکی کو بروئے کار لاتی ہے۔

بچّوں کا ادب

ہمارے ملک میں بچوں کے ادب کی طرف کافی توجہ نہیں کی گئی۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس صنف میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، وہ بڑوں کے لیے جاذبِ نظر نہیں ہوتیں تو بھلا بچّوں کو اپنی طرف کیسے راغب کر سکتی ہیں۔ اردو زبان میں تو بچوں کے ادب کی اور بھی کمی ہے۔ یورپ کی زبانوں میں ہر سال ہزاروں کتابیں بچوں کے لیے شائع ہوتی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ پیرس میں بچّوں کی کتابوں کی نمایش دیکھی، تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتابیں کیسی دیدہ زیب اور دل آویز تھیں، ایسی کہ ان کے دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تصویریں رنگ برنگ کی؛ رنگ نہ بہت شوخ، نہ بالکل پھیکے: جلدیں نہایت عمدہ۔ ان میں سے بعض تو ایسی دل کش تھیں کہ بچّے تو خیر بچّے ہی ہیں، بڑوں کو بھی اپنی للچائی ہوئی نظروں پر قابو رکھنا پڑتا تھا۔ ذاکر میاں نے "ابو خاں کی بکری"، اور چودہ اور کہانیاں عرصہ ہوا، رقیہ ریحانہ کے نام سے لکھی تھیں۔ گذشتہ سال مکتبۂ جامعہ نے انھیں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ مکتبہ کی بہترین مطبوعات میں سے ہے۔ کاغذ اور جلد کی عمدگی کے علاوہ اس میں مشہور آرٹسٹ گجرال کی بنائی ہوئی تصویریں شامل ہیں جن سے کتاب کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اگر اسے یورپ میں کسی بچوں کی کتابوں کی نمایش میں رکھا جائے، تو تعریف ہی ہوگی؛ شرمندہ ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ظاہری محاسن کے ساتھ اس کی معنوی خوبیاں، کہانیوں کی سلیس اور سادہ زبان، قدرتی طرزِ بیان جیسے کسی سے باتیں ہو رہی ہوں۔ بچوں کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے یہ طرزِ بیان موزوں ہے۔ یقین ہے کہ یہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ممدّ و معاون ثابت ہوگا۔

گورنر اور وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے

ذاکر میاں ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک پانچ سال بہار کے گورنر رہے

اور پھر تقریباً پانچ سال نائب صدر جمہوریہ۔ نائب صدر کی حیثیت سے انھوں نے تین مرتبہ عرب ملکوں کا دورہ کیا۔ اور اس طرح ہندوستان اور ان ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ میرے خیال میں ہندوستان کو ذاکر میاں سے بہتر کوئی اور سفیر نہیں مل سکتا، جو دلوں کو جوڑے نہ کہ دلوں کو توڑے، جو قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لائے نہ کہ انھیں ایک دوسرے سے دور کرے۔ ۱۹۶۷ء کے آغاز میں انھوں نے جنوبی مشرقی ایشیا کے بعض ملکوں کا دورہ کیا۔ یہ دورہ بھی بہت کامیاب رہا۔ وہ جہاں گئے ان کا گرمجوشی سے استقبال ہوا اور یہ لوگ ہندوستان سے قریب سے قریب تر آ گئے۔

بیرونی ممالک کے تعلیمی ادارے

ذاکر میاں کو جب کبھی کسی دوسرے ملک میں کسی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا، انھوں نے وہاں اپنی نیک دلی اور قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ ۱۹۴۵ء میں لندن میں یونیسکو کے قیام کی غرض سے جو پہلا اجلاس ہوا تھا اس میں ذاکر میاں ہندوستان کے وفد میں شریک تھے۔ سرکاری طور پر سر جان سارجنٹ وفد کے صدر تھے، لیکن عملاً راجکماری امرت کور نے صدر کے فرائض انجام دیے۔ وہ سب معاملات میں ذاکر میاں کے مشورے کے مطابق کام کرتی رہیں۔ یونیسکو کا جو اجلاس ۱۹۵۶ء میں ہندوستان میں ہوا تھا، اس میں ہندوستانی وفد کے صدر اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو اس وقت وزیرِ تعلیم تھے، لیکن عملاً ہندوستانی وفد کی سربراہی ذاکر میاں نے کی۔ وہ عرصے تک یونیسکو کے ایگزیکٹیو بورڈ کے رکن بھی رہے۔ بہار کے گورنر مقرر ہونے پر جب انھوں نے دوسری جماعتوں سے استعفیٰ دیا تو اس وقت اس بورڈ کی رکنیت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ عرب ملکوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے یونیسکو کی طرف سے جو کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی تھی، اس میں انھوں نے ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے یونیسکو کی نمایندگی کی تھی۔ اس موقع پر انھیں عرب ممالک کے ماہرینِ تعلیم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس وقت سے برابر عرب ملکوں میں ان کی عزت و وقعت میں

اضافہ ہوتا گیا۔ وہ عرصے تک انٹرنیشنل اسٹوڈنٹس سروس کی ہندوستانی کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ بعد کو جب یہ ادارہ تحلیل ہو کر ورلڈ یونیورسٹی سروس میں بدل گیا تو وہ اس کے بھی صدر رہے اور بہار کے گورنر ہونے پر اس سے مستعفی ہوئے۔ اسی طرح گورنر ہونے کے وقت تک وہ سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے صدر تھے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے عرصے تک ممبر رہے اور راجیہ سبھا کے بھی۔ وائس پریسیڈنٹ آف انڈیا ہونے کے بعد بھی تعلیمی معاملات میں ان کی دلچسپی بدستور قایم رہی۔

تعلیمی خطبات

مختلف یونیورسٹیوں کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں انھوں نے جو خطبے پڑھے، ان میں ہندوستان کی تعلیم کے تمام اہم مسائل پر بحث کی ہے اور ہندوستانی ماہرینِ تعلیم کے بہت سے خلجان رفع کیے ہیں۔ بہت سے گوشے جو تاریکی میں تھے، انھیں اپنے قلب و نظر کی بصیرت سے روشنی بخشی ہے۔ بنیادی تعلیم کے لیے انھوں نے یہ اصول پیش کیا تھا کہ یہ محض کتابی نہ ہو بلکہ عملی ہو، اور اس کا فیصلہ ہر مقام کی صنعتی اور حرفتی خصوصیات کے مطابق کیا جائے۔ انھوں نے پچھلے سالوں میں مختلف یونیورسٹیوں کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں جو خطبے دیے ہیں ان میں بار بار اس اصول کو دہرایا ہے کہ ثانوی اور اعلا تعلیم میں بھی دستکاری اور حرفے پر زیادہ توجہ دینا چاہیئے۔ ثانوی میں زیادہ اور اعلا میں اس سے کم۔ اس طرح پورے ملک میں تعلیمی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور ہماری قومی کارکردگی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم لکیر کے فقیر بنے رہے اور کتابی تعلیم سے چپٹے رہے، تو اندیشہ ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ہم دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائیں گے۔

قومی یکجہتی

ذاکر میاں نے قومی یکجہتی کے مسئلے پر کافی غور کیا ہے۔ ان کے نزدیک

قومی یکجہتی سے ایسا اتحاد مراد نہیں ہے کہ اجزا کی انفرادیت فنا ہو جائے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی انفرادیت کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ قومی ورثے سے جدا نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انھیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا بھی احساس ہے، انھیں ملک و قوم کی خدمت میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں کرنا چاہیئے، اس کے بغیر وہ اپنی تہذیبی انفرادیت کو حق بجانب نہیں ٹھہرا سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کے مسلمان اپنے ہمسایہ ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں اسلام کی زیادہ خدمت انجام دیں گے، ان کی اسلام کی اور وطن کی خدمت ساتھ ساتھ ہوگی، اس میں کوئی تضاد نہیں ہوگا۔ مثلاً پاکستان کے مسلمانوں کی زیادہ تر توجہ سیاسی اور معاشی امور کی جانب رہے گی۔ اس لیے وہ مذہب و اخلاق کی خدمت کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکیں گے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے وسعتِ نظر حاصل ہوگی۔ جس کا اثر لازمی طور پر اسلام کی توجیہ اور تعبیر پر بھی، جو وہ اپنے لیے قبول کریں گے۔ ان کی فکر اور تخیل دونوں کو ہر وقت نئے نئے چیلنج ملتے رہیں گے جن سے نپٹنے کے لیے وہ اپنی توانائیوں کو مرکوز رکھیں گے۔ جس طرح عالمِ اسلام دنیا میں اقلیت میں ہے، اسی طرح سے ہندوستان کے مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ جن اصول پر وہ اپنے مسائل حل کریں گے، ممکن ہے وہی اصول پورے عالمِ اسلام کے لیے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دیں، جن میں اندرونی اخلاقی اور مذہبی اصلاح بھی شامل ہو۔ اور دنیا کی دوسری قوموں سے ربط و تعلق استوار کرنے کا قرینہ بھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی امیدیں ہیں، جس کی زندگی کے مسائل پر بڑی گہری نظر ہے۔ اس کا امکان ہے کہ تاریخ ان امیدوں کی تصدیق کر دے۔ تاریخ کی تخلیقی رَو انسانی عمل اور ارادے سے متعین ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے مقاصد بلند اور ان کے ارادوں میں پائداری رہی، تو کیا بعید ہے کہ وہ پورے عالمِ اسلام کے لیے نمونہ بن جائیں اور خود اپنی اجتماعی زندگی کو ترقی اور مرفہ حالی کی اعلا منزلوں تک پہنچا دیں۔

صبر اور محنت کا پھل

جامعہ کی بائیس سالہ زندگی میں ہر قسم کے نشیب و فراز آئے۔ ہر قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ذاکر میاں اور ان کے ساتھیوں کے قدم ذرا نہ ڈگمگائے۔ ذاکر میاں کو کشمیر سے ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) اور حیدر آباد سے عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی گئی تھی، لیکن انھوں نے ان پر جامعہ کی تنگدستی کو ترجیح دی۔ وہ یہاں ایک مقصد لے کر آئے تھے؛ وہ یہاں سے اس وقت تک کیسے جا سکتے تھے جب تک ان کا تعلیمی مشن مکمل نہ ہو جاتا۔ ان کی نیک نیتی کے سبب سے خدا نے ان کے کام میں برکت دی اور ان کی با مقصد محنت ٹھکانے لگی اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ یہ ادارہ مضبوط بنیادوں پر قایم ہو گیا۔ وہ کام جو تجربے کے طور پر شروع ہوا تھا اب سند مانا جاتا ہے۔ جامعہ کا پیغام یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد انسان کو انسان کا مقام یاد دلانا ہے، جو تہذیبِ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔ اس پیغام کی اہمیت عرصے تک قایم رہے گی؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ یہ کبھی فرسودہ نہ ہو گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر زمانے میں اسے نئے معنیٰ پہنانا ہوں گے۔

نجی زندگی

انسان کی سیرت کو پرکھنے کے لیے اس کی نجی زندگی بہت مفید کسوٹی ہے۔ بعض لوگ جو محراب و منبر یا آج کی اصطلاح میں پبلک پلیٹ فارم پر بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں، اگر ان کی نجی زندگی کو دیکھیے تو وہاں ان سب بلند آہنگ دعووں کی نفی ملے گی۔ ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ سے آئینے کی طرح پاک صاف رہی ہے۔ اس میں ہر بات ظاہر ہے، کوئی چیز چھپی نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں، وہی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت کے اوصاف، پبلک زندگی اور نجی زندگی دونوں میں یکساں ہیں۔ وہی سادگی، وہی بیساختگی، وہی نمایش سے گریز، وہی ملنساری اور محبت کی آمیزش، وہی وضعداری، اپنوں سے بھی اور

پرایوں سے بھی۔ وہ ایک شفیق باپ، ایک دردمند بھائی اور ایک مخلص دوست ہیں۔ آدمی ہر حالت میں ان پر پورا بھروسا کر سکتا ہے۔ امانت و دیانت کی یہ شان اس زمانے میں کم لوگوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر کسی سے وعدہ کرلیں، تو اسے پورا کریں۔ وہ ہر ایک کا کام کرنے کو تیار رہتے ہیں بشرطیکہ یہ جائز اور درست ہو۔ میرے علم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں، جو ذاکر میاں کی طرح دوسروں کی خوشدلی سے مدد کرتے ہوں۔ اگر وہ کسی کا کام نہیں کر سکتے، تو بڑے اخلاق سے اس کا اظہار کر دیتے ہیں، اور اس شخص کو پوری بات سمجھا دیتے ہیں کہ وہ اسے کیوں نہیں کر سکیں گے۔ وہ کبھی کسی کو غلط اور موہوم اُمید نہیں بندھاتے، جیسا کہ بعض دوسرے بااختیار لوگوں کا شیوہ ہے، جسے وہ اپنی دانست میں بڑی حکمتِ عملی سمجھتے ہیں۔ خاک حکمتِ عملی ہے! جھوٹ کو چاہے کسی برگزیدہ بڑے نام سے پکار لیے، وہ جھوٹ ہی رہے گا۔ ایک حق گو اور صداقت شعار انسان کبھی کسی کو غلط بات باور کرانے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ اسے یہ کرنا چاہیے۔ سچّائی انسان کو بہت ساری آلایشوں سے بچاتی ہے۔ ذاکر میاں کی صداقت کو بڑے چھوٹے سب مانتے ہیں۔ اپنے پرائے سب اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس سے ان کے کردار کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔

بہار کے گورنر اور نائب صدر کی حیثیت سے حکومت ان کے قدموں میں رہی، لیکن ان کے انکسار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انھوں نے جس طرح فقر میں شاہی کی بلند نگاہی نہیں چھوڑی، اسی طرح شاہی میں فقر کے آداب کا احترام کرتے رہے۔ جہاں بھی رہے مقبول اور محبوب رہے۔ جو ان سے ایک مرتبہ مل لیا، وہ ان کی دلنواز شخصیت سے مسحور ہوگیا۔ دہلی میں ذاکر میاں کی زندگی کا بڑا حِصّہ گزرا ہے۔ یہاں ہزاروں لوگ انھیں جانتے اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ نائب صدر کی کوٹھی کا منظر عید کے دن دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ سیکڑوں آدمی موٹروں میں، رکشاؤں میں، پیدل جوق در جوق عید کی مبارکباد دینے آتے۔ ان میں دولت مند بھی ہوتے اور غریب بھی۔ لیکن ذاکر صاحب، کوئی ایسا نہیں جس سے مصافحہ اور معانقہ نہ کرتے۔ عملے والے اور چپراسیوں سے بھی اسی طرح اخلاق سے ملتے،

بیسا دوستوں سے۔ اپنے پرانے جاننے والوں سے ہمیشہ سے جس طور سے ملتے آئے، اسی طرح اب بھی ملتے ہیں۔ سب کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ پٹنہ میں جب گورنر تھے، تو کسی تہوار کے موقع پر راج بھون کے سارے عملے کو دعوت دی۔ وہاں جو ..... رہتے ہیں، انھیں بھی دعوتی رقعہ پہنچا۔ وہ بھی اوروں کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن، دعوت میں شرکت کے لیے آئے۔ جب چائے پانی کے بعد تقریب ختم ہوئی، تو ذاکر میاں نے باری باری سب سے مصافحہ کیا، .... سے بھی ہاتھ ملایا۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی اور ان کی سچی انسان دوستی کا یہی تقاضا تھا۔ لیکن بہار والوں کے لیے یہ عجیب بات تھی، اور اس کا ذکر میں نے وہاں کے اونچے طبقوں میں خود سنا۔ ابھی حال میں ایک بہاری دوست نے بتایا کہ اس کا چرچا ابھی ختم نہیں ہوا۔ گویا کہ اَن ہونی بات تھی جو اتفاق سے ہو گئی، اب نہ ہو گی۔ اور یہ اس ملک کا حال ہے جس کے دستورِ اساسی میں اونچ نیچ اور ذات پات کے فرق و امتیاز کو خلافِ آئین قرار دیا گیا ہے۔ خالی دستور میں لکھ دینے سے کیا ہوتا ہے؛ جب تک لوگوں کے دل نہ بدلیں، معاشرتی فرق و امتیاز مٹنے والا نہیں۔ اور جب تک یہ نہیں مٹے گا، ہماری جمہوریت کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی۔ ذات پات کا فرق اور صحیح معنوں میں جمہوریت کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔

ذاکر میاں فخرِ خاندان تو ہیں ہی، لیکن وہ اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہیں۔ ان کی شخصیت کی حدود بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی روح کی روشنی سے بہت سارے دل اور بہت سی محفلیں منور ہیں۔ وہ بجا طور پر فخرِ قوم ہیں۔ وہ اپنی ذات سے انجمن ہیں اور بہت سی انجمنیں ان کی ذات سے فیضان حاصل کر رہی ہیں ہمیں اس بات پر بجا طور پر فخر ہے:

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آن
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

رشید الدین خاں

ذاکر حسین خاں صاحب کی زندگی کا
ایک جائزہ

آزادیٔ ہند کے پورے ایک سال پہلے، ذاکر صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۴۶ء کو نظام کالج، حیدر آباد کے بزمِ ادب میں ایک بڑا معنیٰ خیز خطبہ پڑھا تھا، جس کا عنوان تھا: "سیرت کی تربیت"۔ اس میں انھوں نے بڑے نظریاتی استدلال سے یہ کہا تھا کہ:-

"تمدنِ جماعتی کی تعمیر کا ایک نرالا مگر نہایت حکیمانہ مطالبہ یہ ہے کہ معمار خود اپنی تعمیر بھی کریں۔ یعنی قدرت نے ان میں جو صلاحیت، جو قوتیں، جو استعدادیں، جو رجحانات عمل ارزانی فرمائے ہیں، ان کے بے ترتیب انبوہ میں نظم و ترتیب پیدا کریں ان میں یکسوئی اور یک جہتی کی تدبیر پیدا کریں۔ اور اپنی بے ترتیب انفرادیت کو مرتب اور ہم آہنگ سیرت بنائیں اور اس سیرت کو اقدار و عالیہ مطلقہ سے وابستہ کرکے اسے آزاد اخلاقی شخصیت کے مرتبہ پر پہنچا دیں۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت، یہ ہے اُن معماروں کی اپنی تعمیر کا راستہ۔" اسی کی مناسبت سے اس مضمون کا عنوان "شخصیت" رکھا گیا ہے۔

یہ خطبہ کیا تھا ایک سحر انگیز پیغام تھا، جس کا اثر ہمارے دل و دماغ پر یوں نقش ہوا کہ جیسے ہماری حیات مدرکہ اور حیات اخلاقی کا ایک جزء بن گیا ہے۔ میں اور میرے قریبی ساتھی جیسے سید عابد حسین، آصف علی خاں، جلال الدین صدیقی، عبد الرشید خاں، رفیع احمد اس خطبہ کی محویت میں گویا گم سے ہو گئے تھے۔ اسی عالمِ محویت میں، میں نے

ان پر ایک مضمون بعنوان "شخصیت" ۴ ستمبر ۱۹۴۶ء کو مکمل کیا، جو بعد میں نظام ادب میں شائع بھی ہوا۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال کی تھی اور میں نظام کالج حیدرآباد میں ایم۔اے کی ابتدائی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔

ذاکر صاحب نے اپنے خطبہ کی ابتدا ان دل نشیں الفاظ سے کی تھی جو عابد کو ابھی تک یاد ہیں۔ انھوں نے کہا تھا:۔

"مجھے آپ پر رشک آتا ہے کہ آپ کو آغا حیدر حسن صاحب جیسے فاضل اور خوش ذوق ادیب کی مشفقانہ ہدایت میں اپنے ادب سے رمز آشنا ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ قوم کا ادب، اس کے افکار، کردار، اس کے ارادوں اور منصوبوں کا، اس کے حوصلوں اور ولولوں کا خزانہ ہوتا ہے۔ جس سے آنے والی نسلیں اپنی زندگی کو مالا مال کر سکتی ہیں۔ یوں تو یہ خزانہ کتابوں میں بھی محفوظ ہوگا، لیکن اس کی جگہ آغا صاحب جیسے امینوں کا دل ودماغ ہوتا ہے۔ وہاں آپ ہم جیسوں کو اس سے بقدر ظرف حصہ ملتا رہتا ہے۔"

یہ کون آغا صاحب تھے جن کی ذاکر صاحب اتنی قدر کرتے تھے؟ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نظام کالج کے مشہور اردو کے پروفیسر تھے۔ دہلی کی زبان کے ماہر مغل زیورات اور پوشاک اور کھانوں کا اتنا علم تھا کہ گھنٹوں بیگماتی زبان میں دلچسپ واقعات سناتے تھے۔ مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے، بے انتہا مہربان تھے۔ ان کی نگہبانی اور شفقت نے مجھے اردو ادب کو اور زیادہ غور وفکر سے سمجھنے کا موقع دیا۔ گو اس ادبی ذوق کی ابتدا علی گڑھ میں ہو چکی تھی، جب انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں میرا ایک مضمون اختیاری اردو ادب تھا اور میں نے ۱۹ سال کی عمر ہی میں نئی قایم شدہ جامعہ اردو کے "ادیب ماہر" کی ڈگری بھی درجہ اول میں حاصل کر لی تھی۔ آغا صاحب کی ہمت افزائی کے طفیل میں مجھے مدارس یونیورسٹی کے بی۔اے کے امتحان میں اردو کے پرچے میں فوقیت نصیب ہوئی اور آغا صاحب نے اپنے "بہشتی غولیں" ایسے انوکھے انداز میں ازراہِ عنایت یہ تحریر فرمایا:۔ "عزیزی رشید الدین احمد خاں...... کی اردو بہت سے اساتذہ سے اچھی اور خط مجھ سے اچھا"...... اور جس قدر مجھے ان کا حال معلوم ہوتا گیا، ان کی عزت اور محبت میرے دل میں پیدا ہوتی گئی۔ خلیق، ملنسار

محنتی، ذہین، نیک اور اطاعت گزار ہیں۔ جہاں تک خلق و مروت کا تعلق ہے، بیسویں صدی میں سولہویں صدی کی روح معلوم ہوتی ہے...... میری ان کے لیے دعا ہے کہ یہ اپنے خاندان، اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوں۔" آمین"

آغا صاحب بہت دلچسپ اور انوکھے آدمی تھے۔ ان میں بود و باش کی نمائش نام کو بھی نہیں تھی، کسی قسم کا دکھلاوا نہیں تھا۔ نہ غرورِ نفس نہ غرورِ علم اور نہ عامیانہ اکڑ۔ وہ تو بڑے خندہ پیشاں شخص تھے اور بڑی بے تکلفی سے نظام کالج کی سیڑھیوں پر، یا گیٹ کے پاس کے چبوترے پر بیٹھے محفل جماتے تھے۔ ان کے ایک انگشت میں مرزا غالب کے نام کی کندہ عقیق کی انگوٹھی رہتی تھی۔ میں نے ایک دن ٹکٹکی باندھ دی، کہنے لگے "چرانا چاہتے ہو، تو یہ لو ایک ہفتہ پہن کر آرزو پوری کر لو، پھر شریفانہ انداز سے لوٹا دینا۔" دل تو نہیں چاہتا تھا کہ لوٹا دوں، لیکن شرافت کی دہائی نے مجبور کر دیا۔ کہنے لگے "تم بہت شریف لیکن بے وقوف آدمی ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی نہ لوٹاتا۔ لیکن اچھا ہے کہ تم اپنے اصول پر قایم ہو۔ اس سے میرا فائدہ ہو گیا۔" آغا صاحب سب ہی سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے، جو کبھی کبھی بعض "چھتا"، حضرات کو ناگوار لگتا تھا، کچھ سمجھتے تھے کہ یہ استاد کے وقار کے منافی ہے۔ آغا صاحب کی بذلہ سنجی مشہور تھی۔ وہ تو کلاس میں بھی فقرہ بازی سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ بے تکلفانہ، دلچسپ اور دل نشیں ہوتا تھا۔ یوں نہیں لگتا تھا کہ کوئی باضابطہ تدریس میں گرفتار ہے، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گھریلو انداز میں زندگی کا طریقہ سکھا رہا ہو، قدروں کی اہمیت وہ ہنستے ہنساتے سمجھا دیتے تھے۔ تہذیب اور اخلاق کی باتیں کماحقہٗ کہانیوں میں ذہن نشین کر دیتے تھے۔ ان کا نرالا ڈھنگ تھا، جس میں کوئی بناوٹ یا کھوکھلی شان نہیں تھی۔ وہ ایک فی البدیع آدمی تھے۔

میں بچپن ہی سے ذاکر صاحب کی سلجھی ہوئی اور دلبستہ متین مگر ہنس مکھ شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی شخصی وجاہت، علمیت اور سب سے بڑھ کر ان کی بے لوث اور دلکش حب الوطنی اور قومی خدمت کے جذبہ نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا میرے والد، غلام اکبر خان المخاطب بہ نواب اکبر یار جنگ بہادر، جو ان کے قریبی عزیز تھے، اور ان سے گہرے مراسم رکھتے تھے، اور ان کی عزت کرتے تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ:۔

ذاکر کی زندگی ایک بامقصد حب الوطنی، قربانی اور ایثار کی زندگی ہے'' میں نے انھیں اپنی بہت چھوٹی عمر ہی میں دیکھا تھا، جب وہ ہمارے یہاں ترپ بازار کے مکان میں آکر رہتے تھے، پھر کئی بار دہلی میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جب وہ میرے والد سے ملنے ہمارے رہائشی مقام کارونیشن ہوٹل، چاندنی چوک آتے، یا پرانی دہلی اسٹیشن پر ہمیں رخصت کرنے آتے تھے۔ میرے والد کو وہ چچا میاں کہہ کر مخاطب فرماتے تھے، اور ہر بار ایک ٹوکری اٹھائے آتے تھے جو عام طور پر لوگ بازار سے سودا اور سبزی خریدنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور اس میں ہمارے لیے کچھ سوغات لاتے تھے۔ اکثر انھوں نے جامعہ ملیہ کے اس زمانہ کے کرائے کے مکانات میں جو قرول باغ میں تھے، دعوت پر مدعو کیا اور پر تکلف ضیافت کا انتظام فرماتے تھے، جس میں ان کے دیگر رفقائے کار سے بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں، جن میں مجھے پروفیسر محمد مجیب صاحب اور پروفیسر عابد حسین صاحب بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ انھوں نے میرے والد سے، میرے بڑے بھائی غلام احمد خاں صاحب مرحوم سے اور مجھ سے، آخیر وقت تک بڑی مروت اور محبت کا رشتہ قایم رکھا تھا۔

جب میں نے مندرجہ ذیل مضمون ان پر لکھا، تو اپنی عمر کے اس ابتدائی دور میں مجھ سے یہ ہمت نہیں ہوئی کہ ان کو میں یہ مضمون بھیجتا۔ مگر پندرہ سال بعد ۱۹۶۱ء میں، جب وہ بہار کے گورنر ہو گئے تھے اور میں آرٹ کالج جامعہ عثمانیہ میں تدریس کا کام کرتا تھا، تو میں نے انھیں اپنے پرانے مضمون کی ایک کاپی روانہ کی، اور بڑی بے چینی سے ان کے تاثرات معلوم کرنے کا منتظر رہا۔ دو تین مہینے گذر گئے اور میرا انتظار پشیمانی کی شکل اختیار کرنے لگا، عین اسی وقت میری خوشی کی کوئی حد نہیں رہی جب مجھے ان کا ۲۶ر جون ۱۹۶۱ء کا عنایت نامہ ملا، جو انھوں نے راج بھون رانچی سے لکھا تھا۔ اس کی اہمیت یوں بھی دوبالا ہو گئی کہ انھوں نے یہ خط اپنی صاف ستھری تحریر میں، دیرینہ محبت اور شفقت کے اسلوب میں لکھا تھا۔

اس خط میں یوں رقم طراز ہیں:۔

رانچی۔ ۲۶ر جون ۶۱ء

عزیزم رشید میاں۔ خدا آپ کو خوش اور تندرست رکھے۔ آپ بھی کہتے ہوں

گے کہ عجیب شخص ہیں یہ بھائی ہمارا کہ نہ خط کا جواب دیا، نہ مضمون کی رسید بھیجی۔
مضمون جس وقت ملا اسی وقت پڑھ لیا تھا۔ اس میں اور خط میں آپ نے میری ایسی
توصیف کی تھی کہ مارے خجالت کے اس وقت جواب نہ بن پڑا۔ آپ کی نیک خیالی سے
اپنی بد حالی کو کیسے ملاتا۔ بہر حال جواب رہ گیا۔ اور جب ایک دفعہ رہ گیا تو پھر ٹلتا ہی
رہا۔ لیکن آپ کا خط غیر تعمیل شدہ کا غذات میں وقتاً فوقتاً سامنے آتا اور شرمندہ کرتا رہا
تب سوچا کہ اسے فائل سے نکالنا ہی چاہیئے! آپ نے اپنی محبت میں میرے متعلق
بہت حسن ظن سے کام لیا ہے۔ مگر یہ کچھ برا نہیں۔ میں تو جیسا ہوں ویسا ہی ہوں۔
مگر آپ کو اگر کوئی خوبی مجھ میں یا کسی اور میں نظر آتی ہے تو وہ آپ کی پسند کی غماز ہے۔
آدمی رفتہ رفتہ وہی ہو جاتا ہے جو وہ پسند کرتا ہے۔ وہی صفتیں اس میں مجسم ہو جاتی ہیں
جنھیں وہ پسند کرتا ہے۔ خدا کرے آپ سب بخیر ہوں۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے مطلع
کر دیا کریں۔ آج کل آپ کوئی خاص کام کر رہے ہیں۔ اور آئندہ کیا منصوبے ہیں۔ سب
لوگوں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

آپ کا بھائی۔ ذاکر

زندگی کی اس منزل سے جب خود میری عمر ستّر کے لگ بھگ ہو رہی ہے۔
اور میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی
سیرت اور شخصیت، میرے لیے اور میرے عزیز ساتھیوں کے لیے ایک مشعل راہ بنی
رہی۔ ہماری پشت کے لیے وہ ایک قسم کے "نمونۂ حیات"، تھے۔ ان کی ستھری
با مقصد، باعمل زندگی کی بنیاد ان اعلا قدروں پر تھی جو انفرادی اور اجتماعی زندگی
کو ہم آہنگ کرتی ہے۔ اور دوسروں کے لیے، ملک اور قوم کے لیے بلکہ انسانیت کے
لیے ایک رحمت بن جاتی ہے۔ اسی اندازِ زندگی نے بہت سوں کو ان کا گرویدہ بنا
دیا تھا اور ان کے عزیز دوست رشید احمد صدیقی صاحب کی مناسب اور چپاں
اصطلاح میں وہ صحیح معنوں میں اپنے عہد اور اپنے ماحول کے "مرشد"، بن گئے تھے۔
میرے مضمون کا متن حسبِ ذیل ہے، جو کسی قدر رد و بدل کے ساتھ پیش
ہے۔

شخصیت

ہم سب کے دیس، ہندوستان کے شمال میں، صوبہ متحدہ (اتر پردیش) کے حدود میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، قایم گنج، جو ضلع فرخ آباد کی تحصیل بھی ہے۔ مدت ہوئی کہ مغلوں کی جاہ وحشم کے زوال کے بے ہنگام نراجی زمانہ میں درّہ خیبر سے پٹھانوں کے کچھ جاں باز کوہ نورد قبیلے ترکِ وطن کر کے ادھر کو چلے آئے اور گنگا کے کنارے آباد ہو گئے۔ یہ نووارد فطرت کی آغوش میں پل کر بڑھے تھے اس لیے سماجی اور شہری زندگی کی الجھنوں سے، بیجا پابندیوں سے، اور غیر ضروری رسم ورواج کی بندشوں سے یکسر آزاد تھے۔ بات کے پکے، کام کے پورے، وعدے کے پابند، اس آدم کی بہادر اولاد میں نہ صرف جذبات کی فراوانی تھی بلکہ عمل کی ارزانی اور استواری بھی۔ ان کے وطن کی سر بفلک چوٹیاں، ان کی فلک پیما سرشت کی مظہر تھیں اور پہاڑی سرزمین ان کی نیتوں کی پختگی اور اعمال کی مضبوطی کی ضامن تھی۔ سپہ گری توان کا طبعی وآبائی پیشہ تھا ہی پر ملک گیری بھی اس سچائی، شجاعت اور انصاف سے کی ہے کہ رزم وبزم دونوں میں ان کے اخلاق کی برتری، کردار کی پختگی، اور شخصیت کی بزرگی مسلم ہو گئی تھی۔ ان کی سرزمین، یعنی ان کے روحانی گلستاں سے اب بھی اِکّا دُکّا گل رنگین کھل کر ماضی کی عظمت رفتہ کو حال کی درماندگی میں جلوہ گر اور اپنی اخلاقی مہک سے بزم ملک کو معطر کر دیتا ہے۔ انھیں پٹھان اسلاف والاصفات کے مزرعۂ فکر وعمل کا۔ یعنی شرافت وایمان داری کا۔ صداقت وعدالت کا، شفقت ومحبت کا۔ بلند خیالی

والوالعزمی کا۔ ایثار و رواداری کا۔ شجاعت کا۔ دلیری کا۔ ایک گلِ سرسبز۔ ڈاکٹر ذاکرحسین خاں صاحب کی شخصیت ہے[1]

انسانی زندگی کے اعلیٰ ترین نمونہ کو ہم "شخصیت" کہہ سکتے ہیں، جو اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کی حامل ہو "شخصیت" مبنی ہے پانچ افعال انسانی پر جو اس کے بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ ان میں سے تین داخلی ہیں اور دو خارجی۔ احساس کی ذکاوت فراوانی اور پائداری افکار کی بلندی وسعت اور اجتہاد، ارادہ کی صداقت اور قوت اعمال کی استواری اور استقلال اور سیرت کی پاکی یا اخلاق حُسنہ۔ ان سب کا لازمی نتیجہ حیات صالح یا کردار طیبہ ہے، جسے ہم "شخصیت" کہیں گے۔ پہلی تین صفات داخلی ہیں، اور آخری دو خارجی۔ پہلی تین محرکات ہیں اور باقی نتیجہ تحریک۔ احساس کی فراوانی، فراغ دلی کی نشانی ہے۔ رفعت افکار، افلاکی روح کا اظہار، اور قوت ارادہ کردار کی مضبوطی کی دلیل، اعمال کی پختگی ان جذبی اور ادراکی صفات، کے بہترین اور لطیف امتزاج یعنی توازن اور ہم آہنگی کا ثبوت ہے اور اخلاق حسنہ ان سب کا لازمی نتیجہ۔ یہی اجزا بالآخر باہمی ربط سے حیات صالح کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابل لحاظ ہے کہ چونکہ شخصیت کا درجہ انفرادیت کی معراج ہے۔ اس لیے شخصیت کے اوصاف کا تعلق اجتماعیت سے ازحد ضروری ہے، یعنی یہ کہ ان صفات کا اظہار جماعت کے تعلق سے ہونا چاہیئے

کیوں کہ شخصیت بزم عام میں ہی اجاگر ہوتی ہے اور تنہائی میں بس ایک گل بہ صحرا

ہم شخصیت کے اسی نظریاتی نقطۂ نظر سے ذاکر صاحب کی ذات کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ یہ عناصر خصوصی کس حد تک ان میں موجود اور روبہ کار ہیں۔

۱۹۲۰ء کا زمانہ تھا، ترک موالات۔ آزادیٔ وطن اور خلافت اسلامی کے تحفظ کے نعرہ ہندوستان کی فضاء سیاسی میں گونج رہے تھے۔ ایک سیل رواں تھا جو

---

[1] گو یہ بات حیدرآباد کے لیے باعث فخر اور ہماری مسرت کا موجب ہے کہ ذاکر صاحب کی پیدائش ہمارے ہی شہر حیدرآباد میں ہوئی ہے۔ آپ کے والد مولوی فدا حسین خاں صاحب کئی برس تک حیدرآباد ہی میں وکالت کرتے تھے۔ ان کا انتقال جوان عمری ہی میں ہوگیا تھا۔

سارے ملک میں بہہ رہا تھا۔ ملک کے "ناخدا" جیسے مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، شوکت علی اور ابوالکلام آزاد قوم کی ناؤ کو اس سیاسی منجدھار میں سے پار لگانے کی جستجو میں لگے ہوئے تھے۔ علی گڑھ قوم کے نونہالوں کا ایک اہم مخزن اور آئندہ نسل کا تعلیمی گہوارہ تھا۔ وہ کیوں کر بچا رہتا! یہ طوفان خیز موجیں اس کے ساحل سے بھی ٹکرائیں۔ ٹکرائیں کیا اس کو بھی زیر و زبر کر دیا۔ طالب علموں میں ایک جوش اور ولولہ تھا۔ وطن کو غیر ملکی حکومت کے اقتدار سے آزاد کرانے کا عزم اور سامراج کو شکست دینے کا ارادہ۔ لاتعداد تھے جن میں وقعتی جذبہ بھڑک اٹھا تھا اور وہ اتنے ہی آسانی سے فرو بھی ہو گیا لیکن چند سنجیدہ فکر ایسے بھی تھے جن کے جگر نے واقعی خون کی بوندیں ٹپکائیں۔ وہ کہ جن کے چشم دل میں "نگہہ" پیدا ہو رہی تھی۔ انھیں چند کے لیے وہ انقلابی ساعتیں زندگی کی فیصلہ کن گھڑیاں تھیں۔۔۔ علی گڑھ کے یونین ہال میں مولانا محمد علی اور شوکت علی نے "تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ علی گڑھ ہمارا روحانی گھر تھا، ہم یہاں بڑے ارمان لے کر آئے تھے۔ بہت دل شکستہ جاتے ہیں خدا حافظ"[1] پھر بقول رشید احمد صدیقی صاحب کے "مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر پڑھا تھا

سپردم بہ تو مایہ خویش را ۔۔۔ تو دانی حساب کم و بیش را

اور بیٹھ گئے۔[2] "ہزاروں نوجوانوں کا مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا، بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ایک کہرام تھا۔ دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑتے تھے، اس عالم میں علی برادران حال سے چلے گئے،"[1] اس نظارہ کو رشید احمد صدیقی صاحب اس طرح پیش کرتے ہیں "اب جو دیکھتا ہوں تو ہنگامہ محفل نعرۂ مجاہدین میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک سیلاب تھا جو ساحلوں کو پاش پاش کر رہا تھا، ایک طوفان تھا جو نظم ہستی کو زیر و زبر

---

[1] ملاحظہ ہو: ایک معلم کی زندگی حصہ اوّل از عبدالغفار مدہولی صاحب ص ۵۷
[2] ملاحظہ ہو: مضامین رشید از رشید احمد صدیقی ص ۱۰

کرر ہا تھا۔ ایک ہولناک گونج تھیں جس نے دنیا کی آوازوں کو ہضم کر لیا تھا یا غالب کے الفاظ میں ع

زمین سے آسماں تک سوختن کا باب تھا[1]

اسی ہال کے ایک کونے میں ایک بیمار، میانہ قد، سڈول جسم باوقار نوجوان اپنی بڑی بڑی پُرنم آنکھیں نیچے کیے ہوئے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ صورت سے غم وغصہ نمایاں، غصہ سے چہرہ سُرخ، سارا بدن پسینہ سے تر تھا، قائدین کے جانے کے بعد ہال میں طلبہ کی تقریروں کا شور اٹھا۔ ایک غلغلہ الامان! مگر صرف ایسی تقریریں جس میں بے جا جذبات اور غلط خواہشات کی فراوانی ہوتی ہے، جن کا مقصد بجز بھڑاس نکالنے اور سامعین کو بے جا مشتعل کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا جب یہ طوفان بے تمیزی حد سے تجاوز کر گیا تب یہ خاموش متین نوجوان (جو ایم۔ اے، ایل ایل بی کا طالب علم اور اسسٹنٹ لکچرار تھا) اٹھا۔ اب اس کے جذبات تاب خموشی نہ لاکر بالآخر منت کش تقریر ہوئے، اس نے دل فگار اور دل آگیں لہجہ میں کہا۔۔۔۔۔

"ہر معقول بات کو طعن اور تشنیع کے حربہ سے اگر یوں ہی ختم کیا جائے گا تو یہ جوش کڑھی کا ابال ہو کر رہ جائے گا۔ بات اگر جو کہی گئی ہے اگر صحیح ہے اور دل کو لگتی ہے تو اسے مانیے۔۔۔۔ آخر آپ سب نے اپنی عقل گروی تو نہیں رکھی ہے!"[2]

بات یہ نہیں کہ علی گڑھ کو سرکار انگریزی سے مالی مدد ملتی نہیں۔ قائدین نے کالج سے یہ مطالبہ کیا کہ سرکاری تعلق کو چھوڑ دے اور قوم سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر کالج ایسا نہ کرے تو نوجوانوں کی تعلیم کا دوسرا انتظام کیا جائے جس کی ذمہ داری قائدین لیں۔ اس پر فقرے کسے گئے کہ یہ شخص بھی کالج کا ملازم (اسسٹنٹ لکچرار) ہے اس لیے ہمارے جوش کو دبانا چاہتا ہے تب اس وجیع نوجوان نے جوش صداقت سے کہا" میں اپنی لکچراری سے مستعفی ہوتا ہوں"، تب سب کے منہ بند ہو گئے۔ قومی کاموں میں ذاتی قربانی، خلوص

---

[1] ملاحظہ ہو، مضامین رشید۔ از رشید احمد صدیقی ص ۱۱

[2] ایک معلم کی زندگی، حصہ اوّل، ص ۵۹

نیت اور بے لوث خدمت کا ثبوت تو ہے ہی، مگر ساتھ ہی عوام کے دل بھی مسخر ہو جاتے ہیں۔ یہی ایثار کی روحانی فتح مندی ہے۔

لکھتے ہیں رشید احمد صدیقی صاحب "میں مرشد (ذاکر صاحب) کو گھسیٹتا ہوا مجمع سے باہر لایا۔۔۔۔۔ باہر نکل کر میں نے مرشد سے پوچھا یہ کیا ہوا۔ فرمایا رشید صاحب الوداع۔ زندگی کا آغاز بے خبر ہوا ہے، انجام کی دعا کیجیے گا۔۔۔۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ تحریک صحیح ہو یا غلط فرزندانِ علی گڑھ رزم و بزم دونوں میں برابر کے شریک ہیں۔ رنگین محفل ہو اور صدائے نائے و نوش یا میدان جہاد اور نعرۂ تکبیر، وہ دونوں کے لیے یکساں سر بکف ہیں۔ اجل سے نا آشنا رہ کر علی گڑھ اپنی زندگی کا ثبوت کیونکر دے سکتا ہے۔ آپ میرے مزاحم نہ ہوں۔ پانسہ پھینکا جا چکا ہے بازی بھی لگ چکی ہے، جب تک نتیجہ برآمد نہ ہو کسی کو میرے فعل پر کوئی حکم لگانے کا حق نہیں حاصل ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"[1]

انھیں احساساتِ قومی کی جگر تابی نے ذاکر صاحب میں ایک مجاہدانہ عزم، شہیدانہ جستجو اور غازیانہ شان پیدا کر دی تھی۔ جس نے ان کی زندگی کے اس اہم ترین اور نازک ترین وقت میں بس یک لخت ان کی آئندہ زندگی کی تشکیل کر دی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر ارادی اور اچانک واقعات پر متوقع اور دیرپا نتائج پیدا کر دیتے ہیں جو شخصی زندگی کے دائرے سے بڑھ کر اجتماعی زندگی کی محیط دنیا میں کار فرما ہوتے ہیں اور انفرادیت وہ محور بن جاتی ہے کہ جس پر ملی زندگی گھومتی اور ارتقائی چکر لگاتی ہے۔ مگر قدرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ یہ مواقع عموماً اسی وجود کی زندگی میں آتے ہیں جس کو عالم کا کار فرما اجتماعی جذبات کو محسوس کرنے والا دل، قومی افکار کا جائزہ لینے والا ذہن، ملت کی نبض پہچاننے والا دست حکمت، اور انسانیت کو سیدھے راستہ پر چلانے والا پاک اقتدار ودیعت کرتا ہے۔

یہ ابتدا تھی ذاکر صاحب کی با مقصد زندگی کی، جس کی ابتدا خود اس قدر

---

[1] ملاحظہ ہو: مضامین رشید۔ از رشید احمد صدیقی صاحب ص ۱۱

شاندار ہو اس کی انتہا کے کیا کہنے۔

احساس اور احساس قومی کا اندازہ آپ نے اس ایک واقعہ سے کر لیا۔ اب افکار کی فلک پیمائی اور عقابی روح کی جولانی کا اندازہ آپ ان کی تحریر و تقریر میں ملاحظہ فرمائیے۔

"اچھی زندگی کے معنے[1] با مقصد زندگی کے بھی ہوتے ہیں۔ جتنا بلند تر مقصد ہوگا، شخصیت اتنی ہی عظیم تر ہو جائے گی ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ذاکر صاحب کے مقصد حیات کے تعین میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ "افلاطونی" فکر کو بہت کچھ دخل رہا ہے۔ افلاطون کے سماجی نظریات کی آماجگاہ، ذاکر صاحب کا دل ہے۔ آپ افلاطون کی مشہور کتاب "ریاست" کا اردو ترجمہ جو ذاکر صاحب نے کیا، خصوصاً اس کتاب پر ذاکر صاحب کا مقدمہ پڑھ جائیے تو آپ یہ محسوس کریںگے کہ یہ افلاطون کے کتاب کی بلیغ تمہید اور تشریح تو ہے ہی پر اس میں ذاکر صاحب کے "دل کا معاملہ" بھی کھل جاتا ہے اور ان کے محرکات عمل یا مقصد حیات کا راز فاش ہو جاتا ہے، یہاں آپ ان کی خاموشی فطرت کو جوش تحریر میں مائل بہ تقریر پاتے ہیں۔ پڑھے لکھوں میں یہ مشہور ہے کہ افلاطون کو ارسطو نے افلاطون بنایا یعنی اس کے ابہام کو تشریح کا جامع پہنایا، اس نظریہ سے بھی جانچا جائے تو ذاکر صاحب کا یہ مقدمہ ارسطو کی ایک فروگذاشت کی تکمیل کرتا ہے۔

افلاطون کی طرح ذاکر صاحب کا بھی یہی ایقان ہے کہ "صحیح تعلیم" آدمی کو "اچھا آدمی" بنا دیتی ہے اس لیے قومی تربیت میں تعلیم کو سب سے اہم اور بنیادی درجہ حاصل ہونا چاہیئے۔ جس کی روشنی قوم کے دماغوں کو منور اور دلوں کو گداز کر سکے اور قوم اس مشعل ہدایت سے صحیح ترقی کے راستہ پر گامزن ہو کر انسانیت کی معراج تک پہنچ جائے۔ ذاکر صاحب کہتے ہیں کہ "قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیم جو آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے، عام کیجیے تاکہ ایک نئی زندگی کی تعمیر ہو سکے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ع

---

[1] تعلیمی خطبات از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ص ۱۴-۱۶

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ذاکر صاحب لکھتے ہیں کہ "قومی زندگی کا مرکز اس کے بنیادی افکار ہوتے ہیں، اس کے عقیدے، اُس کا نظام افکار، اُس کے معیار کردار، اس کی انفرادی زندگی کے نمونے اور اس کی اجتماعی زندگی کے ولولے، ان کے لیے قوم کی انفرادی اور اجتماعی جد و جہد وقف ہوتی ہے تو قومی زندگی کا نشوونما ہوتا رہتا ہے۔ جب اس مرکز پر زندہ اور زندگی بخش افکار باقی نہیں رہتے، محض عادتیں اور لفظ رہ جاتے ہیں تو حیاتِ قومی پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اس حال میں اداروں کے قیام اور اصلاح کی خارجی تدابیر سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت ہوتی ہے کہ قوم کا کوئی گروہ جرأت اور دیانت سے ان بنیادی افکار کو پھر سے سوچے ان کی تجدید اور تعمیرِ نو کی کٹھن منزل سے خلوصِ نیت کے سہارے گزرے تاکہ حیات تازہ کے چشمے پھر پھوٹیں اور ان افکار و عقائد کے لیے زندہ رہنے اور جان دینے کا ولولہ حیات پرور قوم میں پیدا ہو اور زندگی پھر سے اپنی تشکیل نو میں مشغول ہو سکے۔"[1]

خیالات کی پختگی، معانی کا وزن، عبارت کی روانی، زبان کی سلاست، بیان کی متانت، طرز ادا کی ندرت اور شگفتگی، جذبات کا جوش اور بے باکانہ اظہار یہ ہیں ذاکر صاحب کے ادبی محاسن۔ ان کا قومی درد اس درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ اس کا اظہار آہ و بکا سے نہیں ہوتا بلکہ فکر و عمل کی ساری صلاحیتوں کو قوم کے علاج کی لگاتار جستجو میں مرکوز کرنے سے ہوتا ہے۔ اب سنیے ذاکر صاحب نوجوانوں سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں ـــ "تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے، وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ

---

[1] ترکت (جوبلی کی تجاویز) بیت الحکمت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

رسوم کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی موت کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے لیکن کیا کیجیے۔ تمہارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان، تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے۔" پھر فرماتے ہیں کہ "ہمارے دیس کو ہماری گردنوں سے ابلتے خون کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھویں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے۔ سیاسی جھگڑوں، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قصوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ان میں صدیوں تک کے لیے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال۔ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے۔ اور قدر بھی کم ہوتی ہے۔ جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے۔" [1]

ہم سب واقف ہیں کہ ہماری قومی زندگی میں ذاکر صاحب کے الفاظ میں "سولی کے تختے"، پھانسی کی رسّی، محبس کی تیرہ و تار کوٹھریوں اور سلاسل کی جھنکار، تنہائیوں اور رسوائیوں، ناکامیوں اور بدنامیوں، کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت ہماری آزادی پسندی پر مبنی نہیں بلکہ مجبور غلامی کا خمیازہ ہے آئے دن کے جھگڑے، فساد، ہڑتال، لوٹ کھسوٹ، بھوکی زندگی ننگی موت، جس کو عرف عام میں "غنڈہ پن"، کہہ لیجیے، ہماری سماج کا ناقابلِ انکار جزو ہے۔ جزو ہی نہیں بلکہ جزوِ اعظم۔

ذاکر صاحب اسی فلاکت اور نکبت کا دکھڑا قائدین قوم کو ان الفاظ میں

---

[1] خطبہ قومی تعلیم۔ تعلیمی خطبات از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ص ۲۸، ۲۹

سناتے ہیں۔" یہ التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں میں پہنچایا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھارئیے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن تمدنِ امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں۔ اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کی چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھیں، کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کا دم گھٹ گھٹ کر سکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے گھبراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک صد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈھیں۔ کیا اس سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے۔ کوئی قدر آخری قدر معلوم نہیں ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں۔ کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد دور کیجیے اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔[1]

ہندوستان میں جہاں اور بہت سے امور میں اختلاف اور جھگڑا ٹنٹا

---

[1] خطبہ بنیادی تعلیم۔ تعلیمی خطبات از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ص ۹۴، ۹۵

ہے۔ وہاں زبان کے مسئلہ نے بھی ایک نیا فساد برپا کر رکھا ہے۔ تمدن جب بگڑنے لگتا ہے تو اس کے سارے شعبہ زوال پذیر ہوتے جاتے ہیں۔ تمدن کی عمارت کے نابود ہونے سے پہلے اس کے بنیادی ستون گرنے لگتے ہیں۔ زبان گویا تمدن کی "زبان" ہے جس سے اس تمدن کے معماروں کے افکار و جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے نئے نئے منصوبوں کا انکشاف۔ زبان کے بارے میں ذاکر صاحب کا یہ خیال ہے کہ "زبان کا ادب اب بہت دن ایک چھوٹی ٹولی کا دھندا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے زبان کچھ ہو ایک سماجی چیز ہے یہ آدمی سے آدمی کا رشتہ جوڑتی ہے، ایک دل کی بات دوسرے تک پہنچاتی ہے، اکیلے کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ جوں جوں لکھنے والوں کو اپنی بات سمجھانے کی ضرورت زیادہ پڑے گی جیسے جیسے زیادہ لوگ ان کی باتوں کو سمجھنا چاہیں گے زبان کا ادب سہل اور صاف ہوتا جائے گا اور زندگی کے قریب آتا جائے گا..... زبان سماج کی لونڈی ہے، سننے والوں سے کیسے منھ موڑ سکتی ہے، یہ بولنے والے کا دل کا حال تو کہتی ہے، پر سننے والے کی سمجھ کا پاس بھی اسے کرنا ہوتا ہے"[1]

غلامی ذلت ہے۔ پر روح اور ذہن کی غلامی، بدترین ذلت۔ جسمانی کمزوریاں فطری حدود، طبعی رکاوٹیں، ایسی نہیں ہوتیں جن پر ماتم کیا جائے کیونکہ اس حیثیت سے انسان خود "مجبور شخص" ہے مگر افکار کی بندشیں، جذبات کی پابندیاں اور روحانی غلامی وہ لعنت ہے جو انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتی ہے۔ یہ کہنے سننے سے زیادہ محسوس کرنے اور اصلاح کرنے کی بات ہے کہ ہماری قوم نے اپنی دیرینہ روایات کو، تہذیب کو، تمدن کو، حقیر اور فرسودہ جان کر بیگانہ بنا دیا ہے اور پرائے اصولوں کی جھوٹی چمک سے خیرہ ہو کر اس کے ناپائدار اقدار کو اپنی نظام معیشت کی بنیاد ٹھہرا لی ہے۔ زبان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ "انگریزی ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن گئی ہے، وہ اس میں پڑھتے ہیں، اس میں لکھتے ہیں اور اگر کبھی سوچتے ہوں تو شاید اسی میں

---

[1] "ہندوستانی کیا ہے"، تقریر نمبر ۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ص ۵۶، ۴۷

سوچتے ہیں۔ جب اہل علم کو کسی مجلس میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو اپنے افکار انگریزی الفاظ ہی کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔۔۔۔ اگر ہمارے ملک میں تعلیم کسی ایک چھوٹی سی ذات کے ساتھ مخصوص رہنے والی نہیں ہے اگر اس ملک کے بننے والے جانوروں کے گلوں کی طرح نہیں بلکہ آدمیوں کی جمیعتوں کی طرح زندگی گزارنے پر مصر ہیں، اگر یہاں کی حکومت کسی چھوٹے سے طاقت ور یا چالاک گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ یہاں کی جمہور کی مرضی کے مطابق ہونے والی ہے، تو علمی زبان کے مطالعہ میں صورت حال بدلے گی۔ اور جلد بدلے گی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں انگریزی زبان کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے انگریزی زبان کی معرفت بہت کچھ سیکھا ہے۔ جانتا ہوں کہ بہت کچھ اس سے سیکھنا ہے۔۔۔۔ لیکن جہاں میں یہ سب جانتا ہوں وہاں یہ بھی جانتا ہوں کہ انگریزی جاننے والوں نے جو ایک نئی ذات اس ملک میں بنالی ہے اس نے غیر شعوری خود غرضی سے ہر ذات کی طرح اپنے مخصوص فوائد کو اپنے تک محدود رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے علم کو اپنے تفوق کا ذریعہ بنایا ہے۔ جو سیکھا ہے وہ سکھایا نہیں۔ خواص کو جو حاصل ہوا عوام تک نہیں پہنچایا گیا۔ اپنے کو سیراب کیا ہے اور قوم کو پیاسا رکھا ہے۔ اور چونکہ علم و حکمت کے خزانے بچانے سے گھٹتے ہیں اور لٹانے سے بڑھتے ہیں اس لیے اس طبقہ کی خود غرضی نے اسے بھی کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی قوم کی حقیقی زندگی سے بے تعلقی نے انھیں اپنے دیس میں پردیسی بنا دیا۔ وطن میں جلاوطن کر دیا۔ ان کے کردار کو خلوص سے بہرہ یاب نہیں ہونے دیا۔ ان کی زبان کو مانگنے کی گفتگوئیں ملیں اور ان کے دلوں کو مانگنے کی آرزوئیں، اقبال نے سچ کہا ہے ؎

برزبانش گفتگوہا مستعار

دردل او آرزوہا مستعار[1]

تو بیان یہ تھا کہ ذاکر صاحب کی تحریریں پڑھنے یا تقریریں سنئے تو ان میں

---

[1] خطبہ صدارت نیو ایجوکیشن فیلوشپ۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ص ۱، ۲

آپ "افلاطونیت" پائیں گے اور محسوس کریں گے کہ افلاطون کی "ریاست" کا دانا حکمراں یعنی فلسفی بادشاہ "کچھ کہہ رہا ہے، بلکہ "افلاطون خود بول رہا ہے" یہی وجہ ہے کہ "ڈاکٹر ذاکر کا اصلی کارنامہ جو ان کی ادبی زندگی کو آئندہ جاوید بنادے گا وہ ان کا ترجمہ ہے افلاطون کی مشہور و معروف کتاب "ریاست" کا۔۔۔۔کتاب کی زبان میں اور اس کا انداز بیاں کم سے کم اردو میں تو بے مثل ہے۔ اگر ہم تناسخ کے قائل ہوتے تو ضرور کہتے کہ افلاطون کی روح نے دوبارہ "ریاست" کے اردو مترجم کا جنم لیا ہے۔ اور شاید یہ بات ہو بھی سچ۔ افلاطون کے عہد کا یونان کم سے کم ذہنی اور سیاسی انتشار میں اسلامی ہند سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔"[1]

جامعہ ملیہ کی چھوٹی تعلیمی بستی افلاطون کی شہری "ریاست معلوم ہوتی ہے۔ اور جامعہ کی درسگاہیں، افلاطون کی "اکادمی" افلاطون کے سماجی نظریہ نے ذاکر صاحب پر جو اثر کیا ہے اس کا اندازہ اس کے مشہور مقدمہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ہم ذیل میں افلاطون کی "ریاست" کا اجمال اور ذاکر صاحب کی توضیع و تشریح اختصاراً درج کرتے ہیں جو ذاکر صاحب کے تفکرات سماجی، معاشی و تعلیمی کی تفسیر اور تعبیر ہیں۔

افلاطون کی تصنیف "ریاست ہیں جو بقول ذاکر صاحب "دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب ہے" "ایک نئے تصور حیات اور ایک جدید دستور زندگی" کی طرح ڈالی گئی ہے" اور انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈال کر یہ مرکزی مسئلہ اٹھایا گیا ہے، کہ "آدمی اچھا آدمی کیسے بنے" کیونکہ روحِ انسانی کا مخصوص کمال اچھی زندگی، حیات طیبہ ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے افلاطون نے فرد اور جماعت کے تعلق کی نوعیت سے بحث کی ہے اور پھر اپنے "علمی تعمق" "پیغمبرانہ شان" اور "حسنِ بیان کی آمیزش" سے نتیجہ نکالا ہے کہ "اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے"

افلاطون نے اپنی کتاب میں تین عنوان باندھے ہیں۔ ماہیت عدل، نظام معیشت

---

[1] شخصیات۔ عنوان ڈاکٹر ذاکر حسین از محمد سرور ص ۸۸

نظامِ تعلیم۔

عدل کو وہ "روح کی ایک صفت۔ ذاتی داخلی صفت۔ اور ذہن کی ایک عادت" مانتا ہے اور بتاتا ہے کہ "عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر نہیں بلکہ کل کا جوہر ہے" اور کہتا ہے کہ "عدل تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے"۔ جو شخصی زندگی میں مناسب، ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے۔"

معیشت میں وہ "بنیادی صلاح کا علمبردار تھا"۔ ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے۔ اس لیے اس کی حقیقی اصلاح ذہن ہی کی اصلاح سے ممکن ہے اور ذہنِ انسانی اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے" اس لیے سب سے مساعد حالات ایک اشتراکی نظام ہی میں ممکن ہیں۔" جدید اور افلاطونی اشتراکیت میں فرق ہے۔ جدید اشتراکیت کے پیشِ نظر ایک معاشی مسئلہ ہے افلاطون کے سامنے ایک اخلاقی مہم۔ جدید اشتراکیت دولت کا اشتراک ہے۔ افلاطون کا اشتراک ترک دولت کا اشتراک۔"

تعلیم پر افلاطون کی بحث بہت مبسوط اور جامع ہے بقول روسو "فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئیں، ان میں یہ سب سے بہتر ہے۔" افلاطون ریاست کو اخلاقی جمعیت، ایک مشترک متاع روحانی داخلاقی کی مالک" تصور کرتا ہے اور اسی لیے ریاست میں حکومت کا فرض اولین تعلیم کو سمجھتا ہے۔

ذاکر صاحب لکھتے ہیں کہ "ایشنہ ATHENS کے شہری۔ خوش مذاق اور وسیع النظر شہری۔ کی حیثیت سے اس نے تعلیم میں سیرت انسانی کے تمام عناصر ترکیبی کے نشو و نما کی سبیل کی، یہ حیثیت اسپارتا SPARTA کے معتقد کے، اس نے کامل انسان کو جماعت کا خادم بنایا، اور اس کی تعلیم کو کلیتاً حکومت کے سپرد کیا"۔ افلاطون نے نظام تعلیم کے دو حصہ کر دیئے۔ پہلا لڑکپن اور شباب کا زمانہ ہے۔ دوسرا شباب سے کہولت کی عمر تک کا زمانہ، پہلا سب کے لیے۔ دوسرا صرف "حکمرانوں" کے لیے، پہلے میں جذبات کی تہذیب، سیرت کی تربیت پیش نظر ہے، دوسرے میں فلسفہ و حکمت کی معرفت، عقل و خرد کی تعلیم۔ پہلے حصہ میں ورزش معہ اصول غذا و علاج، اور موسیقی۔ جس میں ادب اور فنون

لطیفہ بھی شامل ہیں۔" ان کے دوگونہ عمل سے سیرت انسانی کی ہم آہنگ نشوونما کا کام لینا چاہتا ہے۔" اور ان سے "عقل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا مطلوب ہے" اور چاہتا ہے کہ "موسیقی کو سادہ سے سادہ بنا کر روح کی سادگی اور یگانگت کے قیام و بقا کی سبیل کرے۔" افلاطون فنون لطیفہ کی اس تاثیر کو اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔" وہ آرٹ کی غایت بس ریاست کی خدمت کو جانتا ہے۔" اس کی نظر میں سچا آرٹ، اچھا آرٹ ہے ہی وہی جو جماعت کے مقاصد میں ممد ہو" یہی نہیں "وہ تو ریاست کو زندگی کے بہت بڑے اور بہت اہم شعبہ یعنی مذہب اور معتقدات پر بھی مسلط کر دیتا ہے۔" وہ ذوق علم اور جوش عمل کی تلقین کرتا ہے اور علم و عمل میں ہم آہنگی اور توازن کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور واضح کرتا ہے کہ "فلسفی کا ایک مقصد اگر عین خیر کا علم حاصل کرنا ہے تو دوسرا اس علم کی روشنی میں نوع انسانی کو سدھارنا بھی ہے۔ کامل مفکر کا صاحب عمل ہونا بھی ضروری ہے۔" "یہی ارباب علم اور اصحاب عمل افلاطون کی اصلاح میں "فلسفی حکمراں" فلسفی بادشاہ" ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خود غرض اہل سیاست کا خاتمہ کرنا چاہیے۔ یہی حکمت و خردمندی سے حکومت کر سکتے ہیں کہ نظارۂ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں۔ یہی بے لوث اور بے لاگ حکومت کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے حکومت کی زحمت کوئی شرف نہیں بلکہ ایک فرض ہے اور بنی نوع کی سچی خدمت کا ایک موقع۔ حیاتِ اجتماعی و انفرادی کے سارے مقاصد مضمر ان پر روشن ہوتے ہیں اور یہ ان کو پیش نظر رکھ کر حکومت کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان پر پھر نہ قانون کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ بے جا رسم و رواج کی بندش۔"

افلاطون صحیح تعلیم پر زور دیتا ہے کیونکہ "صحیح تعلیم کے بعد نہ امراضِ جسم کی گنجائش ہے نہ امراض روح کی اور طبیب اور وکیل انھیں امراض کی علامات ہیں۔ افلاطون نہ مرض کو باقی رکھنا چاہتا ہے، نہ علامات کا روادار ہے۔ اس کے نزدیک تو ریاست جماعت عاملہ ہے جس پر قانون بنانے کی کوئی پابندی نہیں۔ اس جماعت عاملہ کا کام دراصل تعلیمی کام ہے اور ریاست ایک

تعلیمی ادارہ ہے اور بس۔"[1]

ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات ان کے تعلیم و تربیت کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہیں جن میں خوشگواری اور شیریں کلامی کی صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ جن کا بنیادی مقصد سچی تعلیم سے روشناس کرانا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا موضوع تعلیم کا کوئی بنیادی مسئلہ ہے مثلاً قومی تعلیم، بنیادی تعلیم، طبی تعلیم، بچوں کی تربیت اور اچھا استاد۔ ان ہی مختلف خطبات اور تحریروں میں آپ فن تعلیم پر بہت سلجھے ہوئے خیالات کا اظہار پائیں گے جن میں تعلیم کی غایت، ماہیت، فرد کی تربیت اور جماعت کی تشکیل، ذہنی ضروریات، خارجی خواہشات، سب ہی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سب کا اساسی سوال وہی سوال ہے جس کو افلاطون نے اٹھایا تھا، اور ہر سمجھ بوجھ والا انسان اٹھاتا ہے اور بقدر استطاعت جواب بھی تلاش کرتا ہے کہ "آدمی اچھا آدمی کیسے بنے؟"۔ یہ خطبات افکار کی دنیا کے جواہر پارے ہیں جن کی چمک دمک ہر وقت جوہر شناس نگاہ کو خیرہ کردے گی۔ اور متجسّس ذہن کو راہ سجھائے گی کیونکہ ان کے پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن کی مسدود راہیں کھل رہی ہیں اور نئی نئی روشیں نکل رہی ہیں۔ یعنی نگاہ میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ ہماری زبان اردو میں فن تعلیم پر یہ خطبات بمثل ایک ادب عالیہ ہیں جن کی برتری قطعی اور مسلّم ہے۔

زندگی اظہار چاہتی ہے۔ ہر زندگی بقدر ظرف اور بطریق میلان طبع ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ اور پھر ہر زندگی اپنی جبلی سرشت کے مطابق اپنی پنہاں ذہنی صلاحیتوں، جذبی استعدادوں، فکری توانائیوں اور عملی رجحانوں کو اپنی ہستی کے کمال کے وجود تک پہنچانے کے لیے منظم اور ہم آہنگ کرتی ہے، کہ اس ترتیب وجود سے ہستی میں یکسوئی اور ہمہ گیری جنم لے جو انسانی ترقی کے لیے فال نیک ہے۔ انسان کو ایک ہی زندگی ملتی

---

[1] بین القوسین فقرات ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے مقدمہ "ریاست" سے عبارت ہیں

ہے خواہ وہ اس کو اپنی ناسمجھیوں اور غلط کاریوں سے تباہ و برباد کردے یا فہم واحساس سے سنوار لے۔ زندگی کو سنوارنے اور تکمیل کو پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تشکیل اس طور پر کی جائے کہ وہ اس عالم ادراک و محسوسات کی دیگر زندگیوں اور چیزوں کی نہ تو خود مزاحم بنے اور نہ دوسروں کو اپنی راہ میں حائل ہونے دے۔ جہاں اپنے حقوق کو دیکھے اور محفوظ کرے وہاں اپنے فرائض کو بھی پہچانے اور اس پر عمل کرے، کیونکہ آزادی ایک اجتماعی وصف ہے اس کو شخصی اجارہ داری استبداد اور خود غرضی کا رنگ دے دیتی ہے۔ آزادی ایک اضافی اصلاح ہے۔ اس لیے اس کا تعلق مساوات سے بہت گہرا ہے بلکہ یوں سمجھیے کہ آزادی اور مساوات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں جیسے ذاکر صاحب نے کہا ہے کہ "انسانی زندگی ذہنی زندگی، یعنی جماعتی زندگی ہے۔ ساری ذہنی زندگی کا خاصّہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ حیات انفرادی کا پورا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ مَن و تو دونوں یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لیے لوازم ہیں"۔[1]

زندگی کے حقائق پر نظر رکھ کر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اچھے اور پائدار طور میں ڈھالے اور بقول ذاکر صاحب کے "اقدار عالیہ و مطلقہ سے وابستہ کرکے اسے آزاد اخلاقی شخصیت کے مرتبہ پر پہنچائے"۔[2]

ذاکر صاحب کی زندگی یوں لگتا ہے کہ یکسر جہاد رہی ہے۔ وہ تو کارزار حیات میں گویا شہید جستجو ہو کر غازی عمل بن گئے ہیں۔ انسان کی زندگی میں مختلف مواقع آتے ہیں جہاں اس کے جوش یقین، زور ہمت، قوت فیصلہ اور جرأت اخلاقی کا مظاہرہ اور امتحان ہوتا رہتا ہے۔ یہ مواقع کبھی ایک دم آجاتے ہیں اور کبھی آہستہ آہستہ۔ اسی کٹھن راستہ پر سے کچھ ثابت قدم غیر متزلزل گزر جاتے ہیں اور "خودی" یا جوہر حیات سے مالامال ہو جاتے ہیں اور بعضوں کے قدم ڈگمگا جاتے

---

[1] مقدمہ "ریاست"، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ص ۳

[2] تقریر "سیرت کی تربیت" از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

ہیں اور وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ یہ راستہ جتنا کٹھن ہے اتنا ہی مبارک بھی ہے۔ مبارک ان کے لیے ہے جو اس پر سے خیرو سلامتی سے گزر جاتے ہیں کہ پھر ان پر تقدیر عالم بے حجاب ہو جاتی ہے کیونکہ ع

جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

ایسے ہی مواقع ایک آدھ نہیں بلکہ کئی ذاکر صاحب کی زندگی میں بھی آئے اور ان ہی مواقع میں ان کی خوابیدہ توانائیاں ایسی جاگیں کہ ان کی انفرادیت سیرت میں تبدیل ہوئی اور پھر سیرت نے شخصیت کا درجہ حاصل کر کے اپنے فیضِ وجود سے بہت سے سوتوں کو جاگنے کا باعث بنی۔

اس محشرِ عالم میں عمل ہی نجات کی راہ اور عمل ہی نصرت و افتخار کا باعث ہے۔ زندگی مسلسل عمل ہے اور عمل ہی حقیقی زندگی ہے کیونکہ عمل کا مقصد انسانی صلاحیتوں کو، قوتوں کو، ادراک کو، جذبات کو، ہم آہنگ اور متوازن کر کے معراج کمال تک پہنچانا ہے۔ اس کے لیے چند بنیادی لوازمات ہیں جن کی تکمیل پر بامقصد عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ احساس سے مشاہدہ، مشاہدہ سے فکر، فکر سے ارادہ اور ارادہ سے عمل، یہ ہیں وہ منازل جو جادۂ عمل میں حیاتِ عین تک پہنچنے کے لیے طے کرنا ہوتی ہیں۔ اور یہی ارادہ یا نیت ہر عمل کی اساس ہوتا ہے اور ہر عمل کا تعین بھی اسی ارادہ پر مبنی ہے، کیونکہ کوئی عمل بغیر ارادہ ممکن ہی نہیں۔ کیا حکیمانہ حدیث شریف ہے: "اِنّما اعمال بالنیات" (ہر عمل کی بنیاد نیت پر ہے) خواہ ارادہ شعوری ہو یا غیر شعوری۔ اس لیے نیت یا ارادہ ہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرا اور کھوٹا عمل پرکھا جاتا ہے۔ نیت سبب ہے اور عمل نتیجہ۔ ساری کائنات بسیط یعنی آپ اسی اسباب و نتائج کے اصول کی کارفرمائی دیکھیں گے۔ THESIS عمل ANTITHESIS رد عمل اور SYNTHESIS امتزاج کا یہ چکر عالم مدرکہ میں ہر وقت گھومتا اور اثرانداز ہوتا ہے۔ جس طرح ہر چیز کو متعین کرنے یا حکم لگانے کے لیے ہم اسباب و علل تلاش کرتے ہیں اسی طرح انسان کے اخلاقی، افکاری، اور اعمالی اقدار کو تولنے کے لیے نیت یا مقصد و غائت کی میزان درکار ہے۔ جب ارادہ کا نقاب وا ہو جائے

تب عمل کا حسن جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ جس طرح اچھے بیج اچھے اور خوش رنگ و خوش ذائقہ پھل پھول اگاتے ہیں اسی طرح صالح اور پاکیزہ نیتیں برگزیدہ کی طرح ڈالتی ہیں اور خوش آئند نتائج کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ "حدیث فکر و ارادہ" میں "سرِ عمل" معلوم کیا جائے کہ ابتدا، کی خبر ہو تو انتہا معلوم ہو جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کا سب سے بڑا علمی شہ کار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے۔ ان کا عمل مختص رہا ہے جامعہ کے لیے اور جامعہ ہی اُن کی آماجگاہ رہی ہے کہ جس میں وہ اپنے سماجی نظریئے، تعلیمی منصوبے، اجتماعی تعمیر، اور انفرادی تکمیل کو جانچنے پرکھنے کے بعد رواج اور وسعت دیتے رہے ہیں، یا رد کر دیتے ہیں۔ بقول سرور صاحب "وہ ابدی قایم بالذات قدروں کو مانتے ہیں اور انھیں پر اپنی آئندہ بڑائی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ وہ مائل بہ تغیر قدروں کے قائل نہیں"[1] وہ تعلیم اور معلم کی حیثیت سے خوب واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ تعلیم کا عام ہونا ہی قومی ترقی کا ضامن ہے اور یہ کام معلم ہی سے ممکن ہے۔ اس لیے معلم قوم اور قومی زندگی کا معمار یعنی تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے۔۔ عبدالحق صاحب نے ایک جگہ[2] پروفیسری کی دو اہم خصوصیات بتائی ہیں۔ ایک تو اصول پرستی اور دوسرے "استغنا"۔ کیونکہ ان کے خیال میں پروفیسری یا منصب درس و ہدایت تحقیق حق اور تلقین حق کا نام ہے اور حق کے دو پہلو ہیں۔ ایک ذہنی اور دوسرا اخلاقی جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صرف وہی شخص جو اخلاق و عمل کے میدان حق کو ناحق پر ترجیح دے اور اس کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے پر تیار ہو علم کے میدان میں حق کا علمبردار ہو سکتا ہے[3]۔

ذاکر صاحب کے دوست، ہم خیال اور ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

---

[1] شخصیات محمد سرور ص ۸۵

[2] کتاب چند ہم عصر عنوان "پروفیسر مرزا حیرت" از عبدالحق صاحب

[3] رسالہ جوہر عبدالحق نمبر حدیث دیگران از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ص ۱۲۳

نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی توصیف میں ایک مضمون لکھا تھا "حدیث دیگران" اسی میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "ادائے فرض میں انتہائی انہماک اپنی ذات کو اپنے کام میں محو کر دینا یہی سچے استاد یا پروفیسر کی شان ہے۔" اور "سچ پوچھیے تو مسند عالم کی وہ منزلت ہے کہ جاہ و دولت کی طمع میں اس سے اوپر جانا حقیقت میں نیچے اترنے کے برابر ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ "حدیث دیگراں" میں عابد صاحب نے "سرِ دلبراں" کا انکشاف کیا ہے۔ یہی باتیں پوری پوری بکمال و تمام ذاکر صاحب پر صادق آتی ہیں۔ صادق ہی نہیں آتیں بلکہ صادق آنے کے معیار کو بڑھاتی ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ جامعہ ملیہ، دہلی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی مسیحا نفسی کے کرشمہ حیات بخش کا حصّہ ہے۔ اور جامعہ کے سنگ و خشت۔ اس کی عمارتیں، درس گاہیں، اقامت خانے، میدان، مسجد، مطبع، کتب خانے اور مالی وسائل سب ذاکر صاحب کی عملی کامیابی کا مادی ثبوت ہیں ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

پھر ذاکر صاحب کا یہ قول کہ "کھٹ کھٹ کیے جاؤ تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔" سیدھے سادے الفاظ میں جامعہ والوں کو سرگرم عمل رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ جامعہ کے بچوں سے نیک تمناؤں سے امید رکھتے ہوئے اس طرح گویا ہیں:۔۔۔۔

تم سچے ہو گے، اچھے ہو گے، "تندرست ہو گے"، بروں کے لیے لوہا ہو گے، اچھوں کے لیے موم، غریبوں کا سہارا ہو گے، بے کسوں کا آسرا، سوتوں کو جگاؤ گے، ڈوبتوں کو تراؤ گے۔ غریب ہو گے تو بھی سیر چشم دوسروں کی دولت کو منھ پھیر کر نہ دیکھو گے۔ امیر ہو گے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھو گے اور اس کے بندوں کی سیوا میں صرف کرو گے۔ تم جہاں بھی ہو گے اپنے ساتھیوں کے لیے پڑوسیوں کے لیے بستی کے لیے رحمت ہو گے۔ تم اس کے نام لیوا ہو جو سارے جہانوں کے لیے رحمت ہے[1]

---

[1] ایک معلم کی زندگی حصہ دوم از عبدالغفار مدہولی، صفحہ ۳۰

خلوص مقصد، انسان سے حصول مقصود کے لیے سب ہی کچھ کرا لیتا ہے۔ جوئے
شیر کا لانا بھی کار آسان ہو جاتا ہے یہی نہیں تاریخ اس کی بھی شاہد ہے کہ ع
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ذاکر صاحب نے اپنا تن، من، دھن جامعہ کے لیے وقف کر دیا کہ ممکن ہے
اسی طور سے وہ اپنی برگشتہ حال قوم کو راہ راست پر لا سکیں، ممکن ہے صحیح تعلیم
کا عام رواج ایک نئے نظام حیات کی بنیادیں مضبوط کر دے جس میں ہماری
زبوں حال قوم زمان و مکاں کے صحیح اقدار عالیہ و مطلقہ سے واقف ہو کر اپنے
آپ کو ارتقائے انسانی کے اعلا منازل تک پہنچا دے۔ جہاں پہنچ کر رنگ
و نسل کا فرق، ذات پات کا فرق، مذہب و عقائد کا فرق، غرض سارے انفرادی
اجتماعی فرق صلح و آشتی، ملاپ اور بھائی چارہ اور ہمہ گیر محبت سے ایک عام
متحد اور مشترک اکائی میں سموئے جاتے ہیں کہ یہی آخری منزل ہے۔
جامعہ کی تعمیر روحانی میں تو ذاکر صاحب کا حصہ ظاہر ہی ہے۔ پر جامعہ کے
در و دیوار ابھی ان کی سعی مسلسل کا فسانہ سناتے ہیں۔ انھوں نے تعلیمی مسائل
کی گتھیاں ہی نہیں سلجھائیں بلکہ اینٹ چونے اور پتھر کی پریشانی میں بھی مبتلا رہے
ہیں۔ جامعہ کی ہر تعمیر مادی، ذہنی، سب میں ذاکر صاحب کا ہاتھ رہا ہے۔ ہر کام
میں ان کا انہماک اور ولولۂ عمل اور نیت کی سچائی کا ثبوت دیتا ہے۔ پھر ہر کام
ایسے پختہ یقین، تن دہی، اور خوشی خوشی انجام دیتے ہیں کہ ساتھیوں کی ہمتیں بڑھتی
اور کام کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر اور سمجھ کر آپ اقبالؔ کے اس
شعر کا دوبارہ لطف اٹھائیے ؎
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
ذاکر صاحب کا دوسرا مہتم بالشان علمی کارنامہ "بنیادی قومی تعلیم"
کمیٹی کی صدارت اور اس کے رپورٹ کی تدوین ہے جس کو عام طور پر واردھا
اسکیم کہا جاتا ہے۔ اس کے خلاف بہت کچھ کہا سنا گیا ہے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے
کہ مخالفین اپنی بے ہنگام باتوں سے اپنی ناواقفیت یا کوتاہ بینی کا ثبوت دیتے

ہیں۔ مخالفت اس کی کرتے ہیں جس کا ذکر ہی نہیں۔ ہماری سماجی زندگی کے بہت سارے الجھاؤ اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ کسی معاملہ کی موافقت یا مخالفت اس کی جانچ پڑتال کے بعد نہیں کرتے بلکہ سطحی جذبات کے بے محابا اظہار کو اپنی تنقید کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ یہ ہماری قومی بدبختی ہے۔

ڈھائی سو صفحات کی رپورٹ میں تعلیمی منصوبے کو چلانے کے لیے چند ضروری باتیں مثلاً بنیادی اصول، مقاصد، استادوں کی تعلیم، نگرانی اور امتحان، تعلیم کا جو نظام آج کل ملک میں رائج ہے اسے قریب قریب سارے ہندوستانی برا کہتے ہیں، پچھلے زمانے میں وہ قومی زندگی کی اٹل ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکا۔" لہٰذا" تعلیم کے اس نظام کو بدل کر ایک نیا نظام بنایا جائے جس کی بنیاد انسان کی ہمدردی اور بھلائی پر رکھی ہو جو قوم کی ضرورتوں اور خیالات سے میل کھاتا ہو اور اس کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتا ہو" ان کی رائے ہے کہ "صحیح تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا حرفہ سکھایا جائے جس سے کچھ کیا جا سکے۔ اور اسکول کے سارے مضمون اسی حرفہ کے ذریعہ پڑھائے جائیں۔" کیونکہ "یہ انسان کی مکمل تعلیم کا سب سے اچھا طریقہ سمجھا جاتا ہے۔" "بچوں کی طبیعت کے لحاظ سے، سماجی پہلو کو دیکھ کر، قومی آمدنی کے مدِ نظر اور تعلیمی اعتبار سے" حرفہ کو تعلیم کا ذریعہ بنانے سے بچوں کا علم زیادہ ٹھوس ہو جائے گا اس طرح علم کو زندگی سے لگاؤ پیدا ہو گا اور اس کے سب پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں گے۔" اور اس پر نظر رکھتے ہوئے کہ "یہ تو ہونے والی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی سیاست، معیشت، اور تمدن میں جمہوریت کا رنگ دن بہ دن بڑھتا جائے گا۔ نئی پود کو کم سے کم یہ موقع ملنا چاہیئے کہ اپنے ملک کے مسائل، اپنے حقوق کو اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے، ایک بالکل نئے نظام کی ضرورت ہے جس سے لوگوں کو کم سے کم اتنی تعلیم مل جائے کہ وہ شہریوں کے حقوق اور فرائض کو کام میں لا سکیں، پھر آج کل ہر سمجھ دار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیئے یعنی کسی مفید خدمت کے ذریعے سے وہ حق ادا کرنا چاہیئے جو سماج کا اس پر ہے۔" مذہبی تعلیم کے بارے میں کمیٹی کی تجویز یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کا انتظام لوگ

اپنے طور پر کریں تاکہ کسی فرقہ کو شکایت کا موقع نہ ہو۔

روزمرہ کے معاملات میں، میل جول میں تعلقات میں ذاکر صاحب بڑے وسیع اخلاق برتتے ہیں۔ ایسی ہی خلیق اور متوازہ ہستیاں ملنے والوں کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہیں۔ وہ چھوٹوں سے شفقت، ساتھیوں سے الفت، اور بزرگوں کی عزت کرتے ہیں، جس سے سب کے دل موہ لیتے ہیں کہ یہ ان کی ذات کی باطنی گہرائی یعنی جذب حقیقی کی تاثیر ہے۔ ان کے خمیر وجود میں خلاق ازل نے بہترین صفات کے لطیف امتزاج کو برقرار رکھا ہے جس کے بعد انسان دیس، دنیا، اپنے پرائے، سب کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔

ذاکر حسین خاں صاحب کا ذکر

٭ میرے دادا کی ڈائریوں میں ٭

از:۔ رشید الدین خاں

میرے دادا جناب احمد شیر خان صاحب (۱۸۲۵ء - ۱۹۱۵ء) کی تین ڈائریاں جس کو وہ "کتاب یادداشت" کہتے ہیں، مجھے بوسیدہ اور کرم خوردہ حالت میں ملیں۔ ان میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۵ء تک کا ذکر ہے۔ مقام تحریر "قایم گنج، ضلع فرخ آباد، یو۔پی۔

ان تینوں ڈائریوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، خصوصاً ان کے والد فدا حسین خاں صاحب، اور چچا، عطا حسین خاں صاحب، ان کی والدہ اور چچی اور دیگر بھائیوں مظفر حسین خان اور عابد حسین خان وغیرہ کا وقتاً فوقتاً ذکر درج ہیں۔ یہ سب اندراج نجی واقعات کے ہیں۔ اس کے کچھ چند نمونہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ۴/ نومبر ۱۹۰۶ء، فدا حسین خاں صاحب، حیدرآباد دکن سے برائے علاج چند روز کے واسطے آئے اور بتاریخ ۶/ نومبر روانہ لکھنؤ ہوئے۔

(۲) ۱۸/ جنوری ۱۹۰۷ء، فدا حسین خاں کی طبیعت اچھی نہیں ہے، اس لیے مولوی یحییٰ صاحب کو طلب کیا، نبض دکھائی، نسخہ لکھوایا، مگر یقین نہیں ہے ان کا ارادہ سنا گیا ہے کہ دہلی جانے کا ہے، لیکن قوت کجا۔

(۳) ۲۳/ فروری ۱۹۰۷ء، فدا حسین خاں صاحب جو دہلی کو برائے علاج گئے تھے، سنا گیا کہ شب گذشتہ کو گھر بے نیل و مرام واپس آئے ہیں۔ میں اور غلام اکبر (یعنی میرے والد اکبر یار جنگ) دیکھنے پوچھنے کو گئے۔ انہیں بہت ضعیف دیکھا، گفتگو نہ کی۔ عطا حسین خاں سے حال سن کر واپس آئے۔

(۴) ۲۶/فروری ۱۹۰۷ء، آج فدا حسین خاں صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہے، بخار شدید ہے، ناامیدی کا ہجوم ہے اور یاس کا غلبہ۔

(۵) ۲۸/فروری ۱۹۰۷ء، ۷ بجے صبح کے عبد الغفار (میرے تایا) اور غلام اکبر (میرے والد) فدا حسین خاں صاحب کی عیادت کے واسطہ پتورہ کو گئے اور ۱۰ بجے دن کے واپس آئے۔ بیمار بدستور بیمار ہے۔

(۶) ۳/مارچ ۱۹۰۷ء قریب ۵ بجے شام کے فدا حسین خاں نے جان تسلیم بحق فرمائی۔ اِنَّ اللّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ؛ اللہ تعالیٰ بخشے اس کے گناہ۔

(۷) ۴/مارچ ۱۹۰۷ء، میری گھر والی، منوں بیگم تو کل شام کو ہی چلی گئی تھی، آج صبح بسواری ڈولی، چھوٹی بیگم اور دیگر عورتیں، فدا حسین خان کے گھر گئیں اور میں بھی گیا۔ ۱۲ بجے جنازہ اور دفن کیا گیا۔ پھر میں بیٹھا رہا، ظہر کی نماز پڑھی، بعد اس کے گھر آیا۔

(۸) ۵/مارچ ۱۹۰۷ء، صبح کو میں خود مل کر عطا حسین خاں صاحب برادر فدا حسین خاں وپسران کے پاس گیا، اور تین گھنٹہ بیٹھا رہا، پھر گھر واپس آیا۔

(۹) ۲۰/مئی ۱۹۰۷ء، پانچ بجے صبح عطا حسین خاں صاحب ملنے آئے، دیر تک بھائی متوفی کی باتیں کرتے اور روتے رہے۔

(۱۰) ۶/مارچ ۱۹۰۸ء، وقت ۱۱ بجے دن کے بی بی فدا حسین خاں مرحوم اور بی بی عطا حسین خاں صاحب، دو دو روپیہ کی شیرینی لے کر غلام اکبر کی منگیتر کے واسطے، چھتاں خان کے گھر آئیں۔ یہاں چھوٹی بیگم اور منوں بیگم کو بلایا اور ۴ بجے تک بیٹھ کر واپس گھر گئیں، صمدیانہ نے اچھی خاطر تواضع کری، دو دوپٹہ دیئے اور گوٹہ وغیرہ بھی دیا۔

(۱۱) ۳/جولائی ۱۹۰۸ء، وقت ۷ بجے دن کے فدا حسین خاں متوفی کے دو فرزند واسطے ملنے اور رخصت ہونے، منوں بیگم کے آئے۔ کہا کہ ہم کل کالج اٹاوہ کو جاویں گے، ایام تعطیل میں آئیں گے، اور پھر وہ سعادت مند دونوں واپس ہوئے۔

(۱۲) ۸/اپریل ۱۹۱۰ء، مظفر حسین خاں، پسر فدا حسین خان مرحوم، دعوت جمعہ تھا۔ میں بندہ احمد شیر شریک ہوا۔ شام کو مظفر حسین خان کے ہمراہ گیا۔ جان عالم خان صاحب کے گھر کو۔ پلاؤ و قورمہ معہ شیرمال و کباب دیئے گیے۔

(۱۳) ۲۵/اپریل ۱۹۱۱ء، مظفر حسین خان معروف جمّا، پسر رشید فدا حسین خاں مرحوم نے کہا کہ میں امتحان مدرسہ کا تو دے دیا ہوں، سالانہ باقی ہے جو مارچ ۱۹۱۲ء میں ہوگا، مجھے سب لوگ کہتے ہیں کہ تحصیل علوم اب چھوڑ کر اپنا دنیاوی کاروبار دیکھو اور خود انتظام کرو، لیکن ہنوز میں بالغ نہیں ہوں، اس لیے مجبور ہوں۔

(۱۴) ۱۸/جولائی ۱۹۱۱ء مظفر حسین خاں و عابد حسین خاں، ہر دو برادر، پسران فدا حسین خاں آئے، کہا کہ کالج علی گڑھ میں اب تین ماہ کی تعطیل ہے، اس لیے ہم آئے ہیں۔

(۱۵) ۱۹/اپریل ۱۹۱۳ء برخوردار ذاکر ولد فدا حسین خان مرحوم و مغفور کا نکاح نورچشمی پتلی دختر یونس خان متوفی سے عبدالحافظ خان صاحب ولی نے مولوی یحیٰی صاحب سے پچیس ہزار روپے مہر مقرر کرا کے کرادیا، اور لڈو تقسیم ہوئے۔ مگر دلہن اس وقت رخصت نہیں کی گئی، پھر یہ سنا کہ ذاکر حسین خاں کو پانچ گنیاں خوش دامن نے دیں۔ اس موقع نکاح میں بندہ موجود تھا۔

عبدالغنی

ذاکر صاحب بحیثیت گورنر

۱۹۵۷ء میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم گورنر ہو کر بہار آئے تو یہاں کی سب سے مشہور اور دیرپا وزارت قائم تھی۔ ڈاکٹر سری کرشن سنہا جو آزادی کے بعد ریاست بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے تھے، ایک بار پھر، ملک کے دوسرے عام انتخابات کے بعد اپنی وزارت بنا چکے تھے۔ اس بار وزارت کی نمبر دو شخصیت ڈاکٹر انوگرہ نرائن سنہا نے ان سے قیادت کا مقابلہ بھی کیا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ ذاکر صاحب کے پٹنہ آنے کے چند ہی روز بعد ڈاکٹر انوگرہ نرائن سنہا کا انتقال ہو گیا اور وزارت کی معینہ مدت کے دوران ہی ڈاکٹر سری کرشن سنہا بھی دنیا سے رخصت ہو گئے، تب ریاست کی تیسری اہم شخصیت شری بنودا نند جھا وزیر اعلا ہوئے۔ اس طرح ذاکر صاحب کو بہار کی گورنری کا جو عہد ملا وہ ملک کے ساتھ ساتھ ریاست کے بھی بہترین ایام کا دور تھا اور جنگِ آزادی کی رہنمائی کرنے والے قد آور اشخاص ہی ریاست میں نمایاں نیز منصبِ وزارت پر فائز تھے۔ سماج میں عام طور پر ایک سکون تھا اور نئی تعمیر و ترقی کے ولولے بھی تازہ تھے، انفرادی و اجتماعی زندگی میں اخلاقی قدروں کا پاس و لحاظ تھا لہٰذا نہ تو سیاست میں کوئی بحران پیدا ہوا نہ معاشرے میں کوئی الجھن۔ چنانچہ ریاست کے عوامی مسائل و مطالبات بہت زیادہ نہیں تھے۔ اور گورنر کے سامنے مشکلات کم سے کم آتی تھیں راج بھون ایک پُر آسائش جگہ تھی۔ جہاں بالعموم رسمی طور پر حکومت کے معاملات ایک معمول کے مطابق آتے تھے اور بہ آسانی طے ہو جاتے تھے۔

ذاکر صاحب کے وقت تک گورنمنٹ ہاؤس، جو انگریز گورنروں کا کرّ و فر دیکھ چکا تھا، عام

زندگی سے بالکل الگ تھلگ صرف فرماں روائی کا مرکز تھا، اجتماعی سرگرمیوں کی لہریں اس گوشہ عافیت تک کم ہی پہونچتی تھیں۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس ایوان اقتدار میں قدم رکھتے ہی اس کا انداز و اسلوب بدل دیا۔ ان کی دلچسپیوں کے سبب راج بھون ایک تہذیبی مرکز بن گیا جہاں دفاتر کے اعلا حکام کے ساتھ ساتھ ماہرین تعلیم، دانشوروں، ہنرمندوں، ادیبوں اور شاعروں کا مرجعہ ہونے لگا، علم و ادب اور دیگر سماجی سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والے نمایاں ترین افراد راج بھون میں بہ کثرت آنے جانے اور دعوتیں کھانے لگے اور خود گورنر صاحب بھی شہر اور صوبے کی سماجی محفلوں میں بہت زیادہ شریک ہونے لگے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ذاکر صاحب بہار کے پہلے عوامی گورنر تھے۔ جن سے ہر فرقے، طبقے اور حلقے کے لوگ انس و الفت محسوس کرنے لگے۔ ان کی دل کش شخصیت، علمی وقار اور شائستہ گفتگو نے لوگوں کے دل موہ لیے۔ ایک بار میں نے انھیں گورنمنٹ طبی کالج کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا اور سُنا۔ وہ اپنے سرو قد کے ساتھ شیروانی ٹوپی اور چست علی گڑھی پاجامہ پہنے ہوئے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی طرح، مشرقی تہذیب کا دل کش نمونہ نظر آرہے تھے ان کی تقریر بہت رواں، سلیس اور شیریں تھی جو ہر سننے والے کے دل پر اردو زبان کی فصاحت و بلاغت کا نقش قائم کر رہی تھی۔ یہ ایک مختصر، مرتب اور موثر تقریر تھی۔ جس میں نکتہ آفرینی کی بصیرت اور خوش مذاقی کی چاشنی دونوں ہی تھیں۔ اس کا سارا جادو الفاظ و معانی پر قائم تھا۔ دست و بازو کی حرکات کا دخل کم سے کم تھا۔ مقرر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرزہ تھا۔ جس پر شاید کچھ نکات درج تھے۔ وہ روانیِ تقریر میں ادنا سا خلل ڈالے بغیر، کبھی کبھی ایک اچٹتی سی نظر اس پُرزے پر ڈال لیتا تھا، اس نظر کی گرفت بھی غور سے دیکھنے والے ہی کر سکتے تھے، ورنہ مقرر کی انگلیوں میں یہ پرزہ یوں ہی سا نظر آرہا تھا۔ جب تک ذاکر صاحب بولتے رہے، ہر شخص محوِ سماعت رہا، چہروں پر ایک شادمانی سی جھلک رہی تھی، جیسے وہ تقریر کی لذت پر غالب کے بقول سوچ رہے ہوں۔ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"، تقریر میں کوئی للکار، یا گھن گرج نہیں تھی، بس ایک نرم خرام جوئے رواں کی مترنم سی کیفیت تھی۔

ذاکر صاحب نے اپنے وسائل اقتدار سے علم و ادب کی خاصی سرپرستی کی۔ انھوں نے غالب پر تحقیقی کام کے لیے اردو کے مشہور محقق قاضی عبد الودود (مرحوم) کو محکمۂ تعلیم سے معتد بہ رقم دلوائی۔ اس سرکاری گرانٹ سے قاضی صاحب کے ادارۂ تحقیقات میں ایک

جان سی آگئی تھی۔ لیکن غالبیات کا وہ کام جس کے لیے پہلی قسط کے طور پر کچھ رقم دی گئی تھی، اور مزید کی توقع تھی، بہت آگے نہیں بڑھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر حکومت نے حسابات طلب کیے مگر وہ پیش نہیں کیے جا سکے۔ اس وقت جناب کلیم الدین احمد (مرحوم) ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنز (ڈی پی آئی) ہو چکے تھے۔ انھوں نے اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کلیم الدین احمد صاحب کی ملاقاتیں ذاکر صاحب سے ہوتی تھیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر اختر اورنیوی صاحب بھی ذاکر صاحب سے اکثر ملتے تھے اور کبھی کبھار جناب جمیل مظہری بھی، یہ سب لوگ ذاکر صاحب کا بہت احترام کرتے تھے اور وہ بھی ان حضرات کے قدرداں تھے۔

ایک عوامی واقعہ قابل ذکر ہے جو بہت دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر جناب محمد ایوب (ایڈوکیٹ) تھے۔ حکومت کے ساتھ انجمن کی رسا کشی شروع ہو گئی تھی۔ بہار یونیورسٹی سے ایک سرکلر جاری ہو گیا کہ اس سے تعلق رکھنے والے انجمن کے رکن و کارکن نہ بنیں۔ گورنر صاحب بہ جہت عہدہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ انجمن نے سرکلر کی واپسی کے لیے عوامی تحریک چلائی اور راج بھون میں بے شمار خطوط اس سرکلر کے خلاف موصول ہوئے۔ دیہاتوں کے کم پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں احتجاجی مراسلے بھیجے۔ ذاکر صاحب نے یونیورسٹی سے باز پرس کی تو اس نے لاتعلقی ظاہر کی، محکمۂ تعلیم نے بھی اس سرکلر کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اس موقعے پر ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ احتجاجی خطوط صحیح معنوں میں عوامی ہیں اس لیے کہ معمولی لوگوں نے بالکل معمولی لفظوں میں اپنے دل کی بات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں بعض خطوط کی بے ساختہ زبان کا حوالہ بھی انھوں نے دیا۔ اس طرح بعض شرپسندوں نے انجمن کے خلاف جو سازش کی تھی وہ ناکام ہو گئی۔

ذاکر صاحب بلاشبہ ایک مقبول و محبوب گورنر تھے اور حکام سے عوام تک سب ان کو پسند کرتے تھے۔ وزرا پر بھی ان کا اخلاقی اثر تھا۔ ممکن ہے کہ بہار کی گورنری کی اسی شان کے سبب، ہندوستان کا نائب صدر بنانے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو (وزیر اعظم ہند) کی نگاہِ انتخاب ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) پر پڑی ہو جس کے نتیجے میں صدرِ جمہوریہ کے منصبِ بلند تک پہونچنے کے لیے بھی راستہ ہموار ہو گیا۔ اس طرح ذاکر صاحب کی بہار کی گورنری، ریاست اور ملک دونوں کے لیے اہم ثابت ہوئی۔

تارا چند

ذاکر حسین (خراجِ عقیدت)

ڈاکٹر ذاکر حسین کا ملک کے اُس بلند ترین اور انتہائی معزز منصب کے لیے انتخاب ہوا ہے جس پر کوئی بھی ہندوستانی شہری فائز ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی صدارت جیسے بلند منصب پر فائز ہونا اُن کی ممتاز ہر دلعزیزی کا اعتراف بھی ہے اور اس بات کا اعلان بھی کہ ان میں ہندوستانی عوام کی نمائندگی کی صلاحیت ہے۔

ہر پانچ سال کے بعد اس عہدے کے لیے انتخاب کرنے والے دراصل بڑا ضروری کام کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے ہیں جو یہ دشوار اور اہم فرض انجام دے سکے۔ وہ تمام معقول لوگ، جنھیں تعصب نے اندھا نہیں کر دیا ہے، اس حقیقت سے اتفاق کریں گے کہ ۱۹۶۷ء میں انتخاب کرنے والے اس سے بہتر اور مناسب تر انتخاب کر نہیں سکتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی طویل سرگرمیوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ان میں کردار اور ذہن کی وہ تمام صفات موجود ہیں جو اس عہدے پر فائز ہونے والے میں بدرجۂ اتم موجود ہونا چاہئیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مخلص استاد کی حیثیت سے کیا۔ اقتدار اور منصب کی ہوس سے بالا ہو کر وہ ایک ایسے قومی ادارے کی تعمیر میں جٹ گئے جہاں صرف محنت اور قربانی اور مقصد سے لگن کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے جس علمی لیاقت کی ضرورت تھی اس سے وہ پوری طرح بہرہ ور تھے۔ ایک مثالی استاد کے لیے نوجوانوں سے محبت کے ساتھ ان کی اخلاقی اور ذہنی نشو و نما میں بھی دلچسپی لینا ضروری ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ساری شفقت اور پدرانہ توجہ اپنے شاگردوں

کی ضرورتوں کی تکمیل میں صرف کی اور یہ بھی اس طرح کہ ان کے شاگرد اُن سے پیار بھی کرنے لگے اور ان کا احترام بھی۔ انھوں نے منتظم اور سربراہ کی حیثیت سے دلّی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اپنی اعلا ترین صلاحیتیں صرف کیں۔ اپنے تدبّر سے انھوں نے اس ادارے کی ابتدائی زندگی کی مشکلات پر قابو پایا اور دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کے شبہوں کے باوجود اسے مضبوط اور معتبر بنیادوں پر قائم کر دیا۔

تعلیم کے شعبے نے انھیں اس بات کا موقع دیا کہ وہ ملک کو اپنی صلاحیتوں سے متاثر کر سکیں۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کا جو تصوّر دیا تھا، وہ ایک ایسے شخص کا منتظر تھا جو اس کے لیے نظریاتی بنیادیں بھی فراہم کرتا اور اسے عملی شکل بھی دیتا۔ گاندھی جی کا تصوّر تشریح وتنظیم کے علاوہ اس بات کا بھی طالب تھا کہ کوئی اسے عملی دنیا کی چیز بنا دے۔ یہ سارا کام ذاکر صاحب کی کوششوں سے انجام پایا۔ انھوں نے اپنی لیاقت اور عملی تجربے کی مدد سے اس منصوبے کو ملک کے لیے قابلِ قبول بنا دیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم نے کئی پیچیدہ اور مشکل مسئلے پیدا کر دیے تھے۔ اُن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی مسئلہ تھا۔ یہ یونیورسٹی مسلم لیگ کی سیاست کا مرکز بھی رہ چکی تھی اور اس کے علیٰحدگی پسندانہ پروپیگنڈے سے منسلک بھی۔ جب ملک تقسیم ہوا تو یہ یونیورسٹی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوگئی، جس کے لیے وہ کسی طرح بھی تیار نہیں تھی۔ ملک کی تقسیم اس کے لیے ایک سانحہ تھی، اور اس کا اپنا مستقبل تاریکی میں گم ہو چکا تھا، لیکن حکومتِ ہند نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اس تعلیمی ادارے کو نہ تو منتشر ہونے دیا جائے، نہ برباد۔ لیکن اسے ایک تجربہ کار اور ہوشمند رہنما ہی بچا سکتا تھا اور نئی زندگی سے ہمکنار کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس مشکل اور نازک کام کے لیے انتخاب ہوا۔ یہاں کے مسلمان طرح طرح کے شکوک اور مایوسی کا بری طرح شکار ہو رہے تھے۔ یونیورسٹی بھی اپنے مقصد اور سمت کا احساس کھو چکی تھی۔ حال اور ماضیِ قریب کے درمیان ایک نہ پٹنے والی خلیج حائل تھی۔ زخمی دلوں اور بیمار روحوں سے اس کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کی تعمیرِ نو کر سکیں گی۔ یہ ایک چیلنج تھا، جسے ذاکر صاحب نے قبول کیا۔ ان کی دلنواز شخصیت کی گرمی سے بادل چھٹنے لگے۔ ان کے ناقابلِ شکست جوش اور جذبے نے طالب علموں اور استادوں

کے حوصلے بلند کر دیے۔ یونیورسٹی کے وہ در و دیوار جو ویرانی اور عبرت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ پھر سے نوجوانوں کی بڑی تعداد میں آمد سے گونجنے لگے۔ زخموں کے منہ بند ہو گئے اور امید کی شعاؤں نے ان راستوں کو منور کر دیا، جو روشن مستقبل کی طرف جاتے ہیں۔ اس ساری تبدیلی کے روحِ رواں تھے ذاکر حسین، یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر۔

وائس چانسلری سے بہار کی گورنری تک ان کا سفر، دراصل طوفان خیز سمندر سے پُر سکون اور شفاف ساحل تک پہنچنے کی داستان ہے۔ صوبے کے گورنر کو بہت سے سماجی کام کرنا ہوتے ہیں۔ عوامی بہبود کے بہت سے منصوبوں کو سہارا دینا ہوتا ہے۔ یہ بھی اس کے فرائض میں ہے کہ وہ بہت سے اچھے مقاصد کو آگے بڑھائے اور سماجی فلاح کی خاطر کام کرنے والے اداروں اور افراد کی ہمت افزائی کرے۔ وہ متعدد شاندار تقریبات کا مرکز ہوتا ہے۔ اسے بہت سی علمی مجلسوں کا افتتاح کرنا ہوتا ہے، کانفرنسوں اور جلسوں کی صدارت کرنا ہوتی ہے، صنعتی کارخانوں کا سنگ بنیاد رکھنا ہوتا ہے، سڑکوں پُلوں اور بجلی گھروں کا افتتاح کرنا ہوتا ہے۔ غرض کہ ایسی سیکڑوں تقریبات میں اس کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے۔

وہ انتظامیہ کا آئینی سربراہ ہوتا ہے۔ بہت سے فریق اس کی ثالثی، مشورے، تنبیہ اور سفارش کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ریاستی سرکار اس بات کی آئینی طور پر پابند ہے کہ وہ اس سے صلاح و مشورہ کرے۔ بہت سے اثرات، مختلف ذریعوں سے، مرکزی اور ریاستی سرکار کے باہمی تعلق کو برقرار رکھتے ہیں۔ گورنر مرکزی حکومت کی آنکھ اور کان ہوتا ہے؛ وہ اسے اس سارے مدّوجزر سے باخبر رکھتا ہے جو اس ریاست میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ریاستی سرکار اسی کے وسیلے سے اپنی ضرورتیں اور مطالبات مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ان دونوں کاموں کے لیے انتہائی ہوشمندی اور تدبّر کی ضرورت ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب یہ معلوم ہو کہ واقعی گورنر کے اختیارات کتنے کم ہیں اور جو اختیارات اسے حاصل بھی ہیں، وہ کسی درجہ آئینی حدود کے پابند ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے مزاج کی دلنوازنرمی، خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی اور مہارت نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ انھیں اوصاف کی مدد سے انھوں نے بہت سی مشکلوں پر قابو پایا ہے اور بہتوں کے دل جیتے ہیں۔

دوسرا کام جو ان کے سپرد کیا گیا، وہ یکسر مختلف تھا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی جس میں وہ داخل ہوئے تھے۔ ہندوستان کی نائب صدارت قانونی اور انتظامی فرائض کا عجیب وغریب مجموعہ ہے۔ نائب صدر جمہوریہ راجیہ سبھا کا صدر ہونے کے ساتھ ایک ایسا آئینی عہدیدار بھی ہوتا ہے جس کا کام صدر کی عدم موجودگی میں اس کی نیابت بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اور بھی بہت سے تقریبی فرائض انجام دینا ہوتے ہیں۔

راجیہ سبھا کی صدارت بذاتِ خود بہت تھکا دینے والی اور مشکل مصروفیت ہے اس میں ہر وقت صدر کے مزاج اور ذہانت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ اجلاس کے دوران میں کم از کم دو گھنٹے صدر کو صبر آزما غیر یقینی کیفیت سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ راجیہ سبھا کی حالت ہمیشہ موجیں مارتے ہوئے سمندر کی سی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تھوڑے وقفے کے لیے اس کی سطح کچھ ہموار اور پرسکون ہو جاتی ہے، ورنہ عام طور پر شور اور ہیجان، غصے اور برہمی، نفرت اور شبہات کے طوفان آتے رہتے اور اس کی سطح پر لہریں پیدا کرتے رہتے ہیں ــــــ ایسی لہریں جو کبھی کبھی بہت بلند ہو جاتی ہیں۔ راجیہ سبھا رائے عامہ کے مختلف طبقوں اور پارٹیوں کے نظریاتی اختلافات اور مزاجی غیر ہم آہنگیوں کا آئینہ ہے بہت دلچسپ مگر کم دل کش مطالعہ ہے اثرات اور دلائل کی کشاکش کا۔ یہاں حملے ہوتے ہیں، ان سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اس کے بعد پھر حملے کیے جاتے ہیں۔ غرض یہاں ایک کبھی ختم نہ ہونے والی سرد جنگ چلتی رہتی ہے۔ یہی جنگ کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری طور پر گرم لفظی جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

جب صورت حال یہ ہو، تو صدر کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی وہ خود بھی بعض ممبروں کے ساتھ رسہ کشی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ برہمی کو ختم کرنے اور گرم فضا کو پرسکون بنانے میں اکثر کامیاب ہوتا ہے مگر ہمیشہ نہیں۔ ایسے حالات میں وہ پارٹیوں کو سمجھاتا ہے، ان سے بہتر انداز نظر اور رویے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مقرر کو سمجھاتا ہے اور کبھی کبھی اس کی منت سماجت بھی کرتا ہے اور اگر یہ تمام طریقے ناکام ثابت ہوں، تو وہ کیا کرے؟ ہٹ دھرم اور ہنگامہ خیز مقرر ہے کہ چپ ہی نہیں ہوتا، بولے ہی چلا جاتا ہے، ہاتھ ہلائے جاتا ہے، بولنے پر اڑا ہوا ہے اور صدر کی ایک نہیں سنتا۔ اس کے بعد بس قیامت کا سماں سامنے آ جاتا ہے چیخ پکار شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ بولتے ہیں اور پورے

بسم سے بولتے ہیں۔ کچھ ممبر ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگتے ہیں؛ اور پھر 'آرڈر'، 'آرڈر' کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ کوئی صاحب صدر کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اُس ممبر کا نام پکاریں، جو اس صورتِ حال کے لیے ذمہ دار ہے اپنا نام سن کر وہ ممبر عام طور پر ایوان سے باہر چلا جاتا ہے اور پھر سکون کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ہنگامہ خیز ممبر کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بعد بھی انتشار ختم نہیں ہوتا۔ کئی جذباتی قسم کے مقرر صدر کے حکم کے باوجود ایوان سے باہر جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ صورتِ حال اور بگڑ جاتی ہے اور یوں سخت اور موثر اقدام ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں صدر کے پاس ایک ہی حربہ رہ جاتا ہے کہ مارشل اس مقرر کو بیک بینی و دوگوش ایوان سے باہر دھکیل دے۔ ایوان کے لیڈر کے مشورے سے ایوان ایسے ممبر کو کسی چھوٹی یا بڑی مدت کے لیے معطل کر سکتا ہے اس کے نکل جانے کے بعد ایوان میں ایجنڈے کے مطابق کارروائی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

بدقسمتی سے گزشتہ چند برس سے راجیہ سبھا ایوانِ اکابر کی حیثیت سے اپنا کردار کھوتی جا رہی ہے، جہاں سکون اور ٹھنڈے دل و دماغ اور جذباتی اور مزاجی فشار کے بغیر مسائل پر بحث کی جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، وہ بے انتہا بحرانی دور ہے۔ قانون ساز ایوان تو صرف آئینہ دار ہیں ان تضادات اور تنازعوں کے جو ہندوستان کے سماجی اور سیاسی عمل کو بُری طرح متاثر کر رہے ہیں۔ ماضی مستقبل سے دست و گریباں ہے، حال انتہائی بے بسی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پرانی فرسودہ اور از کار رفتہ قدریں ہمارے سیاسی نظام سے چمٹی ہوئی ہیں اور اس سے الگ ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ نئی قدریں اپنا قدم جمانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ کل کے حاوی سماجی گروہ اپنی پچھلی حیثیت سے محروم ہو رہے ہیں دبے ہوئے طبقے ابھر رہے ہیں۔ نمایندہ جمہوریت میں انتخاب کا جو طریقہ رائج ہے، اس نے گاؤں والوں کو اور بھی متحرک کیا ہے۔ ووٹ کی قیمت اور طاقت کا احساس برابر بڑھ رہا ہے۔ لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ ہمارا قومی اقتصادی نظام بھی انتشار کے دور سے گزر رہا ہے۔ زراعت پر زور دینے کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کے طریقۂ پیداوار میں تبدیلی

کی وجہ سے کاشتکار کو اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے اور وہ بہتر معیارِ زیست کے لیے کوشاں ہیں۔ صنعت، ذرائع رسل و رسائل میں تبدیلیاں، آبپاشی کی دیو پیکر کلیں اور بجلی کی طاقت کا استعمال، یہ تمام چیزیں سماجی اور ذہنی حرکت اور تیز روی کا سبب بن رہی ہیں۔ شمالی سرحد کے اُس پار سے ملک کی سالمیت اور آزادی کو خطرہ لاحق ہے۔ ہر وقت کی بے خوابی اور چوکنا رہنے کی وجہ سے دماغی نظام پیچیدہ شکل اختیار کر گیا ہے اور ہندستانی ذہن کو متاثر کر رہا ہے۔ کئی صدیوں کے بعد آج ہندستان پہلی بار بہت سارے طوفانوں سے گھرا اکھڑا ہے۔ یہ صورتِ حال بہت سے دوررس اثرات کی حامل ہے۔

ایسی صورت میں اگر ملک الجھن، جذباتیت، بے اطمینانی اور بغاوت کا شکار ہے، تو تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اقتصادی، سماجی اور سیاسی بُحران کے زمانے میں کسی معقول رویّے کو برقرار رکھنا جمہوری کارکردگی کے لیے ضروری سہی، لیکن ایسی فضا میں جس پر اتنے سارے جذباتی دباؤ پڑ رہے ہوں، اس رویّے کا باقی رکھنا بہت دشوار ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بے پایاں ہمت اور جرأت کے ساتھ آئے دن کی آزمائشوں کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ کبھی کبھار ان کے ذہنی سکون میں خلل بھی پڑا ہے، پھر بھی انھوں نے ہمیشہ خاص وقار کے ساتھ کام کیا اور ایوان کے کام کو بلا وجہ خراب نہیں ہونے دیا یہی وجہ تھی کہ جب وہ اس کے صدر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو ایوان کے سبھی گروہوں کے نمایندوں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے یہ بات ظاہر کر دی کہ کس حد تک برسرِ اقتدار پارٹی اور مخالف پارٹیوں کے ممبر ذاکر حسین صاحب کی انصاف پسندی اور ایوان کو چلانے کی صلاحیت کے معترف ہیں۔

اب جب کہ انھیں ملک کے اہم ترین منصب کے لیے منتخب کیا گیا ہے، ان کی ذمہ داریاں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں، اب وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے ہیں۔ ان کے اقوال اور اعمال کو اس ملک میں اور اس کے باہر بھی توجہ سے سنا اور دیکھا جاتا ہے۔ صدر کی زندگی کھلی ہوئی کتاب کی سی ہے۔ اس کے وقت کا حساب ہوتا ہے اور اس کا پروگرام پہلے سے متعین۔ اس کے فرائض بھاری اور وقت لینے والے ہوتے ہیں۔ اور اس سے بھی کہیں زیادہ تھکا دینے والا کام ریاست کی مناسب کارکردگی کی رہنمائی کرنا ہے۔

صدر کے آئینی اختیارات کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ حقیقت ہے

کہ وہ حکومت کے امین اور مشیر کی حیثیت سے اپنے شانوں پر بہت بڑی اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ وزیرِ اعظم اور اس کے رفقا سے اس کی بات چیت صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہے۔ صدر کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ ملک کے تمام معاملات کی واقفیت حاصل کرے اور اسے اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ ان معاملات پر آزادی سے رائے دے۔ اس کی رائے کی اس وجہ سے بھی خصوصی اہمیت ہے کہ وہ روزمرہ کے سیاسی ہنگاموں سے الگ رہتا ہے اور اُسے شخصیات کی چپقلش کے دلچسپ مشغلے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ حل طلب مسائل کے دباؤ اور رایوں کی کشاکش سے بھی ماوراء ہوتا ہے۔ اس کی رائے کی معروضیت مبنی ہوتی ہے، ماضی کے تجربے، عواقب سے آگہی اور وسیع تر قومی مفاد کے احساس پر۔ اس کی رائے سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے لیکن اس کی رائے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ صدر کی شخصیت، دانشمندی اور معقولیت حکومت کے خیالات کو بیحد متاثر کرتی ہے۔ حکومت کے اقدامات اور اسکی پالیسیوں کی کامیابی کا انحصار بھی بڑی حد تک اس کی رایوں پر ہوتا ہے اور اس کی رایوں کی مدد سے بہت سے ناخوشگوار حالات ختم ہو جاتے ہیں، جو پیدا وار ہوتے ہیں، وقتی اور ذاتی اختلافات اور ہنگامی ہیجان خیزیوں کے۔ صدر انتظامی مشین کے کل پرزوں کو اپنی توجہ سے ٹھیک کر کے اسے اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ ناہموار زمین پر بھی چل سکے۔ وہ اپنی دانشمندانہ معاونت سے بہت سی ناخوشگواریوں کے اثرات کو کم کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ ملک کی خارجیہ پالیسی پر بھی مفید طریقے سے اثر انداز ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اسے بیرونی ممالک کے سفر کے دوران میں وہاں کے سربراہوں سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ وہ ان کی اپنے ملک کے مسائل کے بارے میں رائے دریافت کر سکتا ہے اور یوں اپنے میزبانوں کے منصوبوں سے بھی باخبر ہو سکتا ہے۔ اس کے الفاظ بدگمانیوں کو ختم کر کے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے راہ ہموار کر سکتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہنگامی حالات میں صدر، سماجی نظم و نسق برقرار رکھنے اور ملک کی سالمیت کی حفاظت کی خاطر حکومت کے تمام فوجی اور غیر فوجی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ ایسے خطرناک حالات میں (جن کا کوئی بھی خواہاں نہیں) صدر ملک کی قسمت کا واحد محافظ ہوتا ہے۔ عام حالات ہوں یا ہنگامی حالات یا سخت ضرورت

کے حالات، جو شاذ و نادر ہی رونما ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ علامت ہوتا ہے قومی اتحاد کی قوت، وقار اور قومی قوت کی۔ اس پر افتراق اور جماعتی گروہ بندیوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ آزمائشوں کے دور میں بھی اور عام حالات میں بھی اپنے محافظ بازو پھیلائے رہے اور آزادی، مساوات اور انصاف کے ان آدرشوں کی حفاظت کرتا رہے جو ہمارے دستور کی اساس ہیں۔

ان بلند اور قابلِ احترام آدرشوں کی حفاظت و تکمیل کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین اوصاف سے آراستہ ہیں۔ قدرت نے انھیں انتہائی فیاضی سے وہ تمام صلاحیتیں بخشی ہیں، جو کامیابی کی ضامن ہوتی ہیں۔ توازن، قوتِ فیصلہ، انسانیت دوستی، دانشمندی کے وہ اوصاف جو صدارت کے منصب پر فائز ہونے والے میں ہونا چاہئیں، سب کے سب ان کی شخصیت کے اجزا ہیں۔ ان اوصاف کو ان کے طویل تجربے سے پختگی ملی ہے۔ اگر ماضی کی کوئی ضمانت ہے تو ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ ان کا مستقبل کامیاب بھی ہوگا اور روشن بھی۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

———— ٭ ————

بی شیخ علی

ذاکر صاحب کے تعلیمی رجحانات

ذاکر صاحب کی ہستی ملک و ملت کے لیے قدرت کی عطا کردہ ایک عظیم عنایت تھی۔ ان کا کارنامہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر ہی نہیں بلکہ ایک ایسا تصور جس سے مقصد حیات حاصل ہو سکے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وقف کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ نسل انسانی پر خالق کی سب سے بڑی عنایت ذہن انسانی ہے۔ اسی ذہن کا کرشمہ ہے کہ آج انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ افلاک کی سیر کر رہا ہے۔ سمندروں کی تہہ چاٹ رہا ہے۔ تنکے کو توڑ کر برقی قوت کے حیرت انگیز نمونے پیش کر رہا ہے۔ دل کے بجھتے چراغ کو پھر سے اجاگر کرنے میں لگا ہے۔ عزرائیلؑ کے حکم کو بھی ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ ثابت کر رہا ہے کہ اگر اوپر خدائی ہے تو نیچے علم کی فرماں روائی ہے۔ ذاکر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اس دیش کے کروڑوں انسانوں کو علم کے زیور سے مزین کرنے کی تجویز ہے۔ اِن لوگوں کی شخصیت کو بہتر بنانے کا منصوبہ ہے۔ ان میں تخلیقی قوت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ ان میں اخلاقی قدروں کو ابھارنے کا طریقہ ہے۔ اور ان میں تہذیبی و تمدّنی اور انسانی شعور اجاگر کرنے کا سلیقہ ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت تک ہاتھ نہ آئے گا جب تک کہ انسان تعلیم کے جوہر سے مستفیض نہ ہو۔ اس لیے ذاکر صاحب نے تعلیم و تربیت کو زیست کا حاصل سمجھا اور اس کے فروغ میں کوشاں رہے۔ تعلیم و تربیت ہی ان کی زندگی کا اہم مرکز تھا جس کے گرد اُن کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلو گھومتے تھے۔ ان کا نام نامی آسمان علم و فضل پر ماہر تعلیم کی حیثیت سے ہی ہمیشہ درخشاں و تابندہ رہے گا۔

ذاکر صاحب کا تعلیمی فلسفہ بہت گہرا ہے۔ تعلیم معلومات کے خزانے کو اکٹھا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ معلومات کے خزانے کو پانے سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ اس کے صحیح استعمال کا طریقہ بھی وہ جانے۔ قارون کے پاس بھی خزانہ تھا۔ مگر اس سے نہ کسی کو فائدہ ہوا اور نہ اس کی عزت کہیں رہی۔ علم الگ شے ہے۔ اور تعلیم الگ شے۔ علم اگر موتی ہے۔ تو تعلیم اس موتی کو نگینہ میں جوڑنے کا عمل۔ علم اگر سائنس ہے تو تعلیم تکنالوجی۔ کتاب میں پڑھنا کہ گلاب میں خوشبو ہے الگ بات ہے لیکن چمن میں گلاب سونگھنا اور لطف اندوز ہونا الگ بات۔ ہمارے مکتبوں، مکاتب، مدراس اور کالجوں میں پڑھایا لکھایا جاتا ہے، تعلیم و تربیت نہیں ہوتی۔ تعلیم کا کام درس و تدریس سے کچھ مختلف ہے۔ یہاں ذہنوں کو مانجھا جاتا ہے اور ان میں تخلیقی قوت بیدار کی جاتی ہے، جیسا کہ دھات کو مقناطیس کے گرد گھما کر برقی قوت پیدا کی جاتی ہے۔ تعلیم و تربیت کے ذریعہ قدرت یہ چاہتی ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی گلاب کے رس سے شہد تیار کرتی ہے، یا گائے ہری گھاس سے امرت والا دودھ دیتی ہے، انسان بھی ایسی اخلاقی اقدار پیدا کرے جن سے وہ صحیح معنوں میں اس کرۂ ارض کا خلیفہ بن سکے۔

ذاکر صاحب کی تعلیم سے دل چسپی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ انہوں نے علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے میں ہی افلاطون کی شہرہ آفاق کتاب "جمہوری ریاست" PLATO'S REPUBLIC کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا تھا۔ گویا انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی تعلیم سے گہرا رشتہ جوڑ لیا اور اس میدان میں انہوں نے افلاطون کی اتباع کی۔ اُسی کا کہنا ہے کہ تعلیم وہ روشنی ہے جس سے انسانوں کے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ صرف روشنی کی موجودگی سے کام نہیں چلتا۔ دل و دماغ کی تاریکی بھی دور کرنی ہوگی۔ یہ عمل تعلیم سے پورا ہوگا۔ علم کا رشتہ تعلیم و تربیت سے ہے۔ تعلیم مقصدِ حیات ہے۔ تربیت شاہراہ ہے اور علم مسافت طے کرنے کا آلہ۔ اگر ہمارے پاس موٹر گاڑی موجود ہو بھی تو اس کے یہ مطلب نہیں کہ ہم منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ اس کے لیے مسافت بھی طے کرنی ہوگی۔ کسی چیز کی موجودگی سے ہی افادیت حاصل نہیں ہوتی، اس کی اصلیت کا جوہر بھی نکالنا ہوگا۔ جیسا کہ جڑی بوٹیوں سے حکیم نسخے تیار کرتے ہیں۔ افلاطون کا ایک

اور نکتہ ذاکر صاحب کے تعلیمی فلسفہ میں پایا جاتا ہے۔ علم کی تحصیل صرف برائے تبدیلی ہی نہیں۔ یہ تبدیلی مضر بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ایٹمی قوت سے فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ اگر ایٹمی ہتھیار تیار کر دیا جائے تو نقصان ہی نقصان ہو گا۔ اس لیے تبدیلی یا تکنالوجی کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کی بھلائی، فلاح و بہبودی، حمیت و ہمدردی اور انسانیت ہے۔

ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم کے تین درجے ہیں۔ پہلا معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کرنا، دوسرا ان معلومات کا جوہر اخذ کرنا، اور تیسرا اس جوہر سے اخلاقی شخصیت کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ تینوں عمل ظہور میں آئے ہوں تو انسان تعلیم یافتہ کہلایا جا سکتا ہے۔ تعلیم کی تین کڑیاں علم، عمل، اخلاق ہیں۔ علم حالات کو جاننے کو کہتے ہیں عمل حالات کے جوہر کو اخذ کرنے کو کہتے ہیں اور اخلاق اس عمل کو کہتے ہیں جس سے انسانیت بنتی ہے۔ تصوف میں ان درجوں کو علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کہتے ہیں۔ تحصیل علم کا مقصد تلاش حق ہے اور تلاش حق کا مدعا خدمت خلق ہے۔ تلاش حق تین منزلوں میں پار کر لے جاتی ہے وہ ہیں، خود بینی، جہاں بینی اور خدا بینی۔ خدمت خلق کا درجہ پانے کے لیے بھی تین مرحلے حل کرنے ہوں گے وہ ہیں نفس امارہ، نفس لوامہ و نفس مطمئنہ۔ اگر تصوف کو یا علم عرفان کو اس طرح درمیان میں نہ لایا جائے اور صرف اخلاقی شخصیت زیر بحث ہو تو علم عمل کا مقصد انسانیت کے قدریں حاصل کرنے پر مشتمل ہو گا۔ ذاکر صاحب کے نزدیک یہ قدریں راستبازی و ایمان داری، حق و انصاف، رحم و کرم، حمیت و ہمدردی، صدق و صفا، محبت و مروت ہیں۔ اگر ایک تعلیم یافتہ میں یہ قدریں نہ ہوں تو اس کی ڈگریاں بیکار ہیں۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی فلسفہ کا دوسرا اہم جزیہ ہے کہ وہ فرد کی تعلیم کو تعلیم نہیں سمجھتے اصلی چیز و ابتدائی چیز سماج ہے۔ ذہنی زندگی جو تعلیم کا اصل مقصد ہے بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آسکتا ہے مگر پورے انسان کی حیثیت سے، جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی کسی اور زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لیے ذہنی زندگی

میں سماج کا وجود لازمی ہے۔ درخت میں ہر ڈالی اور ہر پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے ڈالی یا پتی ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا، مگر درخت سے الگ ہو کر ڈالی اور پتی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک تو بدلتے رہنے کا اور دوسرا اپنے حال پر قایم رہنے کا۔ بیج پودے میں تبدیل ہوگا اور پودا درخت میں، پھر پھول کھلیں گے اور پھل نمودار ہوں گے۔ طفلی سے بچپن، بچپن سے جوانی اور جوانی سے بوڑھاپا۔ ہر وقت تبدیلی، ہر جگہ تبدیلی، ہر حال میں تبدیلی، لیکن تبدیلی اپنی خصوصیت نہ کھوئے گی۔ نیم کے بیج سے آم کا پھل نہ ملے گا۔ مرغی کے انڈے سے بطخ نہ نکلے گا۔ اسی طرح قدرت کا تقاضہ ہے کہ آدمی بھی انسان بنے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سماج اپنی تعلیم کا نظام درست کرے۔ سماج جس قسم کا پھل بچوں کے ذہن میں بوئے گا اسی قسم کا پھل پائے گا۔

ذاکر صاحب کا فلسفہ کہ ذہنی زندگی کسی اور ذہنی زندگی ہی سے بیدار ہوتی ہے بڑا معنیٰ خیز ہے۔ یہ خیال سارے علوم کی بنیاد ہے۔ تہذیب و تمدن کے چراغ اسی سے روشن ہیں۔ کنفیوشیس کی ذہنی زندگی چین کی تہذیب کا باعث بنی۔ سقراط، بقراط، افلاطون، ارسطو کا ذہن یونان کی تہذیب پر حاوی رہا۔ گوتم بدھ کی ذہنی زندگی بدھ مذہب کے لیے مشعل راہ بنی۔ حضرت عیسیٰ کی ذہنی زندگی عیسائیت میں تبدیل ہو گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی زندگی غار حرا کی تجلی سے نکل کر عروج اسلام کا باعث بنی۔ ہند کے رشیوں منیوں کا ذہن یہاں کی تہذیب و تمدن کی داغ بیل کا سبب بنا۔ غرض کسی اور کی ذہنی زندگی ہی تعلیم و تربیت کا سرچشمہ ہے۔ استاد کا کام صرف یہ ہے کہ شاگردوں کو کسی اور کی ذہنی زندگی سے روشناس کرا دے۔ اس در باب افلاطون نے ایک بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ تعلیم و تربیت کے کاموں کو یوں سمجھنا چاہیے کہ معلم و طلبا سب کے سب ایک اندھیرے غار میں پڑے ہوئے ہیں۔ کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسی صورت میں استاد کا کام صرف یہ ہے کہ شاگردوں کا رخ اس طرف کر دے جہاں غار کے دہانے سے روشنی کی جھلک نظر آتی ہو۔ استاد شاگردوں کو بصیرت نہیں بخش رہا ہے۔ لڑکے خود آنکھ رکھتے ہیں۔ استاد کا کام صرف

یہ ہدایت ہے کہ صرف اس طرف دیکھو جس طرف سے روشنی آرہی ہے۔ یہ روشنی پہلے سے موجود ہے۔ یہ آفتاب ہمیشہ سے درخشاں ہے۔ تعلیم کا بھی یہی حال ہے کہ تمدنی اشیاء میں روشنی موجود ہے۔ فلسفہ، ادب، سائنس، مذہب، اخلاقیات، غرض تمدن کی ہر شئے میں انسانی کمالات، خیالات، جذبات، احساسات، چھپے ہوئے ہیں، اُن کمالات کی طرف استاد بچوں کا ذہن مبذول کراتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ان خیالات و کمالات کو وہی زندگی بخشے جو مصنف کے ذہن میں ان خیالات کے اظہار کے وقت رونما ہوئی تھیں گویا یوں سمجھیے کہ استاد ریڈیو کا وہ پرزہ RECEIVER ہے جو کوسوں دور کسی کی تقریر کو بعینہٖ پیش کر رہا ہے۔ یہ تقریر استاد کی نہیں کسی اور کی ہے۔ غرض ذاکر صاحب ذہن کی بیداری کو تعلیم سے تعبیر کرتے ہیں۔

تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ استاد سے ہٹ کر خود طالب علم کا ذہن ریڈیو کاسٹ بن جاتا ہے۔ جو پچھلی تمام ذہنوں کی آواز کو صرف سُنتا ہی نہیں بلکہ سمجھتا، پرکھتا، اور برتتا بھی ہے۔ اور ان آوازوں کی تشریح بھی کرتا ہے اور نئے معنٰے پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ندرت و فکر اس کے آلہ کے اہم پرزے ہیں۔ لیکن یہ کام صرف ذہن کی پرورش سے ہی ہوسکتا ہے۔ یہ پرورش ذہن کو غذا پہچانے سے ہوتی ہے۔ ذہن کو غذا ملتی ہے تمدن سے، اور تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے مثلاً سماج کے علمی نظام سے، سماج کے فنون سے، سماج کے اصولوں سے، سماج کے مذہب سے، سماج کی صنعت سے، سماج کے اخلاق سے، سماج کے قانون سے، سماج کے رسم رواج سے، سماج کی بڑی شخصیتوں سے اور سماج کے مدرسوں سے غرض ذاکر صاحب کے نظام تعلیم میں فرد کی زندگی سماج کے جوہر قبول کرنے میں مضمر ہے۔

ذاکر صاحب کا تعلیمی فلسفہ آسانی سے نہیں بنا۔ اس کے لیے انہیں جدوجہد کرنی پڑی۔ علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے سے لے کر صدر ہند بننے کے بعد بھی یہ فلسفہ ان کی زندگی کا محور رہا اور اسی کاوش کا نتیجہ تھا کہ وہ آفاقی شہرت کا حامل بنا۔ انہوں نے ساری دنیا کے اور سارے زمانوں کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ اپنے فلسفہ میں سمو دیا ہے۔ افلاطون سے لے کر انگلستان کے

فرانسس بیکن، امریکہ کے ڈیوی، جرمنی کے کرشنز ٹیز، فرانس کے سارترے اور اپنے دیش کے گاندھی جی کے تجربات اور خیالات کو لے کر، اسلامی فلسفہ کی کسوٹی پر گھس کر اپنے فکر و تحقیق کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر اس سانچے کو ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کی مختلف ضروریات، احساسات، تہذیبی، سماجی، واقتصادی تفرقات اور مذہبی امتیازات کے مد نظر ان میں ضروری ترمیمات کیے گئے ہیں۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بنایا ہوا تعلیمی دستور العمل جو بنیادی تعلیم BASIC EDUCATION کہلاتا ہے۔ ملک میں رائج کر دیا جائے۔ اس اسکیم کے پیچھے مسلسل دس سال تک (۱۹۳۷ سے ۱۹۴۷) تک انہوں نے جان توڑ کوشش کی۔ کئی کمیٹیاں بنیں، کئی قرار دادیں، کئی تجویزیں منظور ہوئیں، مگر ملک نے اس کو قبولیت کا شرف نہیں بخشا۔ کبھی سیاست سے رکاوٹ پڑی، کبھی حکومتوں کی بے اتفاقی رہی، کبھی عہدہ داروں کی ہٹ دھرمی اور کبھی ماہرین کی آپسی کشمکش کی وجہ سے یہ اسکیم شرمندۂ تعبیر بن نہ سکی۔

بنیادی تعلیم میں ہمیں افلاطون کے وہ خیالات نظر آتے ہیں جہاں تعلیم کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ تعلیم کا راز دوسروں کو پڑھانے سمجھانے میں اس قدر نہیں جتنا کہ خود سمجھنے پرکھنے میں ہے۔ افلاطون کا سارا زور خود استاد کی تربیت ہے۔ جب تک وہ اچھا استاد نہ بنے بچوں کی تعلیم ہو نہیں سکے گی۔ استاد کبھی یہ نہ سمجھے کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے۔ اس کی ساری عمر صرف سیکھنے سمجھنے میں ہی صرف ہونی چاہیئے۔ تب کہیں وہ استاد کہلانے کا مستحق بن سکے گا۔ افلاطون کے نزدیک تعلیم تاریکی سے روشنی کی طرف قدم بڑھانے کا نام ہے۔ اور یہ قدم ہمیشہ رواں دواں ہی رہنا چاہیئے۔ دوسری بات جو افلاطون نے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ صحیح تعلیم ذہنی غلامی کے بندھنوں کو توڑتی ہے۔ ندرت وفکر کو اکساتی ہے۔ تخلیقی مادہ کو ابھارتی ہے۔ اور تہذیب و تمدن کی وسعت کو بڑھاتی ہے۔ تعلیم ایک ثابت وسکوت تالاب نہیں بلکہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جو آفرینش سے انسانی ذہنوں کی سیرابی کرتا آرہا ہے۔

ذاکر صاحب سب سے زیادہ جرمن مکتب خیال سے متاثر ہوئے ہیں۔ اعلا تعلیم کے سلسلہ میں جب وہ جرمنی میں مقیم رہے تو انہیں اس دور کے مشہور تعلیمی اکابرین سے ملنے، سیکھنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

کرشنز ٹینر (KERSCH ENS TEI NER) رکاوٹ Rickert ڈلتے (DILTHEY) شلر مارشر (SCHEL MAR CHER)
اور سپیرانزر کا کافی اثر رہا۔ کرشنز ٹینز اس زمانے کے مشہور و معروف ماہر تعلیم سمجھے جاتے تھے۔ تعلیمی میدانوں میں انہوں نے دو انقلابی اصول پیش کیے۔ ایک تو کتابی اسکولوں کا خاتمہ اور کام کے اسکولوں کی ابتدا۔ اور دوسرا تہذیبی آثاثے (CULTURAL GOODS) کا نفاذ۔ جرمنی جو آج خوش حالی کی چوٹی پر پہنچ گیا ہے وہ اسی مدبر کی بتائی ہوئی نظام تعلیم کی درستگی کی وجہ۔ کام کو تعلیم میں ایسا ملادیا گیا جیسے جسم میں جان۔ زمانے دراز تک تعلیم کے حدود پڑھنے لکھنے سمجھنے تک محدود رہے ہے۔ صرف دماغی ورزش کو تعلیم نام دے دیا گیا تھا۔ دماغ سے ہٹ کر قدرت کے دیئے ہوئے دو اور اہم قوتیں تھیں جن کو بھلادیا گیا تھا۔ وہ ہیں دل کی قوت اور ہاتھ کی قوت۔ جب تک دل، دماغ اور ہاتھ تینوں کا امتزاج تعلیم میں نہیں ہوتا، صحیح تعلیم نہیں ہوتی۔ دماغ سوچنے سمجھنے کا کام کرے گا، مگر یہ سوچ سمجھ اخلاقیات کے میدان میں کام کرے۔ انسانیت کے مفہوم کو سمجھے، مقصد حیات کا راز جانے یہ سب دل سے وابستہ ہے۔ جب تک دل میں محبت کا چراغ نہ روشن ہو، اخلاقی شخصیت جو تعلیم کا مدعا ہے، کبھی حاصل نہ ہوگا۔ دماغ صرف ذہن کو تیز کرتا ہے۔ مگر دل روح کو منور کرتا ہے اس لیے دل کی صلاحیتوں سے بھی کام لینا از حد ضروری ہے۔

صرف دل دماغ ہی نہیں ہاتھوں کو بھی کام میں لانا چاہیئے۔ قدرت سے ایک دماغ اور ایک دل عطا ہوا ہو تو دو ہاتھ دیئے گئے ہیں۔ دماغ سے جو بات نکلی اور دل سے جو پسند آئی ہاتھوں نے اگر کر دکھائے تو تعلیم کے کچھ معنٰے نکلتے ہیں۔ خیالات و احساسات کی دنیا سے نکل کر حرکات و عمل کے میدان میں بھی داخل ہونا چاہیئے۔ انسان جو سوچتا ہے اس کو کر دکھانا بھی چاہیئے۔ جب تک عمل نہ ہو زندگی صرف خواب ہی خواب رہے گی۔ ہمارا تعلیمی نظام اس لیے کمزور ہے کہ اس میں کام کا دخل نہیں۔ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کو کر کے سکھایا نہیں جاتا۔ ہر اسکول میں ایک ورکشاپ یا تجربہ گاہ ہو تو بچے جو کلاس میں پڑھتے ہیں ان کو اپنے ہاتھوں سے تجربہ کر کے صحیح ذہنی تربیت پاتے ہیں۔

جرمنی میں ذاکر صاحب نے جو دوسری بات دیکھی وہ تہذیبی اثاثہ سے تعلق رکھتی ہے ہر قوم و ملت کو قدرت کی طرف سے خاص عنایات بخشتے گئے ہیں۔ یہ خصوصیات ایسے اہم ہوتے ہیں جو اس قوم و ملت کی روح سمجھے جاتے ہیں۔ ابن خلدون نے ان کو اس قوم کا

نصیب العین قرار دیتا ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اپنا تہذیبی و تمدنی ڈھانچہ ڈھالتے ہیں۔ یہ ڈھانچہ اس قوم کے اخلاق، عادات، روایات، رسمات، ادب، زبان، ہنر، فن، فلسفہ، ایمان، ایقان، مذہب سب کچھ ہوگا۔ سبھی اقوام کا ایک ہی قسم کا ڈھانچہ نہ ہوگا۔ ہر ایک میں کچھ خاص خصوصیت ضرور ہوگی۔ یہی امتیاز اس ڈھانچہ کو انفرادیت بخشتی ہے۔ یہ الفاظ دیگر ہر تہذیب نرالی ہے۔ یہ قوموں کو ورثہ میں ملتی ہے۔ یہ عظیم سرمایہ ہے جس پر اس قوم کو ناز ہوگا۔ وہ اس کی حفاظت میں سرگرم رہے گا۔ اور کسی صورت میں اس کے زوال کو پسند نہ کرے گا اور اپنے بچوں کی تعلیم کا نصاب اس خاص تہذیب کو نظر میں رکھ کر ترتیب دے گا۔ کسی تہذیب میں عقل و شعور پر زور ہے، کسی میں ادب پر، کسی میں فلسفہ پر، کسی میں ایجاد و اختراع پر، کسی میں علم و ہنر پر، کسی میں تجارت و سرمایہ پر، کسی میں رحم و کرم پر، کسی میں صبر و استقلال پر، کسی میں عدم و تشدد پر، کسی میں رواداری پر،

اسلامی تہذیب کو لیجیے۔ یہاں وحدت پر زور ہے۔ خالق کی وحدت، خلقت کی وحدت۔ اس وحدت کا اثر سارے اسلامی نظام حیات پر چھایا ہوا ہے۔ ہماری شریعت، طریقت، حقیقت، وحدت کے نور سے لبریز ہے۔ ہمارے سارے حدیث، فقہ، ادب، وحدت کے گرد گھومتے ہیں۔ ہمارا سماجی، سیاسی، ذہنی، نفسیاتی نظام حیات، وحدت سے منسلک ہے۔ گویا اسلام کوئی خاص پیغام لے آیا تھا۔ اور وہ اسی مقصد کے لیے زندہ ہے۔

ہر قوم و ملت کا تعلیمی نظام اس قوم و ملت کے تہذیبی اثاثہ سے مناسبت رکھتا ہوگا۔

کرشنز ٹیز کام کے اسکول کا بانی ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ میں چند خصوصیات دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ایک نصیب العین ہو، اس کے دل میں نئی قدروں کی عظمت ہو۔ اور وہ انہیں بخوشی قبول کرے۔ وہ روایات و خرافات میں نہ پھنسے اور حالات کو صحیح طریقے سے جانچے۔ وہ ایک ضدی و متعصب شخص نہ ہو۔ اور اس میں ہر اچھی چیز قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ غرض ذاکر صاحب کا تعلیمی رجحان جرمن مدبروں کی وجہ سے پختہ تر ہو گیا اور ان میں حقیقت کی تلاش، جمالیاتی ذوق و شوق، نرم و نازک حالات سے اثر پذیری اور حقائق کی جانچ پڑتال وغیرہ قسم کی جدید انداز فکر و ندرت و نکتہ بینی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے افلاطون سے لے کر جرمن مفکروں سے یہ سیکھا کہ ماضی منزل نہیں، رخت سفر باندھنے کا مخزن ہے۔ تعلیم و تربیت کے میدان میں ماضی کی تمام تحصیلاتِ ذہنی آنے والی نسلوں کی

میراث ہے۔ یہی ذہنی زندگی کی غذا بنتی ہے۔ انسانی ذہن اپنی قوتوں کو تمدنی اشیاء میں چھپا دیتا ہے۔ جب کوئی دوسرا ذہن جو پہلے ذہن سے کچھ مناسبت رکھتا ہے۔ ان اشیاء تمدن سے دوچار ہوتا ہے، تو یہ پوشیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ ذہن پچھلی کاوشوں سے تربیت پاتا ہے۔ مثلاً افلاطون نے کہا تھا کہ اس دنیا میں صرف تین چیزیں قابل حصول ہیں۔ حق یعنی سچائی، جمالیات یعنی حسن، اور عدل یعنی انصاف یہ قدریں ایسی ہیں کہ جن کی تعریف ممکن نہیں۔ ذاکر صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے نزدیک جو چیز حق یا سچائی ہے وہ دوسروں کے پاس نہ ہو۔ حسن اور انصاف کا بھی یہی حال ہے۔ مگر ان قدروں میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ افلاطون سے لے کر آج تک وہ کئی نظریوں کی بنیاد بن گئی ہیں۔ افلاطون نے ماضی میں جو قدریں ڈھونڈی تھیں وہ حرف آخر نہیں۔ اسی لیے ماضی منزل نہیں۔ زادِ راہ ہے۔ افلاطون کے خیالات کی اہمیت ہمارے ذہن میں گھماکر ان قدروں کے مزید معنے ہم دریافت کر سکتے ہیں۔ گویا افلاطون ہمارے لیے حقیقتوں کا ایک راز میراث میں چھوڑ گیا ہے اور اس میراث کی کاشت ہمیشہ جاری رہے گی۔ وہ زندگی کی غذا بن جائے گی۔ تہذیب تمدن کا سرمایہ ثابت ہوگی۔ لیکن ان قدروں کی ترویج صرف ان ذہنوں سے ممکن ہے جو ان قدروں میں دلچسپی لیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا ذہن افلاطون کے ذہن سے کچھ نہ کچھ مناسبت رکھتا ہو۔

ان خیالات کو لے ذاکر صاحب جرمنی سے لوٹے اور جامعہ ملیہ کی تعمیر میں منہمک ہو گئے۔ جامعہ ملیہ کس جانفشانی سے انہوں نے بنایا ان کے اس خطبے سے عیاں ہے جو جشن سیمیں کے خاص جلسے میں ۱۰ر نومبر ۱۹۴۶ء کو پڑھا گیا تھا۔ "جانتا ہوں کہ تعلیمی و تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پلک جھپکنے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور ہاں، خونِ جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ جامعہ ملیہ کو انہوں نے اپنی تحقیقات کا مرکز اور تعلیمی کاوشوں کا تجربہ گاہ قرار دیا۔ یہاں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب انسانی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اس کی بنائی ہوئی چیزوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں خود اس کی شخصیت کے علاوہ اس کی قوم،

نسل، اس وقت اور اس جگہ کے حالات کا اثر بھی رہتا ہے۔ جب کوئی دوسرا ذہن ان چیزوں کو قبول کرتا ہے تو چھپی ہوئی قوتیں ان چیزوں میں موجود ہیں وہ ابھرتی ہیں اور جاگتی ہیں اور اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے۔ مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹتے جائے ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی۔ اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں۔ اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا چھپایا تھا، سلایا تھا۔ غالب کے مرثیے کا یہ شعر ؎

"ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف ؛ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

اسی شخص پر زیادہ اثر پذیر ہوگا جس کا جواں عمر پسر فوت ہوا ہو اور اس کے سامنے یہ دُہرایا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دوسروں کی مذہبی زندگی عمر بھر پڑھتا رہے یا سنتا رہے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جب تک کہ اس کے ذہن میں اس تذکرے سے مذہب کی سچی کیفیت بیدار نہ ہو۔ پیر و مرشد کی بات مرید کو اس وقت تک سمجھ میں نہ آئے گی جب تک کہ خود مرید کو جلال نہ آجائے۔

جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب نے جو تعلیمی تحقیقات و تجربات کیے وہ بنیادی تعلیم کی شکل میں ابھرے جو حکومت اپنانا چاہتی تھی مگر اپنا نہ سکی۔ اس نظام تعلیم میں بنیادی مدرسے کتابی مدرسوں سے الگ تھے۔ وہ کام کے مدرسے تھے۔ کام کو تعلیم کا ایک اہم جز بنا دیا گیا تھا۔ اس طرح جیسے دودھ میں شکر گھول دیا گیا ہو۔ عقل اور عمل دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ کسی بھی نظریئے کا وجود اس وقت تک نامکمل رہ جاتا ہے جب تک کہ اس کو عمل کے میدان میں پیش نہ کیا جائے۔ ذہنی تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ ہاتھ ذہن کے خیال کو عملی جامہ نہ پہنائے۔ ذاکر صاحب کا سارا فلسفہ کام کے اسکول کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن ہر کام تعلیمی کام نہ ہوگا۔ یہیں ذاکر صاحب کے فکر کی بلندی جھلکتی ہے۔ وہی کام تعلیمی کام ہوگا جس سے ذہن کی تربیت ہو۔ آدمی اچھا بنے۔ یہ کام دماغ کا کام بھی ہو سکتا ہے یا ہاتھ کا کام بھی۔ کوئی ادیب ہے، کوئی خطیب ہے، کوئی وکیل ہے، کوئی مدبر ہے، کوئی مفکر ہے، کوئی محقق ہے یہ سب دماغی کام میں لگے ہوئے ہیں اور ان کا ذہن تربیت پا چکا ہے کوئی کام تعلیمی کام اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو وہ کام

مردہ مشین بھی کر سکتی ہے۔ اس سے ذہن کی تعلیم یا تربیت نہیں ہوتی۔ کام سے پہلے کام کا نقشہ یا کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ دوسرا قدم اس نقشہ کو پورا کرنے کے ذریعہ سوچنا ہوگا۔ تیسرا قدم اس کام کو انجام تک پہنچانا ہوگا۔ اور چوتھا قدم کیے ہوئے کام کو پرکھنا ہوگا کہ جو نقشہ بنایا تھا کام اسی طرح ہوا ہے یا نہیں۔ اگر یہ چاروں منزلیں طے ہوں تو بھی کام تعلیمی کام نہ ہوگا۔ ایسے کام سے کچھ ہنرمندی حاصل ہوگی۔ مگر ہنرمندی تعلیم نہیں۔ ہنرمند چور بھی ہوتے ہیں، ہنرمند دھوکہ بھی دیتے ہیں۔ تعلیم کے کام میں قدر کی خدمت ضروری ہے۔ جو ہماری خودغرضی سے پرے ہوں۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ آدمی بنتا ہے۔ اخلاق سنوارتا ہے۔ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا۔ کام وقت کاٹنے کا نام نہیں۔ کام کھیل نہیں۔ کام بامقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ آپ کرتا ہے۔ کام ریاضت ہے۔ کام عبادت ہے۔

لیکن ریاضت و عبادت میں بھی لوگ خودغرض ہو جاتے ہیں۔ اپنی جنت پکی کر لیتے ہیں۔ ریاکاری کے قریب آجاتے ہیں۔ کام کے سچے مدرسے میں خودغرضی نہیں ہوتی۔ مدرسہ میں سب کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ سب کے کام ہی سے سب کا کام پورا ہوتا ہے۔ سب سے سب کا کام نکلتا ہے۔ اور سب کے کیے بغیر کام بگڑتا ہے۔ کسی ایک کی غلطی سے سب کے کام کا حرج ہوتا ہے۔ سب کے مل جل کر کام کرنے سے وہ صفات پیدا ہوتے ہیں جس کی ہمارے ملک میں بڑی کمی ہے، کام کا اچھا مدرسہ، اس مدرسہ کے سماج کو بھی اونچے مقصد پر لے آتا ہے۔ ذاکر صاحب کام کے اچھے مدرسوں سے سارے سماج یا ساری قوم کو بلندی اور ترقی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یعنی اچھی تعلیم قوم کے بہترین مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہے۔

بنیادی تعلیم کا مقصد سب لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے کم سے کم سات سال کی مفت تعلیم کا انتظام کرنا تھا۔ اور اسے لازمی بنانا تھا۔ ہو سکے تو سات سال سے زیادہ کی تعلیم کا بندوبست ہو لیکن سال کی تعلیم میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ مفت تعلیم ہوگی۔ تیسری بات یہ کہ ان سات سال میں کام کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ اور چوتھی بات یہ کہ تعلیم میں تمدنی اشیاء کا امتزاج زیادہ ہو۔ ہمارے دیش میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علاحدہ علاحدہ

ہیں، بنیادی تعلیم میں یہ خاص خیال رکھا گیا تھا کہ ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اگر اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی راہیں نکالے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ ذاکر صاحب نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسہ تقسیم اسناد میں ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء میں کہا تھا۔ "آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کے حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہو گا سو ہو گا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

ذاکر صاحب کے ہاں تعلیم سے مراد ایک تو تمدنی اشیاء کا صحیح استعمال اور دوسرا ذہن کی صحیح تربیت۔ ذہن کی تربیت ذہن کو صحیح غذا پہنچانے اور اس غذا کو ہضم کرنے کے لیے صحیح ورزش کا انتظام کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ ذہن کی غذا ذہن ہی ہے۔ یعنی تمدنی انسان کی وہ ان گنت تخلیقیں جن میں ذہن انسانی اپنے آپ کو پیش کرتا ہے، اپنی صلاحیتوں و قوتوں کو لٹایا ہے، اپنی فکر کی کاوشوں کو چھوڑ گیا ہے، اپنی جمالیاتی نظر کو، اپنے مشاہدوں کو، اپنے مفید منصوبوں کو، اپنے دل کے ارمانوں کو، اپنی پسند اور ناپسندیدگی کو، اپنی روح کی ترقیوں کو، اپنی بے تابیوں کو، صفحہ قرطاس پر بند کر کے آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھ گیا ہے۔ یہ سب ذہنی تخلیقیں ذہنی توانائیوں کا خزانہ ہوتی ہیں۔ ان ہی ذہنی توانائیوں سے دوسرے ذہنوں کی غذا کا کام لیا جا سکتا ہے۔ جس ذہن کی تخلیق سے غذا کا کام لینا ہے اس کی ساخت اور جس ذہن کو غذا پہنچانی ہے اس کی ساخت میں مناسبت ہو۔ نہ ہر جسمانی غذا ہر جسم کے لیے ایک سی مناسبت رکھتی ہے۔ نہ ہر ذہنی غذا ہر ذہن کے لیے۔

ذہن معروض اور ذہن موضوع یعنی جس ذہن سے غذا لی جارہی ہے اور جس ذہن کو دی جارہی ہے ان میں مطابقت و مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گر ہے۔ جیسے بہرے کے ذہن کی تربیت موسیقی سے نہیں کی جا سکتی اور اندھے کے ذہن کی نشو و نما کے لیے مصوری سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اسی طرح جس ذہن کی ساخت ادبی اور تخلیقی ہو اس کو تجارت یا صنعت کے سرمایۂ تمدن سے کام نہ چلے گا۔ جس کی ساخت نظری ہو اس کو عملی اشیا سے تربیت نہیں دی جا سکتی۔ اس میں ضد کرنا قدرت کے منشا کی نافرمانی کرنا ہے۔ ذہن کی راہ کو بند کرنا ہے۔

تیسری اہم بات جو ذاکر صاحب نے بتائی ہے وہ کام کی اہمیت ہے۔ اگر کام کو ہمارے مدرسوں میں مرکزی جگہ دے دی جائے تو ہمارے کئی مسائل حل ہوسکیں گے۔ بچوں میں ایک گونہ خوشی کی لہر نظر آئے گی۔ تعلیم و تربیت کا کام صرف کلاس کے اندر ہی نہ ہوسکے گا کام سے رغبت، اس کو انجام تک لے جانے کا سلیقہ طریقہ اور سب مل جل کام کرنے کی عادت آئندہ زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنے کام کو اچھی طرح جاننا، اس کی ہیئت، اس کی غرض و غایت کو سمجھنا اور اسے خوبی سے انجام دینا۔ اور اپنے ارادے اور قوت عمل کو صرف کرنا ہی تعلیم کا راز ہے۔ ایک مفکر نے کہا ہے "پیشے کی تربیت انسانی تربیت کا دروازہ ہے،" کوئی نوجوان عربی یا فارسی یا سنسکرت فرفر بولے، لیکن کوئی ہنر نہ جانے، کھیت میں ہل کو نہ سنبھال سکے اور نہ کسی کام کے کرنے کا سلیقہ جانے، تو اس کی زندگی اجیرن بن جائے گی۔ ذاکر صاحب کے ہاں کام عبادت و ریاضت کا درجہ رکھتا ہے۔

اجیرن چوتھی اہم بات جو ذاکر صاحب نے بتائی ہے۔ وہ اخلاقی شخصیت کی تعمیر ہے اخلاقی شخصیت کائنات کی سب سے گراں بہا متاع عزیز ہے۔ اس پر فرشتے رشک کرتے ہیں اور خالق کائنات اپنے شاہکار پر ناز کرتا ہے۔ اس شخصیت کے لیے سیرت بنانی ہوگی۔ اور یہ سیرت شعوری طور پر اقدار عالیہ مطلقہ HIGHEST ABSOLUTE VALUES کی خدمت کرتی رہے گی۔ اخلاقی شخصیت بندہ مومن اور مرد مجاہد کے بلند مرتبہ پہ پہنچا دے گی۔ اس کے لیے قدرت نے جو صلاحیتیں، جو قوتیں، جو جبلتیں، جو استعدادیں، جو میلانات اور خواہشات عطا فرمائی ہیں ان میں یک جہتی اور یک سوئی کی تدبیریں کرنی ہوں گی۔ انفرادیت سے سیرت بنتی ہے۔ سیرت سے شخصیت اور شخصیت سے مرد مجاہد و مرد

مومن۔ سیرت کی تعمیر کے لیے ارادے کی قوت چاہیئے۔ اجتہادِ فکر چاہیئے۔ فہم و ذکا کا ذخیرہ چاہیئے۔ اثر پذیری، گہرائی و پایہ داری و مستقل مزاجی سے عمل کا سلسلہ چاہیئے۔ انفرادی خود غرضی کی جگہ جماعتی خدمت کا جذبہ چاہیئے۔ عادتوں کو بصیرت میں بدلنے کی مشق چاہیئے۔ فوق البشر کا تصور آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار سمجھنا چاہیئے۔ صرف اسی وقت اخلاقی شخصیت کا مفہوم سمجھ میں آسکے گا۔ ذاکر صاحب کا کہنا ہے کہ ایک کلمۂ پاک اپنی جڑوں کو ضمیر انسانی میں مضبوط کر کے اپنی شاخیں آسمان تک پہنچا سکتا ہے۔ ایک اچھی زندگی کا اسوۂ حسنہ کروڑوں انسانوں کے لیے رحمت کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک گندہ خیال مدتوں زندگی کو مسموم کر سکتا ہے۔ ایک خود غرضی ایک ہٹ دھرمی، ایک کوتاہ اندیشی ملکوں و قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ زندگی کا دھارا ایک مقام پر نہیں پڑتا۔ حالات کا تغیر نئے انتظام چاہتا ہے۔ ایک نیا تصور حیات سیاسی و معاشی زندگی کے بنیادوں کو ہلا دیتا ہے۔

ذاکر صاحب اخلاقی شخصیت کی تعمیر پر شدت کا زور لگاتے ہیں۔ اخلاقی شخصیت ہی ہر مذہب و ملت کا مسلک ہے۔ ہر تہذیب و تمدن کا مقصد ہے۔ ہر تعلیم و تربیت کا منشا ہے۔ یہ آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ اس کے لیے واجب قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ ہیں اقدار عالیہ مطلقہ۔ اس کی تشریح بھی ذاکر صاحب نے خوب کی ہے۔ ان میں سب سے اہم تلاشِ حق، خدمت خلق و حق و انصاف ہیں۔ سارے علوم تلاش حق کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ حق ذات الٰہی کی صفت بھی ہے۔ سارے مذاہب حق ہی کی پرستش کرتے ہیں۔ حق وجود کی وہ جھلک ہے جس میں ذرہ بھر بالیدگی نہ ہو۔ یہاں حقیقت کے پردے فاش ہوتے ہیں اور اصلیت عیاں ہوتی ہے۔ تعلیم و تربیت کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہر شخص حالات کو اچھی طرح جانے۔ ان کی ہیئت و غرض و غایت کو سمجھے اور ان سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح خدمت خلق سے اخلاقی شخصیت ابھر کر آتی ہے۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات کی کوئی شے بذاتہٖ خود کے لیے نہیں، کسی اور کے لیے ہے۔ چاند، سورج، ندی، نالے، پہاڑ، حیوانات، نباتات، جمادات، سب کا وجود کسی غیر شے کے فائدے کے لیے ہے۔ خود کے لیے نہیں۔ انسان کی زیست کا مدعا بھی کسی اور کی مدد کے لیے ہی ہے۔ لیکن وہ اپنی ساری صلاحیت، محنت و کوشش خود اپنے فائدے کے لیے مخصوص

کر لیتا ہے۔ خدمت خلق اخلاقی شخصیت کا ایک اہم جز ہے۔ حق و انصاف کے بغیر دنیا میں امن مشکل ہے۔ اخلاقی شخصیت کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے خواہشات، جذبات، و خیالات میں بھی حق و انصاف سے تجاوز نہ کر جائے۔

ذاکر صاحب کی اقدار عالیہ میں کئی ایک دیگر قدروں کا بھی ذکر ہے۔ خلوص، محبت، ہمدردی، حمیت، اخوت، صبر، شکر، راستبازی، مساوات، یہ سب ایسے اخلاقی قدریں ہیں جن سے روح کی پاکیزگی اور سچی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ذہن کی صحیح تربیت ان اوصاف کے حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب نے سماجی قدروں پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے فرد، سماج اور ریاست میں صحیح ربط و ضبط اور ایک صالح نظام زندگی جماعتی اقدار سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ اقدار ہیں ایثار و قربانی، قانون کی اطاعت حب الوطنی، رواداری، یک جہتی، اتفاق، اتحاد، ملنساری، ہر دل عزیزی وغیرہ۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب کے ہاں تہذیبی و تمدنی اقدار کی بھی بھرمار ہے جیسے فنون لطیفہ سے رغبت، جمالیات کا ذوق، مصوری و موسیقی سے لگاؤ، ادب و شاعری سے اُنس، قدرت کے حسین مناظر سے عشق وغیرہ۔ انہوں نے اقدار عالیہ کو اپنے تعلیمی نظام کا تاج سمجھا ہے۔ ان اقدار کو ایک نہیں آٹھ حصوں میں بانٹا ہے۔ جمالیاتی و فطری، تہذیبی و تمدنی، سماجی و اقتصادی، جماعتی و انفرادی، مذہبی و ملی، جسمانی و مادی، ذہنی و تخلیقی، تفریحی و مجلسی۔ انفرادی اقدار میں انہوں نے تذکرہ کیا ہے حفظان صحت، ورزش کی ضرورت، طہارت، وقت کی پابندی، ضبط نفس، نفاست، تنظیم، جرأت، خلوص، محبت، مروت، خوش خلقی، حمیت و ہمدردی، راستبازی و انکساری وفاداری وغیرہ۔

غرض ذاکر صاحب کا تعلیمی فلسفہ اخلاقیات کا ایک گلدستہ ہے۔ اس میں ذہنِ انسانی کے وہ پھول مہکتے ہیں جو تفکر و تدبر کے چمن سے چنے گئے ہیں۔ ذہن انسانی ہی جو انسان کو خالق کی سب سے بڑی دین ہے۔ ان کی تعلیمی رجحان کی روح ہے۔ علم، عمل اور اخلاق کے ڈھانچے میں یہ روح کار فرما ہے۔ اقدار عالیہ، تمدنی اشیاء، اور اخلاقی شخصیت اس روح کا سرمایہ ہے۔ فرد، سماج اور ریاست اس روح کی کائنات ہے۔ تلاش حق، خدمت خلق وسیرت کی تعمیر اس روح کا پیغام ہے۔ اس کرۂ ارض پر اہل کمال، اہل جمال اور اہل احسان اکٹھا کرنا اس روح کا منشا ہے۔ انسانیت کا یہ ایک ایسا گہرا فلسفہ ہے جو اس خطۂ ارض کو فردوس

بریں بنانا چاہتا ہے۔ اس فلسفہ کی تشریح اور اس کے حصول کے لیے ذاکر صاحب نے اپنی ساری عمر وقف کر دی۔ ذاکر صاحب کے در باب میں نے کہیں اور جگہ چند جملے لکھے تھے، وہ یہ ہیں۔

ان کی زندگی کا لب لباب یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہ رب العالمین کی خلقت سے انہیں پیار تھا، ان کی خدمت ان کا وظیفہ تھا۔ رحمت اللعالمین کے نونہال بچوں سے انہیں عشق تھا، ان کی تربیت ان کا پیشہ تھا، ملک وقوم کے مدرسوں اور استادوں سے انہیں اُنس تھا، ان کی رہبری ان کا شیوہ تھا۔ علم سے رغبت، عمل سے الفت، عقل سے لگاؤ ان کا سرمایہ تھا۔ تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، معاشیات اور نفسیات ان کی تحقیق کا موضوع تھا۔ تحریر، تقریر، تدریس و تفتیش ان کا مشغلہ تھا۔ شخصیت کی تعمیر، اخلاق کی تخلیق اور سیرت کی تربیت ان کا کسب تھا۔ ذہنوں کی چمک، پھولوں کی مہک، چڑیوں کی چہک، نیچروں کی دمک اور بچوں کی مسکراہٹ ان کی مسرت کا خزانہ تھا۔ حق و انصاف، حسن و جمال، حمیت و ہمدردی ان کا شعار تھا۔ متانت و نفاست، لطافت و سنجیدگی اور وقار و غیرت ان کا کردار تھا۔ معلم کی کرسی سے کل ہند کی صدارت کا شرف ان کی عظمت کا اقرار تھا۔۔ جامعہ ملیہ ان کے کمالات کا مظہر تھا۔ یہ وہی جامعہ ملیہ ہے جس کے حق میں شاعر اعظم حفیظ جالندھری نے کہا تھا:۔

رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے ∴ مدینہ سے ہی وابستہ یہ طور لامعہ بھی ہے
قیام جامعہ ان ظلمتوں میں ان فضاؤں میں ∴ چراغ راہ ایسی تند زہریلی ہواؤں میں
مقابل ساحرانِ مغرب کے، اک یدِ بیضا ∴ خدائی اتنے فرعونوں کی، تنہا جراٴت موسیٰ

عبداللہ ولی قادری

ذاکر صاحبؒ کے تعلیمی نظریات کی معنویت

ذاکر صاحب اپنی طالب علمی کے دور سے ہی گاندھی جی سے متاثر تھے۔ جامعہ کے قیام کے ساتھ ان کا قرب بھی انھیں میسر آگیا اور جامعہ کی خدمت کے دوران وہ برابر گاندھی جی کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے سرفراز رہے نیز گاندھی جی بھی ان کی تعلیمی بصیرت اور قومی لگن کے قدر دان ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے اپنی بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو کمیٹی بنائی اس کا صدر ذاکر صاحب کو ہی بنایا۔ اور اپنے ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی سربراہی بھی ان ہی کو سونپی۔ اب جامعہ کے اندر اپنے کام اور گاندھی جی کے اس اعتبار و اعتماد کے اظہار کے بعد وہ نہ صرف ملک کے اندر ایک قوم پرور ماہر تعلیم اور ممتاز دانش ور کی حیثیت سے بخوبی متعارف ہو گئے بلکہ بیرون ملک سے بھی ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔

ذاکر صاحب نے اپنی جرمنی کے قیام (۱۹۲۲ تا ۱۹۲۶) میں وہاں کے تجرباتی مدارس سے واقفیت حاصل کی تھی۔ اگرچہ وہ معاشیات کے طالب علم رہے تھے لیکن انھوں نے جرمن فلسفے اور تعلیم کا بھی مطالعہ کیا جو ان کی گہرائی اور پائیدار دل چسپی کا موجب بنا۔ جرمن مفکرین فلسفہ و تعلیم بالخصوص جارج کرشین اسٹائینر سے وہ بے حد متاثر ہوئے ان کی تعلیمی و تنظیمی فکر میں یہ اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے نزدیک ملک و قوم کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ لائق قدر دولت بچے ہی ہیں۔ اور اس دولت سے پورا پورا فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب انھیں اچھی تعلیم دی جا ئے، انھیں مناسب طور پر پروان چڑھایا جائے۔ ان کا ارشاد تھا کہ

"سب سے ضروری چیز چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قومی تعلیم کی نئی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے" انھوں نے جامعہ کے اندر اسی خیال کے مطابق کام کیا اور کرایا اور جامعہ کے باہر بھی دوسروں کو یہی بات برابر سمجھاتے رہے۔ شیخ الجامعہ ہونے کے باوجود انھوں نے ابتدائی مدرسے میں خود بڑھ چڑھ کر دل چسپی لی۔ اس کے لیے نئے نئے مضامین اور مزے مزے کے مشغلے تجویز کیے اور اچھے اچھے اساتذہ کو چنا۔ جب جامعہ نگر میں عمارتیں بنوانے کا وقت آیا تو سب سے پہلے مدرسہ ابتدائی کی عمارت بنوائی۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں اس تقریب کا اعلان کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے فرمایا: "اس مبارک رسم کو انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرمارواؤں میں سے ہے، نہ ارکان سلطنت میں، نہ صاحبان دولت میں، نہ ارباب علم میں، نہ رہبران ملک میں، نہ اکابرین قوم میں، جو کچھ بھی نہیں ہے مگر وہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ ارباب نظر اس انتخاب کی داد دیں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لیے کہیں زیادہ موزوں ہے۔" (ذاکر صاحب کی کہانی: سعیدہ خورشید عالم)

یہ تو سب جانتے ہیں کہ گاندھی جی کی پیش کردہ بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار کرنے کا سہرا ذاکر صاحب کے سر ہے جیسا کہ شروع میں ہی اشارہ کیا جاچکا ہے لیکن اس طرف کم ہی غور کیا جاتا ہے کہ اس بڑے تعلیمی کام کے وقت بھی انھیں بچے کی قدر ومنزلت اور اہمیت کا کس قدر دھیان رہا تھا۔ جب گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کا تصور پہلے پہل دیس کے سامنے رکھا تو اس میں کام کے پھل ہی کو کامیابی کا پیمانہ سوچا گیا۔ بچوں سے زیادہ کام کرانے کی فکر ہوئی تاکہ تعلیم کا خرچ نکل آئے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ تعلیم کو خود کفیل بنایا جائے۔ مگر ذاکر صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ "بچہ مقدم ہے، نہ کہ کام۔ بچے کی شخصیت کے جوہر کھلنا چاہیئے۔ اس کام میں بہت لطف آنا چاہیئے۔ اصل معاوضہ یہی ہے۔ وہ طالب علم ہے، خدا نخواستہ کوئی بیگار کرنے والا مزدور نہیں ہے۔ اگر بچہ سنور گیا تو سمجھ لیجیے کہ تعلیم کا مقصد حاصل ہوگیا، ہماری کوشش کامیاب رہی۔" ذاکر صاحب نے اپنی بات اتنی ایمانداری اور سمجھ داری سے کہی تھی کہ وہ سب کے دلوں میں اتر گئی۔ اور بنیادی تعلیم کے اصولوں میں خود کفالت کے اصول کو شامل نہیں رکھا گیا۔ لیکن

بچوں سے ان کا کہنا تھا کہ "بچو! نیک بنوں، نیکی کرو، جاگو اور جگاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان ننھے ننھے ہاتھوں سے کیا کر سکتے ہو۔ ان ننھے ہاتھوں میں بڑا زور چھپا ہوا ہے۔ اس کو آزماؤ اور اپنے لیے، دوسروں کے لیے برکت کا سبب بن جاؤ (مضمون، جامعہ کا نشان، پیام تعلیم ۱۹۳۹ء)

ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات کے اوّلین نقوش ہمیں ان کے تعلیمی خطبات (شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۴۳ء) میں ملتے ہیں۔ اس کے پہلے خطبات کا موضوع ہے "قومی تعلیم"۔ یہ وہ خطبہ ہے جو کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کو پڑھا گیا۔ ہمارے عصری تقاضوں کے پیش نظر اس کی معنویت بالکل عیاں ہے۔ اس خطبے میں ذاکر صاحب نے تعلیم کے مفہوم اور قومی تعلیم کے مقصد کی وضاحت یوں کی ہے "تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی لا سکیں"، اور جتایا ہے کہ "جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی، وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتی ہے۔" پھر انھوں نے قومی نظام تعلیم کی تشکیل سے متعلق مسائل کی طرف رجوع کیا ہے۔ انھوں نے صفائی سے کہا ہے کہ "ہمارے نظام تعلیم میں بس اتنی تبدیلی سے کام نہیں چلے گا کہ اس میں دیسی زبان کے لیے کوئی اچھی جگہ نکل آئے اور تاریخ کی کتابیں بدل دی جائیں۔ ہماری قومی تعلیم کا کام خاصا پیچیدہ ہے۔ مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں۔ جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علاحدہ علاحدہ ہیں۔ قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تفریقوں کو بالکل پس پشت ڈال دیں یا ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے کر اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی راہیں نکالے۔ آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا، سیاسی دانش مندی کا تقاضہ ہی نہ سمجھا جائے

بلکہ خود صحیح تعلیم کے لیے لازمی مانا جائے گا۔ انھوں نے اپنی بات کو مثال سے بالکل واضح کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "مثال کے طور پر آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے کو ہی لیجیے۔ کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں؟" ان کا ارشاد ہے کہ "ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضہ ہے۔" آج جو بات بعض ابنائے وطن گلا پھاڑ کر کہہ رہے ہیں، ذاکر صاحب نے اسی وقت بھانپ لی تھی۔ لہٰذا فرمایا تھا کہ "آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمعے کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے تحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گا۔" انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جُز ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جز بننا بھی گوارہ نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے، ہندوستان میں ان کا دین، ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے، ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

ذاکر صاحب کا دوسرا خطبہ مسلمانوں کی ثانوی تعلیم سے متعلق ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جشن سیمیں کے موقع پر ۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو پڑھا گیا۔ اس خطبے میں ثانوی منزل پر تمدنی اشیاء سے طلبہ کی ذہنی تربیت کا انتظام کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "ذہنی تربیت کے لیے تو کہیں ادب اور

لسانیات سے، کہیں فنونِ لطیفہ سے، کہیں صنعت و حکمات سے مختلف مدرسے زیادہ کام لیں گے لیکن غالباً ہماری ثانوی تعلیم کا یہ نیا نظام اپنے طلبہ کے افقِ اقدار کو معین کرنے اور وسعت دینے کے لیے انھیں اپنے نصب العین سے آگاہ کرنے، انھیں اپنے ماضی' کا رمز شناس بنانے اور ان میں مستقبل کے امانت دار ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے تمام مدارس میں اپنے دین، اپنی تاریخ اور زبان کی تعلیم کا خاص انتظام رکھے گا۔"
اس خطبے کا اختتام یوں ہوتا ہے:۔" کاش آج کے بدلے ہوئے حالات میں، ہم بھی اسی عزم اور ہمت کا ثبوت دے سکیں اور اپنی قومی زندگی کے تحفظ و ترقی کے لیے ایک نئے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالنے کا کٹھن مگر ضروری کام شروع کر دیں۔"
یہ الفاظ تو ستاون سال پرانے ہیں لیکن کچھ لگتا ہے جیسے آج کل میں ہی ہم سے کہے گئے ہیں۔ جی ہاں ہم سے، ان کا تعلیمی ورثہ پانے والوں سے۔
'تعلیمی خطبات' کے چوتھے خطبے کا عنوان ہے 'بنیادی تعلیم' جو دوسری بنیادی تعلیم کانفرنس منعقدہ جامعہ نگر نئی دہلی میں ۱۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو پڑھا گیا۔ انھوں نے بنیادی تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے پہلی بات یہ کہی تھی کہ" قوم کبھی سات سال سے کم مدت کی مفت لازمی تعلیم پر راضی نہ ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا تھا کہ" دوسری بات کی طرح آخری طور پر طے سمجھنی چاہیئے یہ ہے کہ سات سال کی تعلیم مادری زبان میں ہوگی۔" پھر یہ فرمایا تھا کہ" تیسری بات جو میری رائے میں انھیں دو کی طرح کبھی ہاتھ سے نہ دی جائے گی وہ یہ ہے کہ تعلیم کے ان سات سال میں کام کو بیچ کی جگہ دی جائے گی۔ اور جہاں تک ہو سکے گا اس کے ذریعہ دوسری سکھانے اور بتانے کی چیزیں سکھائی اور بتائی جائیں گی۔" جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری لازمی مفت تعلیم کی مدت آٹھ سال ہے۔ یہ ایک سال کا اضافہ بعد کی بات ہے۔ لیکن اس طرف ذاکر صاحب نے اشارہ اسی وقت کر دیا تھا۔" میں نے سات سال کم سے کم کہا۔ اس ریاست کے وسائل بڑھیں گے تو شاید وہ اس مدت کو بڑھائے گی۔" علاوہ ازیں بنیادی تعلیم کے بنیادی اصول جوں کے توں برقرار رہے اور ہم نے پہلے تین پنج سالہ قومی منصوبوں تک اسی کو ابتدائی تعلیم کی قومی پالیسی قرار دیا جیسا کہ بنیادی تعلیم میں 'کام' کو مرکزی حیثیت دی گئی جسے 'حرفہ' کہہ کر پکارا گیا اور اسے ایک اہم ذریعۂ تعلیم کے طور پر برتنے کو اہمیت دی گئی۔ گویا حرفہ اور ربط

کا اصول بنیادی تعلیم کے امتیازی نشان قرار پائے۔ اس خطبے میں ذاکر صاحب نے
کام کا مفہوم بڑے دل نشیں انداز میں سمجھایا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "جب ہم تعلیم کے
سلسلے میں کام کا ذکر کریں تو ہمیں وہی کام دھیان میں رکھنا چاہیئے جس سے تعلیم ہو، ذہن
کی تربیت ہو، آدمی، اچھا آدمی بنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کا ذہن اپنے کیے کو پرکھ کر اس کے
اچھے برے پر نظر کر کے، ترقی کرتا ہے اور آدمی جو کچھ بناتا ہے یا کوئی کام کرتا ہے، چاہے
یہ کام ہاتھ کا ہو، چاہے دماغ کا، تو اس کام سے ذہنی، تعلیمی فائدہ اسی وقت پہنچ سکتا ہے
جب وہ اس کام کا پورا پورا حق ادا کرے، اس کام کے ڈسپلن کو اپنے اوپر اوڑھ لے
اس لیے ہر کام، تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام، تعلیمی کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے شروع
میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو، وہ کام مردہ مشین بھی کر
سکتی ہے اور اس سے ذہن کی تعلیم یا تربیت نہیں ہوتی۔ کام سے پہلے کام کا نقشہ،
کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے یعنی نقشے کو پورا
کرنے کے ذرائع سوچنا، ان میں سے کسی کو لینا، کسی کو چھوڑنا۔ تیسرا قدم ہوتا ہے کام کو
ان چنے ہوئے ذریعوں سے کر ڈالنا۔ اور چوتھا قدم ہے، کیے ہوئے کو پرکھنا کہ جو نقشہ بنایا تھا
جو کرنا چاہا تھا، وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا، اسی طرح کیا یا نہیں اور نتیجہ اس
قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں نہ ہوں تو تعلیم کا کام ہو ہی نہیں سکے گا۔"
یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کام کی منزلوں کے اس بیان پر جرمن مفکر تعلیم
جارج کرشین اسٹائینر کی گہری چھاپ ہے۔ ذاکر صاحب اس سے بے حد متاثر تھے۔
انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس کو اپنے ولبھ بھائی یادگاری لکچر سلسلہ ۱۹۵۸ء میں
سراہا ہے۔ مگر تعلیمی کام کا تصور بیان کرنے میں وہ ان منزلوں پر رک کے نہیں بلکہ ان سے
آگے نکل گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اگر یہ چار ہوں تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے
کام سے کچھ ہنرمندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ چاہے ہاتھوں کی ہنرمندی ہو، چاہے ذہن
کی، چاہے زبان کی۔ لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں ہے۔ تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر
ہم سب کے سامنے آتی ہے، اس میں خالی ہنرمندی کا رنگ نہیں ہوتا۔ ہنرمند چور بھی ہوتے
ہیں، ہنرمند دھوکے بھی دیتے ہیں، ہنرمند سچ کو جھوٹ کر دکھاتے ہیں۔ ایسی ہنرمندی تو
تعلیم کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی کام وہی ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت کرے

جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ جو اپنی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزہ نہیں ڈھونڈتا اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے۔" اس طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ذاکر صاحب کیوں کر تعلیم کا رشتہ اقدار سے استوار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک "سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اب ذرا کام کے بارے میں ان کے ان جملوں کی لطافت، صداقت اور خطابت ملاحظہ فرمایئے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا، کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا، کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں، کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام، کام ہے، با مقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے۔ جو کہیں نہیں ملتی، کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

ذاکر صاحب نے ولبھ بھائی پٹیل یادگاری لکچر سلسلہ ۱۹۵۸ء میں اپنی تینوں تقریروں میں تعلیم کی ازسرِ نو تنظیم، کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بڑے مدلل و موثر انداز میں ابتدائی تعلیم اور کام کے مدرسے کی نوعیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، فرد و ملت کے ربطِ باہم کی وضاحت کی ہے اور اساتذہ کی ذمہ داری کا تعین کیا ہے لیکن ذاکر صاحب کی تمام ترسعیِ بلیغ کے باوجود بنیادی تعلیم اور حرفے کے بُرے دن آکر رہے۔ تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے کے بعد کوٹھاری کمیشن (تعلیمی کمیشن ۶۶۔۱۹۶۴) کی رپورٹ میں دعائے مغفرت، کے ساتھ بنیادی تعلیم سے ہاتھ اٹھا لیا گیا۔ یعنی کہ اپنی زندگی کے پندرہ سال سسکتے رہنے کے بعد اسے ابتدائی تعلیم کی قومی پالیسی کی حیثیت سے ترک کر دیا گیا۔ اور دعائے مغفرت کی بات اس لیے نوکِ قلم پر آگئی کہ رپوٹ میں اسکیم کو سراہا بھی گیا ہے۔ البتہ حرفے کو برائے نام برقرار رکھا گیا ہے لیکن جس طرح اور جس قدر اس کا منھ چھوا جا رہا ہے اس کا دُور کا بھی تعلق

بنیادی تعلیم اور ذاکر صاحب کے حرفے یا کام سے نہیں ہے۔ اگرچہ ذاکر صاحب نے اپنی تعلیمی بصیرت سے حرفے کے تصور میں 'ہاتھ کا کام' اور 'دماغ کا کام'، دونوں کو سمولیا ہے اور گاندھی جی کے 'دست ورزانہ حرکت' کے تصور سے اسے بلند کردیا ہے۔ پھر بھی کسی طور پر اس کا حق آج تک ادا نہیں کیا گیا ہے۔ جب کہ اس کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی افادیت سے قطع نظر سائنس اور تکنالوجی کی تعلیم کے لیے حرفے سے بہتر کوئی اور بنیادی یا ابتدائی عمل ممکن نہیں ہے۔ البتہ ذاکر صاحب کے عہد میں جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی میں ذاکر صاحب کے 'کام' کی بہار دیکھی جا سکتی تھی جہاں بچوں کے لیے کھیل کود، ورزش، تیراکی وغیرہ کے اہتمام کے علاوہ مرغی خانہ، چڑیا خانہ، باغبانی، خوانچہ، دوکان، بینک جیسے مشاغل پر دھیان دیا گیا۔ کھلی ہوا کے مدرسے کا اہتمام عمل میں آیا جب کہ ایسے نام کی ہوا تک اس وقت کسی کو نہیں لگی تھی۔ اس موقع پر ہفتے عشرے کے لیے سارا مدرسہ آبادی اور بستی سے دور کسی جگہ آباد ہو جاتا تھا گویا جنگل میں منگل کا لطف اٹھایا جاتا۔ ایک دن کا مدرسہ بھی منایا جانے لگا جب کہ مدرسے کے اساتذہ اور کارکن سیر کو کہیں نکل جاتے اور مدرسے کی ساری باگ ڈور 'بچوں کی حکومت' کے ہاتھ میں آجاتی۔ دیواری اخبار اور قلمی رسالہ جیسے کام بھی بچوں کی توجہ کا باعث ہوتے۔ غرضیکہ اس چھوٹے سے مدرسے میں کچھ ترقی پسند تعلیم (پروگریسو ایجوکیشن) کی جھلک ملتی تھی اور کسی قدر اس کے مزاج میں فلسفۂ عملیت کا عمل دخل نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 'کر کے سیکھنے' اور منصوبی طریقے (پروجکٹ میتھڈ) کی دل کھول کر پذیرائی ہوئی۔ ذاکر صاحب کی زندگی ذوق جستجو سے عبارت تھی اور اس کی آبیاری کو وہ تعلیم کا ایک اہم فریضہ گردانتے تھے۔ انھوں نے جارج کرشین اسٹائنر کی یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی کہ "ایک تعلیم یافتہ شخص خود کو کبھی بھی مکمل محسوس نہیں کر سکتا۔ فطرتاً تعلیم کے لیے جدوجہد کرتا، صحیح تعلیم کی ایک سچّی نشانی ہے" (نظریۂ تعلیم حصّہ دوم، جارج کرشین اسٹائنر، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء) ان کا کہنا تھا کہ "جو کام کرنے کے لائق ہے، وہ اس لائق بھی ہے کہ اچھی طرح کیا جائے" وہ فضیلت کوشی کو تعلیم کا ایک اہم مقصد گردانتے تھے اور چاہتے تھے کہ مدرسے کی فضا، بچوں میں پیش قدمی کو سراہنے کی موجب ہو۔ انھوں نے اپنے عہد میں جامعہ کے بچوں میں ذمے داری، اشتراک و

تعاون، نظم وضبط، جرأت وہمت، ادب و آداب، پابندی اوقات جیسی اقدار کے حصول کی خاطر وہ سب ذرائع اور مواقع فراہم کیے جن کی بدولت مدرسہ ابتدائی حقیقی معنوں میں ایک سچے کام کا مدرسہ یا مدرسۂ عمل کہلانے کا مستحق ہوگیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہوسکا جب کہ وسائل محدود تھے اور زمانہ ناساز گار۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اب اقتدار کے زیر عاطفت ہونے کے باوجود اسے بھی زمانے کی ہوا لے اڑی۔

ذاکر صاحب نے ایک سچے معلّم کے مصداق اولاً اپنی زندگی کو سنوارا۔ مثلاً انھیں پھولوں کا شوق تھا، گلاب کے تو وہ رسیا تھے۔ باغبانی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انوکھے اور نت نئے پتھر، نادر اشیا جمع کرنے کے شائق تھے۔ مصوری، موسیقی، نقاشی، خطاطی، شاعری کے شیدائی تھے۔ ہر کام میں سلیقہ چاہتے تھے۔ انھوں نے جامعہ کے فرزندوں میں اپنے مطمح نظر اور رویوں کی جوت جگانے کی ان تھک کوشش کی۔ انھیں صفائی ستھرائی کا بہت خیال رہتا تھا۔ جب وہ شیخ الجامعہ تھے تو ان کا طریقہ تھا کہ جامعہ کے اندر آتے جاتے جہاں کہیں کاغذ کا ٹکڑا نظر آجاتا تو اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے اور اپنے دفتر میں پہنچ کر اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے مدرسہ ابتدائی کے بچوں کے جوتے تک صاف کیے ہیں تاکہ وہ ان کے خواب کی تعبیر بن سکیں۔ انھیں کھانا ضائع کرنے سے باز رکھنے کے لیے ان کی جھوٹن تک کھانے سے گریز نہیں کیا ہے اور ہوسٹل کے تنگ و تاریک گوشوں کی خود صفائی کی ہے۔

ذاکر صاحب نے خاص طور پر بچوں کے لیے مضامین، کہانیاں اور نظمیں لکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو آمادہ کیا اور اپنے آپ بچوں کے لیے طرح طرح کی کہانیاں لکھیں۔ اس طرح انھوں نے جامعہ کے اندر بچوں کا ادب تیار کرنے کی مہم شروع کی انھوں نے بچوں کے لیے اردو کی درسی کتابیں تیار کرنے کے سلسلے کی بھی ابتدا کی اور نہ معلوم ان کتابوں میں، بچوں کے لیے کتنے مضامین خود لکھے۔ ایسے تمام کام بچوں کی تعلیم میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جب ذاکر صاحب نے ان کی طرف توجہ کی، اس وقت سچ تو یہ ہے کہ کسی کو ان باتوں کا دھیان تک نہ آتا تھا۔ اور اردو کا دامن ان چیزوں سے تقریباً خالی تھا۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ذاکر صاحب کی کہانیاں صاف طور پر ایک

بالغ نظر استاد کے احساس منصبی کی دین نظر آتی ہیں جو حسن اتفاق سے اپنے اندر ادب بھی سموئے ہوئے ہے۔ ان کی ہر ایک کہانی کسی نہ کسی قدر کو اُجاگر کرتی ہے، کسی خوبی کا گرویدہ بناتی ہے یا کسی نیک کام کی ترغیب دیتی نظر آتی ہے۔ جذبۂ آزادی وطن دوستی، اتحاد و اتفاق، ہم آہنگی، حوصلہ مندی، خدمت و ایثار، صحت و صفائی کی عظمت سے ان کہانیوں کا دامن بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی کہانی ابّو خاں کی بکری (ابّو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں۔ شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی ۱۹۶۳ء) آزادی کی سچی لگن پیدا کرتی ہے اور اس سے قربانی کا سبق ملتا ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اپنے بہترین انداز میں کہا ہے۔ آخری چند جملے دیکھیے:۔ چاندنی نے بھیڑیئے کے آگے سر نہیں جھکایا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں، بھیڑیئے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرے۔ جیت ہار اپنا قابو نہیں، وہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ مقابلہ ضروری ہے۔ چاندنی رات بھر مقابلہ کرتی رہی لیکن صبح ہوتے ہوتے چاندنی بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سرخ تھا۔ بھیڑیئے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا۔ اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں یہ بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی چڑیا ہے۔ وہ مُصر ہے کہ چاندنی جیتی۔" ذرا دیکھیے کس سادگی اور پُرکاری سے فلسفۂ حریت کو سمجھا دیا ہے اور کیا تاثر قایم ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کی ایک اور کہانی (آخری قدم، صبر و قناعت، ایثار و امداد کی ایسی روح پرور روداد سناتی ہے جو بچوں، بڑوں، جاہل و عالم ہر ایک کا دل ہلا دیتی ہے۔ ذاکر صاحب کی کہانی (کچھوا اور خرگوش، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۱۹۷۰ء) سے تعلیم میں تخصیص کے اہم مسئلے پر ان کے نقطۂ نظر سے آگاہی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں پر کچھوا اور خرگوش کی کلاسکی کہانی کا تعلق تو بس برائے نام ہے اور پس منظر کے طور پر ایک سہارے کا سا کام دیتا ہے۔ دراصل معاملہ چار پروفیسروں کا ہے جو ایسے تخصیص کا شکار ہیں جو علم و فضل کے مفہوم کی ہی نفی کر ڈالتا ہے۔ وہ نظر نہیں رکھتے، محض ایک خبر کے مالک ہوتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہانی کے دل کش انداز میں محدود تخصیص کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ وہ تعلیم کا ایک ہمہ جہت اور کشادہ تصور رکھتے تھے اور لبرل ایجوکیشن کے حامی

تھے۔ ایسی عام تعلیم جو تہذیب نفس کے لیے دی جائے۔ ان کے نزدیک علمی وقار حاصل کرنے کے بعد کسی امتیاز کے حصول کی منزل آتی ہے۔ علاوہ ازیں ذاکر صاحب نے چند اور مسائل بھی اس کہانی کی گرفت میں لے لیے ہیں۔ انھوں نے کچھوے کی سندھ ہندی اور پروفیسر صاحبان کی گاڑھی اردو پیش کر کے ایک طرف ہمیں زبان کے منصب ترسیل کی طرف متوجہ کیا ہے اور دوسری طرف بتایا ہے کہ لسانی مغائرت کے باوجود مفاہمت ممکن ہے، کوئی زبان بذات خود منافرت نہیں پھیلاتی، اصل معاملہ خلوصِ نیت کا ہے۔ کہانی کے کردار ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ دلوں کے ملانے کے لیے ہم زبان ہونا درکار نہیں ہے البتہ ہم دم و ہمدرد ہونا بے شک لازم آتا ہے۔ اس کہانی کا انجام یعنی نوجوان خرگوش کی موت اس طرف توجہ دلاتی ہے کہ پختہ کار ذہنوں کو کچی عمر والوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس طور 'کچھوا اور خرگوش' کہانی کے ذریعے کئی کام نکال لے گئے ہیں۔ یہ کہانی اپنے نام اور سج دھج کے باعث بڑوں کی توجہ کا فخر حاصل کرنے سے قاصر رہی ہے اور بچے اس کی زبان اور اصل موضوع سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ اس لیے اس کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہیں ہو پائی اگرچہ وہ ایک نہایت دل چسپ اور پر معنٰی کہانی ہے۔

ذاکر صاحب کی ۱۵ر مارچ ۱۹۳۶ء کی نشری تقریر 'اچھا استاد' (تعلیمی خطبات) بڑے واضح انداز میں استاد کے تصور اور رول کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس کا جیتا جاگتا نمونہ ہمیں خود ان کی ذات اور جامعہ میں ان کے متعدد رفیقوں کی شخصیت میں نظر آتا ہے جو بلاشبہہ ذاکر صاحب کا زندہ جاوید 'اچھا استاد' کہلانے کے مستحق تھے۔ جیسے 'ایک معلّم کی زندگی' اور 'جامعہ کی کہانی' جیسی کتابوں کے مصنف عبدالغفار مدہولی صاحب اور جامعہ میں آرٹ کے اساتذہ کی تربیت اور 'آرٹس انسٹی ٹیوٹ' (موجودہ شعبۂ فائن آرٹ و آرٹ ایجوکیشن) کے بانی ابوالکلام صاحب۔ یہ دونوں حضرات اپنے مذاق و مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف شخصیت و تربیت رکھتے تھے لیکن بلاشبہہ دل کے اچھے 'دُھن کے پکے' اور خلاقانہ ذہن کے مالک تھے۔ اس تقریر کا مرکزی خیال ان جملوں میں سمو گیا ہے:۔ "استاد کی کتاب زندگی کے سرِ ورق پر علم نہیں لکھا ہوتا، محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے۔ ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل

بننے والی ہیں۔" لیکن انھوں نے یہ بھی جتادیا ہے کہ "صرف یہی کافی نہیں۔ ہر اچھے استاد میں اس کا ہونا ضروری ہے، پر ہر وہ شخص جس میں یہ ہو، اچھا استاد نہیں ہوتا۔ محبت کے اس میلان کو ایک خاص طریقے سے کام میں لانے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیئے۔" پھر وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "مگر سمجھ لینا اور جان لینا بھی تو کافی نہیں۔ سمجھ کر، جان کر صحیح طور سے اثر ڈالنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیئے۔" لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ "اسے اپنے شاگرد کی بننے والی شخصیت کا رخ سمجھنا اور اس کے امکاناتِ ترقی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد کرنی ہوتی ہے۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ "استاد کا اصلی کام سیرت کی تیاری ہے اور ساری تعلیم کا بنیادی مقصد بھی ہوتا ہے۔ کہ بچے کے ارادے اور عمل کی قوت کو کسی سیدھی راہ پر ڈال دے اور سچے اصولوں کی روشنی میں اچھی عادتوں کی مدد سے اس کی سیرت میں یکسوئی اور پختگی پیدا کرے۔" وہ خود استاد کے لیے اچھی سیرت کی بھی قید لگاتے ہیں جو ان کے نزدیک زندگی کا کوئی مستقل ڈھنگ رکھنے والے کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں آخری بات یہ جتائی ہے کہ "استاد فوق البشر کا تصور بھی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے بس بچے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد۔"

ذاکر صاحب سیرت سازی اور اقدار کی پاسداری کو ہی تعلیم کا مقصد گردانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہم میں سے ہر ایک کے دل میں شیطنیت اور انسانیت موجود ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ شیطنیت کو ہمارے اندر دبائے۔ تعلیم کا سارا راز یہی ہے کہ حیوانیت کو دبائے اور انسانیت کی صفات کی پرورش ہو۔" (جلسۂ انجمن طلبہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقدہ ۱۱ اگست ۱۹۵۱ء۔ ذاکر حسین۔ ایک سوانح مصنفہ پروفیسر محمد مجیب/ ذاکر صاحب کے اپنے دل سے غالباً یہ شیطنیت قطعی طور پر دور ہو چکی تھی۔ ان کی زندگی کے قدم قدم پر تہذیب نفس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مجیب صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب جامعہ ملیہ کی اینٹ، عمارتوں کو فسادات کے سبب چھوڑنے کا خطرہ پیدا ہوا تو ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہمیں ہر چیز کو اس حالت میں چھوڑنا چاہیئے کہ وہ لوگ

جو ہمارے بعد یہاں قبضہ کریں، محسوس کریں کہ ہم اس سے محبت کرتے تھے۔" وہ تہذیبِ نفس کے دل سے قائل تھے اور مسلکِ انسانیت کے علم بردار۔ وہ نفاست ذوق اور لطیف احساس کو تربیت یافتہ ذہن کے نمایاں اوصاف شمار کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے نزدیک اعلا تعلیم کے اداروں کا منصب یار ول حسن، پاکی، صداقت اور تعاون کے اوصاف کا حامل بنانا ہے۔ ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا سب سے اہم اور افضل مقصد یہی ہے کہ وہ نوجوانوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرے۔ ذاکر صاحب کے مجموعۂ خطبات 'دی ڈائی نیمک یونیورسٹی' میں گیارہ خطبات شامل ہیں جو مختلف اوقات میں الگ الگ یونیورسٹیوں میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعے پر پیش کیے گئے۔ یہ ان کے آخری دور کی دین ہے جب کہ یکے بعد دیگرے وہ ملک کے سب سے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان خطبات میں دو تین کام کے تصوّر سے متعلق ہیں اور باقی سب تعلیم میں اقدار کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے افکار و اعمال کی روشنی میں یہ کہنا کسی طور بے جا نہ ہو گا کہ ان کی تعلیمی فکر کے نمایاں عوامل بچوں کی تعلیم، اور تعلیم میں اقدار کی پاسداری تیز سیرت کی تشکیل ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ آج تعلیم کا سب سے اہم فریضہ یہی ہے کہ وہ قومی ذہن پیدا کرے جو کہ سچے قومی نظام تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے، کیوں کہ اس وقت ہمارے سماج کو سب سے زیادہ تنگ دلی اور تاریک خیالی سے خطرہ لاحق ہے۔

ذاکر حسین

طبّی تعلیم

صاحبو!

آپ کا حکم تھا، حاضر ہوں، اور شکرگذار کہ آپ نے یاد فرمایا اور اس معزز مجلس میں خطبہ پڑھنے کی عزت مجھے بخشی۔ مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ ابھی تک میں ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا کہ اس گورنمنٹ طبیہ اسکول کے تقسیم اسناد کے موقع پر میں اس کام کے لیے کیوں بلایا گیا ہوں۔ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تو خیال آیا کہ کہیں میرے نام کے ساتھ جو کچھ دن سے ڈاکٹر کا لفظ لگ گیا ہے اُس سے تو دھوکہ نہیں ہوا، کبھی کبھی دیہاتوں اور قصبوں میں لوگوں نے مجھ سے نبض دیکھنے اور نسخہ لکھنے کی فرمائش اسی دھوکے میں کی ہے، لیکن ہمارے ملک میں تو یونانی طبیبوں اور ایلوپیتھی کے ڈاکٹروں میں کچھ ایسی بہت بنتی بھی نہیں ہے کہ اس شبہے میں مجھے یہاں بلایا جاتا!

پھر خیال ہوا کہ شاید یہ وجہ ہو کہ ایک تعلیمی ادارے کا جلسہ ہے۔ میں بھی ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہوں، استاد اور شاگرد کا تعلق، تعلیم و تدریس کا کام اور اس کی ذمہ داریاں کم و بیش ایک ہی سی ہوتی ہیں، چاہے تعلیم گاہ میں معیشت و سیاست اور فلسفہ و ادب کا درس ہوتا ہو یا تشریح و وظائف اعضاء اور طب و جراحت کا۔ لیکن آج کل ہر فن والا اپنی اپنی کمبلی میں کچھ ایسا مست رہتا ہے اور تعلیم گاہوں میں بھی کچھ ایسی رقابتیں سی دکھائی دیتی ہیں کہ اس کا بھی پوری طرح یقین نہیں آیا۔

پھر گمان ہوا کہ شاید مجھے امکانی بیماریوں کے اس گروہ کا نمائندہ سمجھ کر آپ نے دعوت دی ہو جو آپ کے شریف فن سے استفادہ کرتا ہے اور آپ کے نئے سند پانے والوں کے لیے کم از کم چند سال اور آپ کے بعض وضع دار ساتھیوں کے لیے عمر بھر تختۂ مشق کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہمارے دیس میں واقعی اور امکانی بیماروں کو

کچھ ایسی کمی نہیں ہے کہ نظرِ انتخاب مجھ تک پہنچتی۔

کسی ایک وجہ پر طبیعت پوری طرح جمی نہیں تو میں نے سوچنا بند کیا اور یہ طے کیا کہ جو تین وجہیں سمجھ میں آئی ہیں۔ انہیں کو ٹھیک مان کر آپ کے سامنے کچھ عرض کر دوں۔ پہلی بات یہ کہ جدید مغربی طب اور یونانی طب میں کیا واقعی کوئی بنیادی فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ میری رائے میں طب یونانی کی تعلیم میں کن باتوں کا خاص طور پر خیال ہونا چاہیئے اور تیسرے یہ کہ ہندوستان کا ہر معمولی شہری ان طبیبوں سے جو آپ کے مدرسے سے پڑھ کر نکلتے ہیں کیا توقع رکھتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جدید مغربی طب اور طبِ یونانی یا اسلامی سے آدمی جتنا ناواقف ہوگا اتنا ہی ان کے فرق پر اصرار کرے گا، ان کو جتنی اچھی طرح جانتا ہوگا اتنا ہی اس بات سے بھی آگاہ ہوگا کہ یہ اصل میں ایک، بس فرع میں مختلف ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مغربی طب، طبِ اسلامی کی بیٹی ہے۔ بیٹی نے ماں کی بہت سی چیزیں لے لی ہیں، مگر کچھ چھوٹ بھی گئی ہیں۔ بیٹی بڑے گھر بیاہی ہے، وسائل کی کمی نہیں، اس نے بہت کچھ نئی دولت حاصل کرلی ہے۔ شروع میں نئی دولت کا کچھ گھمنڈ تھا، کچھ کم عمری کی ناتجربہ کاری، ماں کی جو چیزیں رہ گئی تھیں انہیں ذرا حقارت سے دیکھنے لگی تھیں، یا ان کی طرف سے غافل ہو گئی تھی، مگر ہے ذہین اور ہوش مند، اب بھی ان چیزوں کو لے سکتی ہے اور غالبًا لے لے گی۔ ماں ذرا گردش میں آگئی، زمانہ بدل دیا، وسائل کی کمی رہی اس لیے جو کچھ اپنے پاس تھا اس کو بھی سنبھال کر نہ رکھ سکی۔ بدحالی میں کچھ ہمت بھی پست ہو جاتی ہے، نئی چیزوں کو حاصل کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہتا، کچھ مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتی ہے، اس لیے بیٹی کی چیزوں کی طرف ایک آنکھ دیکھنا بھی اسے نہ بھاتا تھا۔

مگر بیٹی کی دولت علم کی دولت ہے جس میں کسی کا اجارہ نہیں ہوتا، یہ اسی کو ملتی ہے جو اسے برتنے کو تیار ہو اور اسی کے پاس رہتی ہے جو اسے بڑھانے میں کوشاں اور دوسروں کو دینے پر آمادہ ہو۔ ادھر ماں کا مزاج بھی کچھ سنبھل رہا ہے اور زمانے کا رنگ بھی، یہ کیوں نہ ان چیزوں کو اپنا لے گی۔

بے شک اس اپنانے کے بعد بھی دونوں میں جغرافیائی اور معاشرتی ماحول کی وجہ

سے کچھ فرق رہے گا، سو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً بیٹی کے گھر میں جڑی بوٹیاں کم ہوتی ہیں، اکثر باہر سے لائی ہوتی ہیں، ظاہر ہے وہ اس تدبیر میں رہتی ہے کہ اُن کے جوہر نکالے، تاکہ آسانی سے اِدھر اُدھر بھیج سکے۔ پھر طبیعت بھی ذرا کاروباری ہے۔ سرمایہ داری نظام سے رشتہ ہے۔ اس کی نظر تو معلوم ہی ہے کہ ہر دم ہر چیز سے نفع طلبی پر لگی رہتی ہے۔ دواؤں سے بے شک انسانیت کا دکھ درد کم کرنا ہے، مگر نفع بھی تو کمانا ہے اور جہاں تک ہو سکے زیادہ نفع۔ بڑے پیمانے پر کاروبار کرنا ہے، کارخانے میں سال کے بارہ مہینے ایک ہی دوا بنتی رہے تو کیا کہنا۔ ایسا کرنے میں قدرت کی نامی چیزوں سے سابقہ ہو تو دِقت ہوتی ہے، چنانچہ یوں بھی سرمایہ داری نظام کا رجحان دولت آفرینی کے پورے میدان میں زندہ سے مردہ کی طرف ہے۔ وہ مکان اور پُل اور جہازوں میں لکڑی کی جگہ لوہا لگانا چاہتا ہے، سرسوں اور تلّی کے تیل کی جگہ مٹی کے تیل سے کام چلاتا ہے۔ اور پھولوں کی جگہ تارکول میں رنگ و بو کے خزانے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر ہے کہ جڑی بوٹیوں سے نجات ہی ملے اور غیر نباتی اجزا سے کام نکلے تو بہتر ہے نباتی اجزا کو بھی کیمیادی طریق پر بنایا جا سکے تو اچھا ہے اور یہ نہ ہو سکے تو جڑی بوٹیوں کے جوہر نکال نکال کر اور یوں وزن گھٹا کر اور مال میں یکسانیت پیدا کر کے ان کی بکری کا رقبہ تو بڑھا ہی لیا جائے۔

ماں کا گھر جڑی بوٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان میں سے بہیتری کو تو بیٹی نے ابھی برتا ہی نہیں۔ مگر ماں کے دیس میں ہر سو افلاس ہے۔ یہ منہگی دوائیں بیچ کر نفع کمانے کی سوچے تو یہاں کے غریب تو دوا کو ترس ترس کر ہی مر جائیں۔ یہ اگر ان کی قدرتی شکل کو بدل کر ٹکے سیدھے کرنے کی زیادہ فکر نہ کرے، تو کیا بُرا ہے۔ پھر دواؤں کو قدرتی شکل میں دینے سے ان کی بہت سے مضرتوں سے بھی بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ماں کا دواؤں کا خزانہ بیٹی سے کہیں بڑا ہے۔ اس کی دواؤں کے اثر صدیوں کے تجربے سے جانچے اور پرکھے جا چکے ہیں، بیٹی کی نئی دواؤں کو برتتے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، یہ بے شک بعض امراض کے لیے تیر بہدف ہیں، مگر ابھی کسے معلوم ہے کہ ان کے استعمال سے کہیں زندگی کی مدت پر تو اثر نہیں پڑتا یا نظام جسم میں ان سے کوئی اور بُرا اثر تو بعد کو پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے بیٹی کو اپنی نئی چیزوں پر بہت اترانا نہ چاہیے اور

ماں کو ان کا تجربہ کرنے سے زیادہ شرمانا نہ چاہیئے۔

غرض یہ کہ ادویہ کے معاملے میں باہمی لین دین کا اور طب اسلامی کو اس میں کچھ دینے کا ہی زیادہ موقع ہے۔ اس کے کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ جو بے شمار جڑی بوٹیاں ان کے برتاوے میں ہیں۔ اور جن پر ان کا ہزاروں سال کا تجربہ ہے۔ ان کے فعل کی جدید حکمی تحقیق کریں اور ان کے خواص سے طب مغربی کو آشنا کریں، ان کے نئے اسلوب سے کیمیاوی تحقیق کرکے ان کے افعال و خواص کا صحیح تر تعین کریں۔ طب اسلامی نے ہی جدید طب کی بنیاد رکھی۔ جب یورپ سو رہا تھا تو اس نے یونانیوں کے علم کو محفوظ کیا۔ اور اسے ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچایا اور پھر یورپ والوں کے سپرد کیا۔ آج بھی وہ اپنے خزینۂ ادویہ سے مغربی طب کو بہت کچھ دے سکتی ہے۔ پہلے چند سال میں جو کام اس سلسلے میں ہمارے ملک میں ہوا ہے، خصوصاً آیورویدک اور یونانی طبی کالج دہلی کے شعبۂ تحقیق میں ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب صدیقی کی تحقیقات نے اپنی طرف مغربی علمار کو متوجہ کیا ہے، ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ یہ سلسلہ بڑھے گا اور اگر ہم اپنے پرانے شاگردوں سے بہت کچھ لیں گے تو انھیں کچھ نہ کچھ دے بھی سکیں گے۔

آپ کی طب اور طبِ جدید کی سب سے اہم یکسانیت تو یہ ہے کہ دونوں کی بنیاد مشاہدے پر ہے۔ یونانیوں اور ان کے بعد کے مسلمانوں نے اس فن کی سب سے بڑی خدمت یہی کی ہے کہ توہمات کے گورکھ دھندے سے نکال کر مشاہدے اور معائنے پر اس کی بنیادیں استوار کیں۔ بقراط اور جالینوس سے کچھ زیادہ ہی رازی اور ابن سینا بھی طب کے محسن ہیں کہ انہوں نے اس فن کو حکمی بنیاد پر قایم کیا کہ پھر اسی بنیاد پر یورپ نے تعمیر کو اور اونچا اٹھایا۔ اس حکمی بنیاد کے لیے مرض اور علاج کے مشاہدے کی وسعت ازبس ضروری ہے۔ آج طبِ جدید جس وسیع پیمانے پر مشاہدات جمع کر رہی ہے اس سے آدمی حیرت میں پڑ جاتا ہے لیکن آپ کے پاس بھی ہزاروں سال کے جمع کیے ہوئے مشاہدوں کا خزانہ ہے۔ افسوس کہ اس کا بہت سا حصہ مشاہدہ کرنے والوں کے ساتھ ضائع ہو گیا، مگر پھر بھی آپ کی خاندانی اور تعلیمی روایات میں بہت کچھ باقی ہے اور آپ کی قدیم کتابوں میں مختلف ملکوں اور مختلف حالتوں میں جمع کیے ہوئے مشاہدوں کا اتنا ذخیرہ ہے کہ آج پھر دنیا کے سامنے لایا جائے تو شاید فنِ طب

مزید ترقی میں اور اس کے تحقیق کرنے والوں کو نئی راہیں سمجھانے میں بڑی مدد دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان مشاہدوں کی ایسی توجیہوں پر اڑنے کی جگہ جن کو بعد کے واضح تر مشاہدوں نے باطل ثابت کر دیا ہے خود ان مشاہدوں کو لیں، اور ان پر حکمی کام کریں۔ بیماریوں کی پہچان اور ان کے علاج کے متعلق آپ کے اساتذہ کی کتابوں میں جو تفصیلیں درج ہیں (جیسے ابوبکر محمد زکریا رازی کی "حاوی" جس کے قلمی نسخے آج یورپ کے کوئی نصف درجن کتب خانوں میں منتشر پڑے ہیں اور کسی محنتی محقق کی کاوش کے منتظر ہیں) ان کے مطالعے سے آج بھی مفید نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ یا آپ کا نباضی کا فن ہے اس میں ہزاروں برس کے مشاہدوں کا نچوڑ ہے اور ان چیزوں کو مغرب کے ماہرین امراضِ قلب آج پھر سے معلوم کر رہے ہیں۔ جس چیز پر آج سے کچھ برس پہلے وہ اور ان سے زیادہ ان کے جاہل چیلے ہنسا کرتے تھے، اس کی باریکیوں کا پتا چلانے پر آج خود نت نئے آلات کی مدد سے متوجہ ہیں۔ آپ کا فن اپنے ہزاروں سال کے مشاہدے کی مدد سے اس نئی تحقیق کو کامیابی کی بہت سی راہیں بتا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر فن پر اس کے معاشرتی ماحول کا اثر بھی ہوتا ہے۔ آپ کی طب، جس زمانے میں بڑھی تھی وہ فرد سے زیادہ جماعت کا اور جزو سے زیادہ کل کی اہمیت کا زمانہ تھا۔ مغربی طب کی ترقی اس عہد میں ہوئی جب یورپ جزو پرستی کے دور سے گذر رہا تھا۔ جمہوری سیاست، لبرل فلسفہ، استقرائی سائنس سب کا تقاضا یہ تھا کہ توجہ کل کی طرف سے ہٹ کر جزو کی طرف آئے۔ اس رجحان کے پیدا کرنے میں بھی ضرور عربی اسلامی اثرات ذہنی کا کچھ حصہ تھا اور یہ چیز حدود مناسب میں ہے بھی درست، مگر زیادتی تو ہر چیز کی بری ہوتی ہے، ہوتے ہوتے ہوا یہ کہ جزو پر توجہ دینے نے کل کی طرف سے غافل کر دیا۔ اور لوگ درختوں کے دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ جنگل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ طب میں بھی یہی ہوا۔ امراض کی جزوی تحقیق اور مخصوص امراض کے ماہرین کے الگ الگ کام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریض کی پوری شخصیت پر سے نظر ہٹ گئی۔ آپ کی طب کا مسلک اس باب میں اور تھا، افلاطون کے ایک مشہور مکالمے میں سقراط نے پوچھا ہے "کیا تم خیال کرتے ہو کہ کل کی ماہیت کا پتا لگائے بغیر تم روح کی ماہیت کو سمجھ سکتے ہو؟" فوراً اس نے جواب دیا ہے کہ "جی

بقراط کا قول یہ ہے کہ (روح تو روح ہے) جسم کی ماہیت بھی بہ حیثیت کُل ہی کے سمجھی جا سکتی ہے۔"

آج مغربی زندگی کے سانچے پھر بدل رہے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں اس وقت جزو سے کل کی طرف رُخ ہے، اس لیے میرا تو خیال ہے کہ مغربی طب بھی، جو ایک صحیح راہ پر ذرا نامناسب حد تک بڑھ گئی تھی، وہ وہاں سے لوٹے گا اور آپ کی طب کی یہ خصوصیت کہ مریض کی پوری شخصیت کے پیش نظر اس کے جزوی دکھ درد کا درماں تلاش کرتی تھی، پھر جدید طب کی مشق میں بھی واپس آئے گی اور کیا عجب ہے کہ مزاجوں اور طبیعتوں کا وہ نظریہ جس سے آپ تشخیص مرض اور تجویز علاج میں کیا کچھ مدد نہیں لیتے، پھر جدید طب میں زیادہ مفصّل اور مدلّل اور واضح ہو کر داخل ہو۔

لیکن جہاں آپ کی طرف سے جدید مغربی طب پر یہ اثر پڑ سکتے ہیں جہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ جدید طب نے جن پرانی غلطیوں کو رد کر دیا ہے، جو نئی باتیں معلوم کی ہیں، انہیں آپ کھلے دل سے قبول کریں۔ تحقیق کے جدید طریقوں کو اپنائیں کہ آپ ہی کے پرانے مگر بھلائے ہوئے طریقے ہیں، نئی حکمی بول چال کے اسلوب سیکھیں کہ اپنی سمجھائیں اور دوسرے کی سمجھ سکیں۔ اصطلاحوں کے اختلافات ہی سے نہ جانے کتنے پردے پڑ گئے ہیں، ایک ہی بات کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو مخالف سمجھتے رہتے ہیں۔ آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ دیجیے اور ان کے پاس جو ہے وہ لیجیے۔ علم اس کی ملکیت ہوتا ہے جو اسے ڈھونڈھتا ہے اور اسے برتتا ہے۔ اپنی پرانی کتابوں کو کھنگال ڈالیے، ان سے ابھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ اسے سیکھیے اور اوروں کو سکھائیے، دوسروں کی کتابوں میں جو ہے وہ اپنی زبان میں منتقل کیجیے۔ آپ کے اجداد اگر اسی پر اکتفا کرتے جو اُن کے پاس تھا تو آپ کا فن کہاں ہوتا؟ انھوں نے حنین ابن اسحاق اور عیسیٰ ابن یحییٰ اور ثابت اور ابراہیم کے ساتھ مترجموں کی فوجیں لگا دی تھیں اور جہاں سے جو کچھ بھی ملا اپنی زبان میں منتقل کرا لیا تھا اور پھر اسی کی بنیاد پر آگے کام بڑھایا تھا۔ آج یونانیوں کی بہت سی تحقیقاتیں دنیا کو عربی ترجموں ہی کے ذریعے مل سکتی ہیں۔ آپ کے فن کے باوا آدم جالینوس کی تشریح آج یونانی میں نایاب ہے اور عربی ترجمے ہی کے ذریعے دنیا تک پہنچی ہے۔ دنیا کے انقلابوں کو کون پہلے سے دیکھ سکتا ہے، کیا ہوا، شاید

جدید مغربی طب کی چیزیں آنے والی نسلوں کو ہندوستانی ترجموں سے پہنچیں۔ لیکن ایسا تب ہی ہو سکتا ہے کہ آپ میں علم کے لیے وہی لگن ہو جو آپ کے بزرگوں کو تھی اور سیکھنے کا وہی ولولہ جو ہر جگہ اور ہر شخص سے اچھی بات سیکھنے پر آمادہ رکھتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں دونوں گروہوں میں تاریخی نظر اور بے تعصبی کی ضرورت ہے۔ یہ پیدا ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائیں اور طبیہ اسکول میں تقسیم اسناد کے موقع پر کسی ڈاکٹر کو اور میڈیکل کالج کے جلسے میں کسی یونانی طبیب کو بلانے میں دونوں تامل نہ فرمائیں۔

میں نے اوپر جن صفات کا ذکر کیا ہے یعنی اپنے اوپر بھروسا اور دوسرے سے سیکھنے پر آمادگی، وسعتِ نظر اور بے تعصبی، ان کے پیدا کرنے کا کام بہت کچھ طب کے تعلیمی اداروں کے ذمّے ہے۔ اجازت دیجیے کہ طب یونانی کی تعلیم کے متعلق چند خیال مختصر طور پر پیش کروں۔ سو پہلی بات جس کا کہنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ ان تعلیم گاہوں کو ہر دم یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ طب ایک فن ہے، علم پر مبنی اس کے تعلیم پانے والے کو اسے علم کی طرح جاننا اور فن کی طرح سیکھنا چاہیئے۔ علم سچائی کا پتہ چلانا چاہتا ہے، دوسرے کے کہے پر شبہہ کرتا ہے، پھر اپنے مشاہدے اور فکر سے اس شبہے کا حل ڈھونڈھتا ہے اور جب اسے پا جاتا ہے تب ہی مطمئن ہوتا ہے۔ فن کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے صحیح ذریعوں کی تلاش کرنا اور انہیں برتنے کے طریقے نکالتا ہے۔ فن بتاتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، علم بتاتا ہے کہ کیوں ایسا ہوا۔ طب میں علم کے بغیر فن اندھا رہتا ہے اور فن کے بغیر علم بے سود، اچھی طبّی تعلیم گاہ کا کام یہ ہے کہ طب کا علم اور طب کا فن دونوں سکھائے۔

یہ ضرورت اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ اس فن کے لیے بے علم دعوے داروں کی دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی۔ قدیم الایّام سے ہر شخص نے اس میں طبع آزمائی کی ہے اور آج تک تقریباً ہر مریض اور ہر تیمار دار نسخوں میں تبدیلی کی فرمائش کرنا اور تشخیص میں مشورہ دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ کسی رئیس کا قصّہ ہے کہ انہیں ایک دفعہ یہ خیال آیا کہ آؤ معلوم کریں کہ شہر میں کون سے پیشے والے سب سے زیادہ ہیں۔ ان دنوں اعداد و شمار مرتب ہو کر شائع نہیں ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے

پوچھا۔ کسی نے کچھ بتایا، کسی نے کچھ۔ دربار کے مسخرے نے کہا، "حضور طبیب سب سے زیادہ ہیں"، طبیب اس شہر میں کچھ ایسے بہت تھے نہیں، سب نے اس کی تردید کی تو مسخرے نے کہا۔ "بہت اچھا۔ زندگی ہے تو کسی دن اپنے قول کا ثبوت پیش کر دوں گا۔" دوسرے ہی دن صبح مسخرے نے اپنے چہرے پر اوپر سے نیچے ایک چوڑی سی پٹی لپیٹی اور گھر سے نکلا، پہلا ہی شخص جو دروازے پر ملا اس نے پوچھا، "کیوں بھائی کیا ہوا؟" مسخرے نے کہا، "ڈاڑھ میں درد ہے، رات بھر پلک سے پلک نہیں لگی۔" جواب ملا "بھائی بڑی ہی اچھی دوا ہے اس کی ہزار بار کی مجرّب۔ فلاں فلاں چیز لو اور پیس کر مل لو۔ بھلا درد کھڑا تو رہ جائے۔" مسخرے نے ایک پرزے پر کچھ لکھا جیسے دوا کا نام لکھ رہا ہو مگر لکھا تھا طبیب صاحب کا نام چند قدم آگے ہی بڑھا ہوگا، ایک اور بزرگ ملے "ارے بھائی یہ کیا ہے؟" مسخرے نے پھر وہی روداد سنائی۔ جواب ملا "بھائی! اس کی تو بڑی اچھی دوا میرے پاس ہے ایک سادھو نے بخشی تھی، فلاں فلاں چیز لے کر پانی میں جوش دو اور اس سے غرارہ کرلو۔ ایک ہی دفعہ میں درد غائب ہو جائے گا۔" مسخرے نے ان کا نام بھی ٹانک لیا۔ راستے بھر قدم قدم پر کوئی صاحب ملتے اور کوئی نہ کوئی مجرّب نسخہ تجویز فرماتے اور یہ سب طبیبوں کا نام درج کرتا جاتا۔ ہوتے ہوتے رئیس صاحب کے محل پر پہنچا، نوکروں ساتھیوں میں جو ملتا ہے۔ یہی پوچھتا ہے کہ "کیا ہوا؟" کہا، "حضور ڈاڑھ میں سخت درد ہے۔ رات بھر سویا نہیں، جی چاہتا ہے کہ دیوار سے سر دے ماروں۔" "نہیں میاں" رئیس صاحب بولے "یہ بھی کوئی بیماری ہے، اس میں کیا رکھا ہے۔ اٹھانا تو وہ میری لال بیاض اس کے تو دسیوں مجرّب نسخے ہیں۔ لو، یہ دوائیں منگالو، سب کو پیس کر پوٹلی بنالو اور گرم کر کے ذرا سینک لو درد غائب" مسخرے نے رئیس صاحب کا نام بھی درج کرلیا۔ پٹی کھول دی اور دست بستہ گزارش کی کہ "حضور جب میں نے کل یہ عرض کیا تھا کہ طب کا پیشہ سب سے زیادہ عام ہے تو خود مجھے بھی خبر نہ تھی کہ اتنے طبیب ہوں گے۔ گھر سے یہاں تک آتے آتے کوئی سو سے اوپر تو طبیب مجھے مل گئے۔ فہرست ملاحظہ ہو۔ حضور کا نام بھی طبیبانِ حاذق کی اس فہرست میں درج ہے۔"

یہ صورتِ حال کچھ ہمارے ہی ملک سے مخصوص نہیں، نہ اَن پڑھ جاہلوں تک محدود ہے، مثلاً انگلستان کے اہلِ حکمت کی سب سے معروف سبھا، رائل سوسائٹی

کے قایم کرنے والے، کیمیائے تحلیلی کے بانی، گیسوں کے پھیلاؤ کے متعلق اس مشہور قانون کے دریافت کرنے والے جو آج تک ان کے نام سے موسوم ہے یعنی رابرٹ بوائل Robert Boyle نے بھی ابھی ڈھائی سو برس بھی نہیں ہوئے ایسے ہی مجرب نسخوں کا ایک مجموعہ شائع کرایا تھا جو بہت سی بے کار اور بہت سی مضر دواؤں سے پُر تھا۔ اسے بھی کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا ہے کہ انگلستان کے مشہور امیر Sir Kenelm Digby نے ایک "سفوفِ ہمدردی" ایجاد فرمایا تھا کہ کسی مجروح شخص کے خون آلود کپڑوں کو اس سفوف کے محلول میں تر کرنے سے زخم اچھے ہوجاتے تھے۔ اس سفوف کو ہزاروں زخمیوں نے استعمال کیا ہوگا اور سینکڑوں راست باز انگریزوں کے صداقت نامے اس کی تاثیر کی شہادت دیتے ہیں، خون آلود کپڑوں کو محلول میں بھگو دیا اور بس درد گھٹنے لگا، زخم مندمل ہونا شروع ہوگیا۔ خود ہمارے ملک میں ہمارے ہی زمانے میں ایسے "تقدس مآب" علاج کرنے والے گزر چکے ہیں جن کی تصویر کو صبح سویرے دیکھنے سے ہزاروں بیمار اچھے ہوجاتے تھے! سینکڑوں نیک دل لوگوں کی تصدیقیں موجود ہیں۔"

میں نے اس خطرے کا ذکر اس لیے ذرا تفصیل سے کیا ہے کہ اگر آپ کی تعلیم اس کا علاج نہ کرسکی تو گویا اس نے اپنا بنیادی کام انجام نہیں دیا۔ آپ کا فن مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے، لیکن بقول بقراط "مشاہدہ بڑے دھوکے دیتا ہے اور صحیح حکم لگانا بڑا دشوار ہے۔" آپ کی تعلیم کا پہلا کام یہ ہے کہ صحیح مشاہدے کی صلاحیت پیدا کرے، اس کے دھوکوں سے بچنے اور صحیح مشاہدوں سے صحیح نتیجوں پر پہنچنے کی مشق کرائے۔ ٹھیک دیکھ سکنا اور منطقی طور پر سوچ سکنا سکھا دیجیے تو آپ نے تعلیم کا تین چوتھائی کام کر دیا۔ اوپر جن لوگوں کا ذکر ہوا یہ سب ارادے سے دھوکا نہ دیتے ہوں گے اور جو ان کی بات مانتے تھے وہ سب بالکل گدھے نہ ہوں گے۔ بات صرف اتنی ہے کہ منطقی طور پر سوچنے کی صفت آدمیوں میں عام نہیں ہوتی، تعلیم بھی اکثر اس ضروری کام کی طرف سے غفلت برتتی ہے اور سمجھتی ہے کہ کچھ کتابیں رٹا دینے، کچھ نسخے لکھا دینے کچھ عجیب عجیب نام یاد کرا دینے سے آدمی تعلیم یافتہ ہوجاتا ہے، حالانکہ تعلیم کا کام ہے ذہن کی نشو نما اور اس میں تربیت اور مشاہدے کے دھوکوں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ دھوکے بازی اور ضعیف الاعتقادی کی جو مثالیں اوپر بیان ہوئی ان میں

بس یہی غلطی تو عام طور پر ہوتی ہے کہ اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز کے بعد ظاہر ہو تو لوگ پہلی کو علت اور دوسری کو معلوم سمجھ بیٹھتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ اس کے بعد ہوا ہے اس لیے اس کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ حالانکہ منطقی طور پر سوچنے والا ہمیشہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا یہی نتیجہ بغیر پہلی والی بات کے بھی رونما ہوتا یا نہیں۔ یا یہ کہ کہیں یہ نتیجہ باوجود اس پہلی بات کے تو پیدا نہیں ہوا۔ ان سوالوں کے جواب کے لیے وہ اپنے مشاہدے کو تجربے سے جانچتا ہے۔ کچھ حالات کو بدلتا ہے، کچھ کو ان کے حال پر رہنے دیتا ہے اور یوں رفتہ رفتہ علت اور معلول کے تعلق کا پتا چلاتا ہے۔

اگر آپ اپنے شاگردوں کو طب کی ساری کتابیں حفظ کرا دیں لیکن ان میں مشاہدے اور مشاہدے کی جانچ کی عادت راسخ نہ کریں تو آپ طب کی تعلیم نہیں دیتے، عطائی بناتے ہیں۔ آپ کے فن میں اس کا خطرہ اور زیادہ اس وجہ سے ہے کہ یہ تمام تر مشاہدے پر مبنی ہے۔ اگر علم کا سہارا اسے نہ ہو تو یہ رفتہ رفتہ فنِ طب کے درجے سے عطائی کے درجے پر، اور عطائی سے خطرہ جان کے منصب پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں طبی تعلیم کے انتظامات کی خرابی نے اس فن کو پست ترمنازل تک پہنچانے میں کیا کمی کی ہے! آپ کا فرض ہے کہ اسے اس کی علمی بلندی سے گرنے نہ دیں بلکہ بلند تر مرتبے پر اسے پہنچائیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ بجائے اس کے کہ سب کچھ تھوڑا تھوڑا بتایا جائے۔ چند چیزیں اچھی طرح سکھائی جائیں۔ نصاب کو ہر طب ویابس سے بھر دینے کی جگہ اس کا اہتمام ہو کہ بنیادی علوم، کیمیا، تشریح اور وظائف الاعضاء سے طلبہ کو گہری واقفیت ہو جائے، محض دفع الوقتی اور امتحان پاس کرنے کے لیے نہیں بلکہ حقیقی طور پر ان کے بنیادی اصولوں سے طلبہ روشناس ہو جائیں، ان علوم میں جس طرح ترقی ہوتی ہے اس کے گر کو سمجھ لیں اور تجربہ گاہوں اور جراحت خانوں میں ان طریقوں کو برت بھی لیں جن پر چل کر فن کے اساتذہ نے کمال حاصل کیا ہے، تو بڑی بات ہو۔ ان راہوں پر چلنے کا وقت تو ساری عمر ملتا رہے گا لیکن ان پر چلنے کی صلاحیت اور خواہش طالب علمی کے زمانے میں ضرور پیدا کر دینی چاہیے۔ یہ علم وسیع نہ ہو تو نہ ہو مگر گہرا ہو کہ اس کی گہرائی آپ کے طلبہ کو عطائیت کے اتھلے پن سے بچائے گی۔

اور سب سے زیادہ یہ کہ آپ کو کتابوں کی تعلیم سے کہیں زیادہ توجہ عملی تعلیم کی طرف کرنی چاہیئے۔ مشاہدے اور تجربے کی مشق کا موقع بھی طالب علم کو شفاخانے میں ملے گا اور عملی طور پر علاج اور دیکھ بھال کرنے کا بھی۔ یہیں اس کی علم کی بنیادیں بھی استوار ہوں گی اور فن کی مہارت بھی حاصل ہو سکے گی۔ آج مغربی طب کی تعلیم گاہوں کے ساتھ جیسے تجربہ گاہوں اور شفاخانوں کا اہتمام ہوتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس سے کم درجے پر اسلامی طب کے اداروں کے ساتھ ہو۔ اسلامی طب نے جن دنوں یونانیوں کے علم کو چار چاند لگائے تھے تو اس کی تعلیم کے لیے بھی یہی ساز و سامان ہوتا تھا۔ آج سے ہزار سال پہلے کے اس شفاخانے کا حال معلوم کیجیے جو احمد بن طولون نے قاہرہ میں قایم کیا تھا۔ پھر مارستیان الکبیر المنصوری کا حال پڑھیے، جو ۱۲۸۴ء میں وہیں قایم ہوا، اس کے مصارف کے تخمینے دیکھیے، ہر مرض کے مریضوں کے لیے الگ الگ رہنے کے انتظامات کا ذکر دیکھیے، بیماریوں کے کھانے کی تیاری کے اہتماموں کی تفصیل سنیے، شفاخانے کے ساتھ تعلیم کے لیے درس کے کمروں کا اہتمام دیکھیے، دواؤں کے علاحدہ خزینوں کی تفصیلات معلوم کیجیے، تو خیال ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے کسی بہت بڑے مغربی شفاخانے کا حال سامنے ہے۔ پھر تیرہویں صدی کے وسط میں تبریز میں رشید الدین فضل اللہ کے ربع رشیدی کی سیر کیجیے۔ اس کے خطوں میں تمام دنیا سے اچھی سے اچھی دواؤں کی بڑی مقداروں کے آرڈر دیکھیے اور اس کی زیر نگرانی تعلیم طب کی تفصیلات معلوم کیجیے، تو خیال ہوتا ہے کہ صحیح تعلیم دینے کا اہتمام آج بھی کہیں اس سے بہتر نہیں ہے۔ اس ایک طبیب وزیر نے ہندوستان مصر، شام اور چین سے پچاس باکمال طبیب جمع کر لیے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے فن میں وحید عصر ہے، ہر ایک کے ساتھ صرف دس دس چنے ہوئے ہونہار طالب علم مقرر ہیں۔ ان کے ذمے میں شفاخانے متعین فرائض ہے۔ یہ بیماروں کی حالت کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کے نوٹ رکھتے ہیں اور اپنے استادوں سے ان کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، شفاخانوں کے کاموں کے لیے ہر طرح کے ماہر و مددگار ہیں، جن کے ساتھ عملی کام سیکھنے کے لیے پانچ پانچ مددگار طالب علموں میں سے ہیں۔ ان طلبہ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انھیں صحیح مشاہدے کا ڈھب آجائے گا اور مشاہدے سے صحیح نتیجے نکالنے

کا سلیقہ سیکھ لیں گے، ان سے امید ہو سکتی ہے کہ یہ مشاہدے کے دھوکوں سے بچ سکیں گے اور اپنے فن کے مرتبے کو اپنی محنت اور تجربے سے بلند کریں گے۔ میری رائے میں تو آپ کے فن کی تعلیم میں کامیابی کا گُر بس یہی ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں بنیادی چیزیں سکھائیے، فروعات کو چھوڑیئے کم چیزیں سکھائیے اور کتابوں کی جگہ عملی کام کی طرف زیادہ توجہ کیجیے۔ طالب علموں میں استاد اپنی مثال سے، اپنے فن سے شغف، اس کی شرافت کا احساس، محنت کی لت، کام کو ہمیشہ اپنے بس بھر اچھی سے اچھی طرح کرنے کی عادت، مریضوں سے ہمدردی کی خو پیدا کر دیں اور ان کی ذہنی تربیت کا وہ انتظام جس کا ذکر کر چکا ہوں، تو انہیں مطمئن ہونا چاہیئے کہ ایک شریف فن کے اچھے اہل فن ان کی مدد سے پیدا ہوئے اور یہ اطمینان اتنا بڑا انعام ہے کہ کوئی معلم اس سے زیادہ کی آرزو نہیں کر سکتا۔

اب اس مدرسہ طبیہ کے کارکنوں سے اور خصوصًا ان طلبہ سے جو اس سال فارغ ہوئے ہیں اور آج سند لے رہے ہیں، اس گروہ کی طرف سے کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کی خدمت ان کے سپرد ہے، یعنی عام ہندوستانی شہریوں کی طرف سے، اس آبادی کی طرف سے جس کا افلاس، جس کا جہل اور جس کی غلامی اسے اکثر حالتوں میں یہ جاننے بھی نہیں دیتی کہ تندرستی کسے کہتے ہیں، علاج کس کا نام ہے دکھ درد میں کوئی مدد بھی دے سکتا ہے، اور مرنا بھی ہو تو موت کے کرب کو کوئی کم بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس آبادی کی طرف سے جس کی فوجیں چیچک ہیضے، طاعون میں ہر سال ایک بے توپ، بے بندوق کی لڑائی میں کام آجاتی ہیں، جس کے لاکھوں آدمی ہر سال ملیریا میں مبتلا ہوتے اور مرتے ہیں اور مرنے سے بچتے ہیں تو عمر بھر کو اپنی کارکردگی کھو بیٹھتے ہیں، جس نے ایک انفلوئنزا کی وبا میں دو سال کے اندر کوئی پچاسی لاکھ آدمی ہاتھ سے کھو دیئے تھے، اس آبادی کی طرف سے جو مرض کے حملوں کے سامنے ایسی ہی بے بس ہے جیسے شیر کے سامنے بکری، جو نہ حفظانِ صحت کے قواعد سے واقف ہے نہ مرض کے مقابلے کی تدبیروں سے، جو سِسک سِسک کر جینا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا جانتی ہے اور اپنی بے حسی اور بے بسی کو صبر کا نام دے کر خوش ہو لیتی ہے۔ اس آبادی کو بیماریوں سے بچانا

بیماری میں اس کا علاج کرنا آپ کے سپرد ہے۔ اس میں گنتی کے تھوڑے سے لوگ
کھاتے پیتے ہیں، باقی مفلس اور نادار۔ خوش حال بس ایسے ہیں جیسے کسی غریب کی
ہانڈی میں شوربے پر چکنائی کی چند بوندیں۔ اب آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ اپنی
تمام تر توجہ ان گنتی کے خوش حالوں پر صرف کریں گے جو بھوک سے نہیں زیادہ کھانے
سے بیمار ہوتے ہیں یا ان پر جن کے بچوں کی ہڈیاں ٹھیک غذا نہ ملنے کی وجہ سے پوری
نشو نما تک نہیں پاسکتیں اور جو زندگی میں کبھی ایک دفعہ بھی سیر ہو کر کھانا نہیں
کھاتے، اس لیے کسی مرض کے حملے کا اچھی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آپ کا جی بھی
خوش حالوں میں شریک ہونے کو چاہتا ہو تو غالباً آپ خوش حالوں کے لیے مقوی
معجونوں اور ہاضم چورنوں کے نسخے لکھنے میں عمر گزار دیں گے۔ مگر دیس کا کام اس
سے نہیں چلے گا۔ یوں تو آدمی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا
ہے۔ پر آپ کے چاروں طرف جو دکھ اور بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور رفاقے
نے عام صحت کا جو حال کر رکھا ہے، جہل نے جس طرح اس بُری حالت کو اور
بدتر بنا دیا ہے اس کا احساس آپ کو ہوگا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی
کی بپتا، دکھ اور بیماریوں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے
ہیں، آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے۔ اور ہم
انہیں سن نہیں سکتے اور شاید اپنی زندگی گزارنے کے لیے یہ ٹھیک ہی ہو، اس
لیے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سنائی دے اور ہر دکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے
جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سننے لگے اور ہر جاندار کے دل کی دھڑکن
محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لاسکیں جو بپتا کے اس
سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ سنائی دے کر چاہے ہمارے کانوں کے پردے نہ
پھاڑے اور دکھائی دے کر ہماری آنکھوں کو رُلا رُلا کر بے نور نہ کرے، مگر اس کے
وجود کا علم ہمیں ہے اور اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔ میری التجا آپ سے یہ ہے کہ
اس دکھ کے دور کرنے کے لیے آپ کمر باندھیں۔ ہمت سے سب کام ہو جاتے ہیں
چیچک کی وبا جس سے آپ ہی کے صوبے میں ہزاروں آدمی ہر سال مرتے ہیں، یورپ
میں بھی ایسی ہی عام تھی جیسی ہماری یہاں ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔ وہاں تو تقریباً

ہر شخص کو یہ مرض ہوتا تھا۔ ہر بارہ آدمیوں میں سے ایک آدمی اس میں ضائع ہوتا تھا۔
جو بچ جاتے تھے ان کی بدنما آنکھیں اور چہرے عمر بھر اس مصیبت کی یاد دلاتے تھے۔
امیر غریب سب اس کے ہاتھوں تنگ تھے۔ نہ معلوم کتنے بادشاہ اس کے شکار ہوئے۔
اٹھارویں صدی میں کوئی چھ کروڑ آدمی یورپ میں اس مرض سے مرے یعنی ہر سال
کوئی چھ لاکھ۔ لیکن آج یورپ اس وبا سے تقریباً پاک ہے۔

طاعون کی وبا جس میں آج بھی ہمارے ہزاروں نہیں لاکھوں ہم وطن ہر سال
جان دیتے ہیں کبھی دوسرے ملکوں میں بھی عام تھا۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ
لکھا ہے کہ ،، اگر پوچھا جائے کہ دنیا کی تاریخ میں سب سے اچھا زمانہ کون سا تھا تو میں
روم کا سنہ ۹۶ اور ۱۸۰ عیسوی کے درمیان کا زمانہ بتاؤں گا۔" گبن بڑا مؤرخ ہے اور
اس کی بات کچھ وزن رکھتی ہے مگر آپ کو کچھ معلوم ہے کہ تاریخ کے اس "بہترین"
زمانے میں روما میں کم سے کم تین بار طاعون کی وبا پھیلی اور سنہ ۱۶۴ء سے تو برابر
سولہ سال جاری رہی۔ اس بہترین دور کا آغاز اسی وبا سے ہوا اور اس شدت کی
وبا سے کہ ایک ایک دن میں دس دس ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ اسی زمانے میں سارے
ملک میں ملیریا پھیلا اور تین صدی تک ملک کو برباد کرتا رہا، تا آنکہ جرمن جنگلوں
کے غیر متمدن قبیلوں نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ لیکن باوجود اس کے گبن نے
اسے سب سے اچھا زمانہ اس لیے کہا کہ گبن کے زمانے تک اس وبا کے جو حملے یورپ
میں ہوتے رہے وہ ان سے بھی زیادہ ہولناک تھے۔ گبن کے لکھنے کے وقت یورپ
میں ہوتے رہے چار صدیاں گزر چکی تھیں۔ ان مغربی شہروں میں بھی یہاں کی طرح
روزانہ ہزاروں موتیں ہوتی تھیں مگر آج اس مرض کے اسباب معلوم ہو جانے سے
اور انہیں قابو میں لانے کی کوشش سے یورپ اس مرض سے آزاد ہو گیا۔ ابھی ۱۷۹۲ء
میں فلے ڈیلفیا کی آبادی میں ہر سو میں دس آدمی پیلے بخار کا شکار ہو گئے تھے۔ مگر امریکن
ڈاکٹروں کے علم اور محنت نے اپنے ملک کو اس عذاب سے بچا لیا۔ اور مثالیں دینے
سے کیا فائدہ آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے، مضبوط دل اور بلند ہمت
لوگوں کے کرنے کا کام ہے، خود غرضوں کے لیے پیسے کمانے کا موقع ہے مگر ان کے
سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ انہوں نے اپنے بنی نوع، اپنے ہم قوموں کے افلاس

جہل، غلامی، بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے ٹکڑے جمع کر لیے اور مرض اور بیماری کے خلاف جہاد کرنے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلانے کے مبارک کام میں ہاتھ نہ بٹایا۔ بے شک اپنی گزر اوقات کے لیے بھی ہر آدمی کو کچھ درکار ہوتا ہے۔ آپ کی گزر اوقات کا انتظام حکومت کو کرنا چاہیئے۔ آپ کے پیشے کے لوگوں کے لیے پرانے زمانے میں یہی دستور تھا۔ حکومت ان کی سب ضرورتیں پوری کرنے کا انتظام کر دیتی تھی اور یہ یکسوئی سے امیر و غریب کی خدمت بلا امتیاز کیا کرتے تھے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں جب کہ حکومت کا سہارا اُٹھ گیا تھا جس طرح طبیبوں کے بہت سے مشہور خاندانوں نے سارے ملک میں غریبوں کی خدمت کی ہے وہ ہماری قومی زندگی کا سرمایۂ فخر ہے۔ دولت کے زنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی چیز اتنی مؤثر نہیں ہوتی جتنا کہ بے غرض کام کرنے والوں کا ایسا گروہ جو اس کے طوق زریں کا آرزومند نہ ہو بلکہ جس کی ساری توجہ حق کی تلاش، سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت کے لیے وقف ہو۔ میری دعا ہے کہ آپ کے مدرسے سے سند لینے والے اس گروہ میں شامل ہوں اور سچے سپاہیوں کی طرح دیس کو جہالت اور بیماری کے دشمنوں سے نجات دلائیں۔

ذاکر حسین

تعلیم اور روایتی قدریں

(انڈین نیشنل کمیشن کا جسے مرکزی وزارت تعلیم نے یونیسکو کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے بنایا ہے، سہ روزہ اجلاس پچھلے ماہ ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس ادارہ کے متعلق ایک تعارفی مضمون "تعلیمی مسائل" کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اجلاس کے آخری دن "تعلیم اور روایتی اقدار" کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہوا تھا، جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ نے فرمایا تھا۔ اس افتتاحی خطبہ کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شروع میں "افتتاحی رسم" کے روز افزوں رواج پر اپنے مخصوص انداز میں لطیف طنز فرمایا تھا، مگر ہم صرف وہی حصہ شائع کر رہے ہیں، جو اصل موضوع سے متعلق ہے۔ اس سلسلے کی بعض دوسری تقریروں کے ترجمے بھی آئندہ اشاعتوں میں شائع کیے جائیں گے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے املا کرایا ہے۔)

آپ حضرات اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم میں روایتی اقدار کی کیا اہمیت ہے۔ بہتر ہے کہ پہلے ہم ان الفاظ کے معنی کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لیں، جو اس سوال میں استعمال کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ نوع انسانی کا ہر فرد تین طرح کے وظائف انجام دیتا ہے، جسمانی یا نباتی، دماغی یا حیوانی اور ذہنی یا روحانی، جنہیں ہم مخصوص

انسانی وظائف کہہ سکتے ہیں۔ جسمانی اور دماغی وظائف کا اظہار پہلے ہوتا ہے
ان کے انجام دینے میں بچے کو پہلے پہل آسودگی یا ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے
وہ بعض چیزوں، بعض کاموں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرنے لگتا ہے، گویا وہ
ان کی قدر کا تعین کرتا ہے۔ یہ منفی یا مثبت قدر کا احساس ذہنی نشوونما کی بنیاد
ہے۔ جب بچے کے حافظے میں احساسِ قدر کے تجربوں کا ذخیرہ جمع ہونے لگتا
ہے، تو اس کی ذہنی زندگی ترقی کی ایک اہم منزل طے کرتی ہے، یعنی وسائل و
مقاصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے، مگر یہ اقدار، جن کا شعور نشوونما کی ان ابتدائی
منزلوں میں ہوتا ہے، سراسر حسی یا مادی ہوتی ہیں۔ بچپن کی میزان قدر میں صرف
خوشگواری یا ناگواری آرام یا تکلیف، جسمانی آزادی یا جسمانی بندش، حسی لذت
یا حسی کوفت کا احساس تولا جاتا ہے۔ ابھی تک اس میزان کی سطح انسان کے
یہاں کم بیش وہی ہوتی ہے، جو اونچے درجے کے جانوروں کے یہاں۔ افسوس
ہے کہ بعض انسان اسی سطح پر ٹھہر کر رہ جاتے ہیں۔

مگر طبعاً فردِ انسانی کے اندر ایک تیسری قسم کے وظائف یعنی ذہنی اور اخلاقی
عمل بھی ظہور میں آتے ہیں۔ ان وظائف کے انجام پانے سے بھی کچھ قدروں کا
احساس ہوتا ہے، لیکن یہ قدریں کچھ اور ہی طرح کی ہیں۔ دونوں کی نوعیت میں
جو فرق ہے، اس کو ظاہر کرنے کے لیے ایک طرف حق، حسن، خیر، قدس اور عدل کا
اور دوسری طرف جسمانی صحت، حسی لذت، مادی منافع یا جنسی محبت کا نام
لے دینا کافی ہے۔ تعلیم فردِ انسانی کی مکمل نشوونما کا ذریعہ ہے۔ اسے انہیں
مخصوص انسانی اقدار سے سروکار ہے، جو اقدار عالیہ مطلقہ کہلاتی ہیں۔ تعلیم کا
سب سے بڑا اور سب سے مقدم موضوع فرد اور اس کی مخصوص انسانی قدر ہے۔
تعلیمی عمل یہی ہے کہ وہ شعور اقدار کو جو فرد کے اندر بالقوۃ موجود ہوتا ہے۔
تہذیبی اشیاء کے ذریعے سے قوت سے فعل میں لائے۔ یہ تہذیبی اشیا خود
کسی فرد یا جماعت کی ذہنی کوشش کی پیداوار ہوتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم کو بجا
طور پر معروضی تہذیب کا فرد کے اندر نئے سرے سے موضوعی زندگی پانا کہا جاتا
ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے معروضی کا موضوع بن جانا کہہ سکتے ہیں یعنی

تعلیم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ان دونوں میں مناسبت اور مطابقت ہو۔ صحیح تعلیم یہ نہیں ہے کہ متعلم کو کسی مقررہ سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ جو فلاں اسکیم یا فلاں منصوبے کی رو سے ضروری سمجھا گیا ہے۔ تعلیم نام ہے متعلم کے انفرادی نفس میں مخصوص انسانی صلاحیتوں کے بیدار ہونے اور نشو و نما پانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ جو اپنے خیال میں بچے کے خالی ذہن میں تھوڑی سی یا بہت سی معلومات بھر دیتا ہے، دراصل اسے تعلیم نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نظریئے کا ٹھونس دینا تعلیم نہیں کہلاتا۔ تعلیم وہ عمل ہے، جس کے ذریعہ ذہن کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما کا جو اس کے لیے ممکن ہے، موقع ملے اور وہ صرف انہیں تہذیبی اشیاء کے سابقے سے ہو سکتی ہے، جو اسی قسم کے ذہنوں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں اور جن کے اندر کچھ معروضی اقدار موجود ہیں۔ یہ اقدار تہذیبی اشیاء میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ جب کوئی ذہن جو ان سے مناسبت یا مشابہت رکھتا ہے، انہیں حاصل کرتا ہے یا اسے ان کا ادراک یا معرفت یا تجربہ ہوتا ہے، تو خود اس ذہن کے اندر یہ اقدار جاگ اٹھتی ہیں اور اس کی اخلاقی نشو و نما کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان اقدار کے تجربے کے ساتھ ہی ان کی صحت و معقولیت، ان کے دوام اور ان کی قدر مطلق کا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ انسان انہیں بے چوں و چرا تسلیم کر لیتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اس کے نظام زندگی کو اس کے احساسِ قدر اور معیارِ قدر کو اس کی پسند اور ناپسندیدگی اور اس کے عمل کے محرکات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ سچی تعلیم یہی ہے کہ انفرادی ذہن کو ان مخصوص انسانی معروضی اور روحانی اقدار کا تجربہ کرایا جائے، تاکہ وہ اسے خود بخود اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے عمل میں اسے حاصل کرے۔ یہ گویا ایک ایسی شمع جلانا ہے جو اندھیرے میں انسان کو راہ دکھائے اور وہ مضبوطی سے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ سکے۔ یہ شمع دراصل انسان کے مرکزِ وجود میں یعنی اس کے قلب میں روشن ہوتی ہے۔ تعلیم کو یہ شرف بخشا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کے سینے میں شمع کی جوت لگائے، اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی تہذیبی

اشیا ادب، آرٹ، سائنس، صنعت، مذہب، اخلاقی اور قانونی ضابطے اور خاص طور پر وہ پاکیزہ شخصیتیں جن میں ذہنی اور اخلاقی قوت نے مکمل شکل اختیار کرلی ہے۔

مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت سے کام لینے کے لیے اس کا ذکر کر دینا، اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا دینا کافی نہیں ہے، بلکہ زندگی میں اس کا تجربہ کرنے، اسے برتنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کا خاص کام یہی ہے کہ اس تجربے کا موقع بہم پہنچائے، تعلیم کو متعلم کے موضوعی ذہن اور اس معروضی ذہن کے درمیان جو تہذیبی اشیا سے معمور ہے، یا دوسرے الفاظ میں فردِ انسانی اور انسانی تہذیب کے درمیان واسطہ بننا ہے۔

عملِ تعلیم کا مرکزی مسئلہ یہی ہے کہ یہ توسط کس طرح اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہاں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں، مگر میرے خیال میں بلاشبہ ایک بات کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کے موثر اور کامیاب توسط، یعنی اچھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ اس خیال کو ذہن سے بالکل نکال دیا جائے کہ محض معلومات، تجربے اور دریافت کا بدل ہو سکتی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس چیز سے جسے ہم تہذیب کی روایتی اقدار کہتے ہیں، آشنا کرنے میں یہ رجحان غالب آگیا کہ ہم معلومات پر اکتفا کریں اور تجربے اور دریافت کو نظر انداز کر دیں تو یہ اندیشہ ہے کہ تعلیم میں ناقابل برداشت سطحیت اور ریاکاری پیدا ہو جائے گی۔

روایتی اقدار کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں جس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو اقدار کے انتخاب میں خاص اہتمام کیا جائے اور دوسرے ایسی موثر تدبیروں سے کام لیا جائے کہ متعلم ان اقدار سے پوری طرح فیض اٹھا سکے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ متعلم ان اقدار کا تجربہ کر سکے جو اس کی اپنی ذہنی اور روحانی وضع نفسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ ہمیں اپنے بے شمار تہذیبی کارناموں میں سے جنہوں

نے معروضی شکل اختیار کرلی ہے، بڑی احتیاط سے مناسب انتخاب کرنا ہے۔ تاریخ وہ خزانہ ہے جس سے ہم اس تعلیمی مواد کا انتخاب کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ہر قوم کی جڑیں اس کی تاریخ میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ ماضی کی گہرائیوں میں پھیلتی جاتی ہیں تاکہ اسے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ بلندی اور وقت کے سیلِ پیہم میں قرار و دوام حاصل ہو سکے۔ ٹیگور نے ایک جگہ کہا ہے۔

میں نے تیری بے آواز آہٹ کو اپنی رگوں میں دوڑنے والے
لہو میں محسوس کیا
اے ابد قرار ماضی!
میں نے تیری خاموشی صورت کی جھلک دیکھی ہے
وقت کے پرشور قلب میں
تو اس لیے آیا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی ناتمام کہانی کو لکھے
خطِ مخفی میں ہماری زندگی کے اوراق پر
تو بھولے بسرے زمانے کو نئے سرے سے یاد دلاتا ہے
تاکہ اس کی روشنی میں نئے پیکر تراشے جائیں

یہ تو صحیح ہے مگر ماضی کی دولت بے شمار ہے۔ تعلیم کو اس میں انتخاب کرنا ہے اور یہی اس کی بڑی کٹھن ذمہ داری ہے۔ انتخاب کے معنی ہیں چھانٹنا، اور چھانٹنے کے لیے کوئی اصول ہونا چاہیئے۔ بعض لوگ قدیم کو انتخاب کریں گے، بعض جدید کو۔ بعض ہماری مرکب تہذیب اور مرکب قومیت کے ایک عنصر کو بعض دوسرے عنصر کو۔ ہماری میراث دراوڑوں، آریوں، عربوں، ترکوں، مغلوں اور یورپینوں کا عطیہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ہندوؤں، بودھوں، مسلمانوں، عیسائیوں سکھوں اور پارسیوں نے حصہ لیا ہے۔ ماضی کے وافر خزانے میں کسی چیز کا اچھا یا بُرا ہونا اس پر موقوف نہیں کہ وہ قدیم ہے یا جدید ہے۔ وہ ہندوؤں کی ہے یا بودھوں کی، مسلمانوں کی ہے یا سکھوں کی، عیسائیوں کی ہے یا پارسیوں کی۔ بنائے تمیز دراصل یہ ہے کہ ان میں سے کون سی اصلی ہے اور کون سی نقلی، کون سی عارضی اور کون سی دائمی، کون سی وقتی قیمت رکھتی ہے اور کون سی ابدی قدر کی حامل

ہے۔ سماج کے سوچے سمجھے عمل یعنی تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اس میراث کے وسیع سمندر کو کھنگال کر ان چیزوں کو نکالے جو ہماری نئی نسلوں کی اخلاقی اور روحانی غذا بن سکتی ہیں اور اسے ان کے سامنے دسترخوان پر چُن دے۔ تعلیم کو تمیز کرنا چاہیے اُن روایات میں جو زندگی کی جڑوں کو کمزور کرتی ہیں اور ان میں جو ان کو قوت پہنچاتی ہیں۔ صرف وہ روایات جو جاں بخش اور جانفزا ہیں، ابدی اقدار کی حامل ہوتی ہیں اور تعلیم کا کام کرتی ہیں۔ جو نشوونما اور ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، وہ تعلیمی اعتبار سے محض بے کار ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔ فرد اور سماج دونوں کی زندگی کو منزل کی راہ دکھانے والی صرف معروضی ابدی اقدار ہی ہیں، ان کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اقدار خود ہی اپنے ازسرِنو حاصل کیے جانے کا تقاضا کرتی ہیں اور برابر ترقی کی تحریک کرتی رہتی ہیں۔ میں نے "ازسرِنو حاصل کیے جانے" کا فقرہ جان بوجھ کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ ان اقدار کا آخری اور قطعی طور پر حاصل کرنا کسی زمانے میں بھی ممکن نہیں ہے۔ قدر بجائے خود ابدی ہے، مگر ہر نسل کو بلکہ ہر فرد کو اسے اپنے طور پر تلاش کرنا اور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ہماری روایتی میراث جن ابدی اقدار کی حامل ہے ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ماضی کے ٹھٹھرے ہوئے جامد جسم کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھیں، وہ تو زندگی اور حرکت بخشنے والی ہیں اور ہر نئی نسل کے دل میں یہ لگن پیدا کرتی ہیں کہ وہ انہیں نئے سرے سے حاصل کرے، تاکہ ایک نئی اور بہتر تہذیب کی تعمیر ہو سکے۔

ہمیں نئی نسل کو یہ بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں یہ معروضی قدریں کس طرح حاصل کی گئیں۔ ہمیں ایسے مواقع فراہم کرنا چاہیئے کہ فرد کے شعور میں ایک یا ایک سے زیادہ قدروں کا تجربہ کرنے کی جو صلاحیت قدرتی طور پر موجود ہے، وہ قوت سے فعل میں آئے اور اسے ہر ممکن ذریعہ سے مدد دے کہ وہ اس قدر کو جس کا اسے تجربہ ہے، خود اپنی یا اپنے گردوپیش کی زندگی میں حاصل کر سکے، چاہے وہ حق ہو یا حُسن یا خیر یا قدس یا عدل۔ تبھی اس میں مخصوص انسانی صفات نشوونما پا سکتی ہیں، تبھی اس کی سچی تعلیم ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے، سچی تعلیم یہی ہے کہ فرد کے شعور میں اقدارِ عالیہ کا احساس ان تہذیبی اشیاء

کے اثر سے پیدا ہو، جو اقدار کی حامل ہیں۔

ہماری روایات ایسی تہذیبی اشیا سے مالا مال ہیں۔ ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ان کے تعلیمی اثرات ہماری نئی نسل پر پڑیں۔ خاص طور پر ایک قدر ہے جس کی طرف ہماری قومی زندگی کے موجودہ دور میں غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ عدل کی قدر ہے، جس کا ریاست کو حامل ہونا چاہیئے۔ ہماری روایات ہمیشہ سے یہی رہی ہیں کہ ریاست دھرم یا اخلاقی قانون کی تابع ہو۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے ملک کے سارے بچوں اور نوجوانوں کو اس اثر پذیر عمر میں تعلیمی ادارے کے ذریعہ اس قدر کا تجربہ ہو سکے۔ ریاست محض قوت واقتدار کی حامل ہونے کی حیثیت سے کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتی۔ یہ ہمارے مزاج کا ایک جزو ہے، ہماری تاریخ کے بہترین صفحات کا ایک سبق ہے، ایک قیمتی میراث ہے، جو ہمیں اپنی تحریک آزادی کے عظیم رہنما سے ملی ہے کہ قوت کا استعمال محض جائز اخلاقی مقصد کے لیے ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنے آپ کو اس امن کے قیام کے لیے وقف کر دینا چاہیئے جو اخلاقی قدر سے حاصل ہوتا ہے، مجھے امید ہے اور یقین ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کی منزل کے تصور کو ہمیشہ سامراجی ملک گیری کے رجحان سے پاک رکھیں گے۔ ہم سامراج کے قدموں تلے سے نکلے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ان کا بوجھ کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم ایسی اندھی وطن پرستی کو جو جنگ جوئی سکھائے کبھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیں گے۔ ہماری سعی یہ ہوگی کہ افلاس، جہالت اور بیماری کو دور کر کے وہ قلیل ترین شرائط فراہم کر دیں جو ایک معمولی انسان کی طرح بسر کرنے کو درکار ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے سماجی نظام سے قبیح رسوم اور لاطائل اوہام کو خارج کر دیں گے۔ اور اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی انہیں ہماری میراث کے نام سے قایم رکھنے کی کوشش کرے۔ ہم ہر قسم کی تنگ دلانہ اجتماعی خود غرضی کو، ہر قسم کی نفرت کو جو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے، ایک ذات کو دوسری ذات سے ہے۔ جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے اور یہ برداشت نہیں کریں گے کہ کوئی انہیں قومی روایات کہہ کر ان کی حمایت کرے۔ یہ سب کچھ ہم عدل و انصاف کی ان

ابدی اقدار کی خاطر کریں گے جو ہماری قومی میراث کا جزو ہیں۔ ہم اس خدمت کو اخلاقی فرض سمجھ کر دل سے قبول کریں گے۔ اور خوشی سے انجام دیں گے۔ ہم قوت اور عدل، صنعت اور اخلاق، عمل اور فکر و مراقبے کو ایک دوسرے کے ساتھ سمونے کی کوشش کریں گے اس مشکل کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہمارے اندر کس طرح پیدا ہوگی؟ اس طرح کہ تعلیم ان ابدی اقدار کے ذریعہ جو خود ہماری تہذیبی اشیاء میں مجسّم ہو گئی ہیں، ہمارے اندر ان قدروں کو بیدار کر دے گی اور وہ صرف ہماری ہی تہذیبی اشیاء سے کام نہیں لے گی، بلکہ بقیہ نوع انسانی کی تہذیبی میراث سے بھی، خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کی ہو، اس لیے کہ ہم اس کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس طرح اس کے وارث بن جاتے ہیں۔

ہماری تعلیم حیات انسانی کے اور اہم وظائف کی طرح، اس کڑی کا کام دے گی جو ابدی زندگی اور زمانی زندگی، روحانی بیداری اور فنی کارکردگی، اخلاقی عقیدے اور مادی فلاح کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابدیت، روحانیت اور اخلاق کے مفہوم کو الفاظ میں ضبط کرنا مشکل ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہو تعلیم کا فرضِ اولین ان میں اقدار کا شعور پیدا کرنا ہے۔ اس فرض کو وہ تہذیبی اشیاء کے مناسب انتخاب سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ خود معلموں میں ان ابدی اقدار کے جیتے جاگتے مظہر موجود ہوں، ماضی اور حال کی حقیقی شخصیتوں میں اخلاقی عظمت کے نمونے دکھائے جائیں اور مشکل اور پیچیدہ حالات میں حق پسندانہ فیصلے کرنے کے قصّے سنائے جائیں۔ ہندوستان کی تاریخی روایات ایسی شخصیتوں کے نور اخلاق سے منوّر ہیں اور مجھے امید ہے کہ آنے والے زمانے میں خود ہمارے تعلیمی ادارے ایسے معلموں سے خالی نہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ اب میں اس سمینار کا افتتاح کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی مشاورت ہماری تعلیم کی بہت سی اہم گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے گی۔

میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں

اردو ہندی کی رقیب نہیں ہے

خطبۂ افتتاحیہ۔ ۱۹۵۹ء

سبھا پتی جی، قاضی عبدالودود صاحب، جسٹس خلیل احمد صاحب اور دوستو!
میں نے اپنے بس بھر اس بات کو پھیلانے کی بہت کوشش کی ہے کہ جلسوں اور اداروں کے افتتاح اور سبھاؤں اور سنستھاؤں کی ادگھاٹن کی رسم اکثر کچھ غیر ضروری سی ہوتی ہے۔ پھر جب کسی جلسے کو شری بابو جیسا صدر نصیب ہو تو یہ رسم سراسر غیر ضروری ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ بات کا سن لیا جانا اور بات ہے اور اس کا مان لیا جانا اور بات۔ اور ایک درجہ شاید اس کے بین بین بھی ہوتا ہے، اسی طرح مان جانے کا کہ ماننا نہ ماننا ایک سا ہو جائے۔ یعنی بہت اچھا، آپ افتتاح اور ادگھاٹن کو غیر ضروری سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے ہم کسی اور کو اس مبارک اور لازم کام کے لیے بلا لائیں گے، آپ صدارت کر لیجیے گا اور ناصح غریب کے نام کے سامنے اعمالنامہ یعنی پروگرام میں تقریر افتتاح کی جگہ خطبۂ صدارت درج ہو جاتا ہے۔ بہر حال شاید ممکن صورت بس یہی ہے کہ آدمی کہے جائے کہ افتتاح اور ادگھاٹن کی چنداں ضرورت نہیں اور یہ کہہ چکنے کے بعد کچھ اور بھی کہہ دیا کرے۔ اس کا ضمیر بھی ہلکا ہو جاتا ہے، فرمایش بھی پوری ہو جاتی ہے۔

اور کچھ جو کہنا ہے وہ یہ کہ آج جن کاموں کے افتتاح کے سلسلے میں آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے، یعنی "اردو نمایش" اور "ادارہ تحقیقات اردو" کے کتب خانے کا افتتاح، یہ دونوں ایسے کام ہیں کہ اگر آپ افتتاح کی دعوت نہ بھی دیتے تو بھی ان کو دیکھنے اور جاننے کو جی ضرور چاہتا۔ نمایش کے متعلق یہ دعویٰ ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاید اپنی نوعیت کی پہلی نمایش ہے۔ اس کے دیکھنے والوں کے سامنے اردو زبان کی تاریخ کا ایک نقشہ سا آجائے گا، اس کے ماضی کی تحصیلات

سے اس کے مستقبل کے امکانات واضح ہوں گے، اور اردو ادب کا وطن کے سرمایۂ علمی وادبی میں جو اونچا مقام ہے وہ کچھ کچھ سامنے آجائے گا، اور اردو ادب کو قومی زندگی کی ترقی و تہذیب میں کسی دوسری ہندوستانی زبان سے پیچھے نہ رہنے کا ولولہ پیدا ہوگا، جو ایک نہایت مبارک ولولہ ہے۔

ادارے نے اس نمایش سے متعلق جو کتابچہ شائع کیا ہے اس سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ ادارے کو اپنی اس قابل تحسین کوشش میں بہت سے افراد اور اداروں کا تعاون حاصل ہو سکا۔ کوئی تیس اداروں نے، پچاس سے اوپر غیر مقامی اصحاب نے، اور کوئی پون سو سے اوپر مقامی ہمدردوں نے اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ یہ تعاون خود اردو کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال ہے۔

اس نمایش میں طرح طرح کی دلچسپ چیزیں آپ کے دیکھنے میں آئیں گی۔ ایک طرف قلمی کتابیں تو دوسری طرف چھپی ہوئی چیزیں۔ قلمی چیزوں میں اردو کے مخطوطے ملیں گے، مشاہیر اردو کے خط، ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں، ان کے مرقعے، سب کچھ سامنے آئیں گے۔ ۱۸۶۵ء سے پہلے کے سرکاری محکموں اور عدالتوں کے کاغذ بھی آپ دیکھیں گے، خطاطی اور کتابت کے اچھے اچھے نمونے بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور ادب، زبان و تاریخ اردو سے متعلق فارسی اور ہندی کے قلمی نسخے بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ دوسری طرف بہت سی چھپی ہوئی چیزیں ہوں گی جو اب بہت کمیاب ہیں، پرانی چھپی ہوئی نظم اور نثر کی کتابیں، پرانے رسالے اور اخبار، پرانے ادبی گلدستے، علمی اور ادبی انجمنوں کی روداد یں، اردو لغت، لسانیات اور تاریخ اردو کی کمیاب کتابیں، پھر علوم و فنون کی نئی پرانی کتابیں، جنتریاں، اچھی چھپائی کے نمونے، اور دیوناگری، رومن یا دوسری لپیوں میں اردو کی کتابیں۔ ایسی نمایش کا افتتاح کرنے پر کسے خوشی نہ ہوگی۔

لیکن نمایش تو ایک عارضی چیز ہے۔ خاص کوشش سے یہ سب چیزیں آپ کے لیے یکجا کرلی گئی ہیں۔ دوسری چیز جس کا افتتاح مجھے کرنا ہے وہ مستقل چیز ہے، وہ ادارہ تحقیقات اردو کا اپنا کتب خانہ۔ یہ نو عمر ادارہ بڑا ہونہار ادارہ ہے۔ چند سال کے اندر ہی اس نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور بہت کچھ امیدیں

تحقیق علمی کی اس سے وابستہ ہیں ۔ یہ خالص تحقیقاتی ادارہ ہے جسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں، یہ صفت بھی آج کل کمیاب کتابوں سے کچھ کمیاب نہیں۔ یہ کئی تحقیقی کتابیں شائع کر چکا ہے اور کئی زیر طبع ہیں۔ جدید اصول لغت نگاری کے مطابق ایک جامع اردو لغت مرتب کرنے کا کام بھی ادارہ کر رہا ہے۔ مشاہیر اردو سے متعلق محققانہ کتابیں شائع کرنا، اردو ادب کی مختلف تحریکوں اور مختلف ادوار کی تاریخ پر مقالات تیار کرانا، اردو نظم و نثر کی پرانی قابلِ قدر کتابوں کے مستند نسخے شایع کرنا، یہ بھی منجملہ ان اہم کاموں کے ہیں جو ادارے نے اپنے ذمے لیے ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو بھی ادارے سے بہت مدد اور ہدایت ملتی ہے۔ پانچ اصحاب جو ادارے سے متعلق ہیں، اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے لیے تحقیقی مقالوں پر کام کر رہے ہیں، جن میں سے تین عنقریب اپنے مقالے پیش کر دیں گے۔ ادارے کے ساتھ ملک کے بعض ممتاز محقق وابستہ ہیں اور اس ادارے کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی صدارت کی ذمہ داری قاضی عبدالودود صاحب کے ذمے ہے۔ قاضی صاحب نے قابل رشک یکسوئی کے ساتھ تحقیق علمی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ اور اس کے متعلقہ مسائل پر ان کو جو عبور حاصل ہے، ان کا علم اس باب میں جتنا وسیع اور حاضر ہے، ان کی نظر جتنی گہری اور تیز ہے اور تحقیق کے بوجھل کام کے لیے ان کے اندر جو شیفتگی ہے اس نے انہیں محققین کی صف اول میں ایک بلند درجہ دیا ہے۔ بہار ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ان کی نگرانی میں، مجھے یقین ہے کہ، یہ ادارہ بہت گراں قدر خدمات اردو سے متعلق تحقیقات کے میدان میں انجام دے سکے گا۔

ادبی تحقیقاتی کام کے لیے کتب خانے کی ضرورت پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ ادارے نے ایک کتب خانہ جمع کیا ہے جس میں سات ہزار سے اوپر قیمتی اور کمیاب کتابیں یکجا کر لی گئی ہیں۔ اس کا انتظام ادارے کی ایک ذیلی کمیٹی کے ذمے ہے جس کے صدر میرے دوست جسٹس خلیل احمد صاحب ہیں۔ اس کتب خانے کے افتتاح کی رسم بھی اس وقت مجھے انجام دینی ہے۔ مجھ سے ان

میں سے ایک ہی کام کے لیے کہا جاتا تو بھی باعث مسرت اور موجب افتخار ہوتا۔ یہ تو ایک چھوڑ دو۔ دو کام آپ ایک ناکارہ سے لے رہے ہیں۔ کرم بالائے کرم ع

"من ہوئے مست وساقی پُر و ہر پیمانہ را"

ہاں ایک بات اور کہہ دوں۔ وہ یہ کہ مجھے ان کاموں سے خاص خوشی اس وجہ سے بھی ہے کہ ادارے کے معتمد میرے ایک پرانے شاگرد، جامعہ ملیہ کے سابق طالب علم قاضی محمد سعید صاحب ہیں جنہوں نے نمایش کے اہتمام میں واقعی دن رات ایک کر دیا ہے۔ لیکن علاوہ اس شخصی تعلق کے یہ خوشی مجھے اس وقت بھی ہوتی کہ یہ نمایش اردو کی نمایش نہ ہوتی اور یہ کتب خانہ اردو کے ایک تحقیقاتی ادارے سے متعلق نہ ہوتا۔

کتابیں، کسی زبان کی ہوں، تمدن انسانی کی دستاویزیں ہوتی ہیں، ذہنی قوتوں کا خزینہ، متاع روحانی کا دفینہ۔ ان سے استفادہ اور ان کا تحفظ ہر حال میں ایک اچھا کام ہے۔ اسی طرح تحقیقِ علمی، میدان تحقیق کہا ہے اس سے قطع نظر، دراصل تلاش حق کی ایک راہ ہے۔ اس راہ میں گرم رو رہنے کے لیے تربیت و تہذیب کا سامان ہے جو اس راہ کے وسوسوں، گمراہیوں اور فریبوں سے کہ ان سے یہ راہ پُر ہوتی ہے، بچنے کی مشق بہم پہنچاتا ہے، لیکن سچ کہہ دوں آپ سے کہ مجھے اس عام خوشی اور افتخار سے کچھ زیادہ خوشی، کچھ زیادہ افتخار اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ دونوں کام جو اس وقت انجام پا رہے ہیں، اردو زبان سے تعلق رکھتے ہیں، وہ زبان جسے پہلے پہل اپنی ماں سے سیکھا تھا، جس میں میری ذہنی پرورش ہوئی، جس میں اب تک سوچتا ہوں، جس کے علمی اور ادبی سرمائے سے اپنی استعداد کے بقدر فیض اٹھایا ہے اور یہی نہیں کہ اس سے مجھے یہ شخصی اور ذاتی لگاؤ ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ایک وفادار ہندوستانی شہری کی حیثیت سے مجھے یہ زبان اس زندگی کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی بشارت دیتی ہے جو ہم سب ہندوستانی اپنے آزاد دیس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس زندگی کی روح کیا ہے؟ اس کی روح ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے کثرت میں وحدت کی تلاش! الگ الگ اور طرح طرح کے عناصر سے ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کے بنانے کی

آرزو، جو زینتِ چمن کو گلہائے رنگ رنگ کا نتیجہ جانتی ہے، جو رنگ برنگے تمدّنی پھولوں کو وحدتِ قومی کے ڈورے میں پرو کر ایسا ہار بنایا چاہتی ہے کہ وہ ہار گوندھ کر انسانیت کی گردن میں ڈالا جائے تو اس کی شوبھا کو بڑھا دے، جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ع ”ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا“ یہ کہنے کی ہمت رکھتی ہے کہ ”ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے“ جہاں کُل اپنے کو جزو کا رقیب نہیں سمجھتا، اس کی طاقت کو اپنا بل جانتا ہے۔ ہندوستانی زندگی کے تمدّنی مظاہر میں مجھے یہ روح اردو زبان میں بڑے ستھرے اور نکھرے ہوئے روپ میں دکھائی دیتی ہے، اور اردو کی تاریخ پر تحقیقاتی کام مجھے اس وجہ سے اور بھی اہم دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادنیٰ تامل سے یہ بات بالکل روشن ہو جائے گی کہ اردو نہ کسی فرقے کی زبان ہے، نہ کسی مذہب کی زبان ہے، نہ کسی حکومت کی زبردستی چلائی ہوئی زبان ہے، نہ کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان ہے۔ یہ تو جنتا کی بولی ہے! لوگوں کی زبان ہے! آپس کے میل جول کا پھل ہے، میلوں ٹھیلوں، بازاروں منڈیوں کی ریل پیل میں رلی ہوئی زبان ہے، زندگی کے بیوہار کے کانٹوں میں تلی ہوئی زبان ہے، چیزوں کے لین دین کے ساتھ وچاروں کے لین دین کا نتیجہ ہے، یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو اپنے پریم سے چھلکتے ہوئے دل کی بات اوروں تک پہنچانے کے لیے بے کل تھے، اور جن کی من موہن باتیں سننے کو عام لوگ کان لگائے رہتے تھے۔ اسی لیے یہ محبت اور پریم کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے، اس کا دل بھی بڑا ہے اس کی جھولی بھی بڑی ہے۔ یہ نئے انداز سے جھجکتی نہیں، نئی بات پر بدکتی نہیں، لفظوں سے گھنیاتی نہیں، وچاروں سے چھوت چھات نہیں کرتی۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اردو کے یہ گن خواہ مخواہ گا رہا ہوں، ان کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ ہمیں جو سماج بنانا ہے اس میں جوڑنے والی طاقتوں کو ابھارنا ہے، توڑنے والی طاقتوں کو دبانا ہے۔ زبان جوڑنے والی طاقت ہے، ہر زبان جوڑتی ہے، پھر ہر زبان والے اسے اپنے کو دوسروں سے الگ کرنے کا آلہ بنا لیتے ہیں، اس [illegible]

دیس میں ایک زبان والا علاقہ دوسری زبان والے علاقے سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے کوئی پرایا دیس ہو۔ یہ سب بڑی بھول کی باتیں ہیں، اور آج جب کہ دیس کو اپنی آزاد زندگی کی پہلی کٹھن منزل درپیش ہے اتحاد قومی ازبس ضروری ہے۔ ان جھگڑوں میں پھنس کر ہم ان مشکلوں کا سامنا کیسے کریں گے جو آگے دکھائی دے رہی ہیں۔ اردو چونکہ دیس کے کسی ایک علاقے میں محدود نہیں ہے۔ ہر جگہ ہی اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اس لیے اس کو تو وحدت قومی کے پیدا کرنے میں سب سے آگے ہونا چاہیئے لیکن پچھلی تاریخ نے اس میں بھی بہت سے پیچ ڈال دیے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ مسلمانوں کی زبان ہے، کوئی کہتا ہے یہ پردیسی زبان ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ نہ خالی مسلمانوں کی زبان ہے نہ پردیسی زبان ہے۔ اور اچھا مان لو کہ یہ مسلمانوں ہی کی زبان ہوتی تو بھی تو ہماری آزاد جمہوری زندگی میں یہ کوئی عیب کی بات نہ ہوتی۔ ہر آدمی جو ہمارے دیس میں بستا ہے، اسے اپنا دیس جانتا ہے، اس کے ودھان کو مانتا ہے، اس کے مطابق چلتا ہے، وہ ہمارا بھائی ہے ساتھی ہے دوست ہے، اس کی ترقی ہماری ترقی ہے، اس کی بھلائی میں ہماری بھلائی ہے مگر اردو تو خالص مسلمانوں کی زبان ہے بھی نہیں۔

کوئی فہرست نہیں بنائی ہے، جو نام اس وقت یاد آ گئے وہ لیتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رام چندر سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برج موہن دتاتریہ، نسیم، چکبست، سرور جہاں آبادی، فراق گورکھپوری، منشی نول کشور، لالہ سری رام صاحب خمخانہ جاوید، منوہر لال زتشی، دیا نرائن نگم کی زبان کو کوئی مسلمان کی زبان کیسے بتاتا ہے اور اس زبان پر مذہبی تنگدلی اور فرقہ پرستی کی تہمت کیسے باندھ سکتا ہے؟ جس زبان میں آریہ سماج کا تمام تر مذہبی لٹریچر موجود ہو۔ جس سے عیسائیوں نے اپنے مذہب کی خدمت کا پورا پورا کام لیا ہو، اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر تنگ دلی اور تنگ نظری کی پرورش کرنا کون سی دیانت ہے، کون سی فراست ہے؟ پھر اردو نہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ ذرا بھی دیکھیے تو قدم قدم پر اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ لسانی نقطۂ نظر

ہے اس کے افعال، اور حروف، اور عام ضرورت کے اسم سب ہندی ہیں۔ اس کی آوازوں پر کان دھریے تو ایران اور عرب سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ آوازوں کی بہت بڑی تعداد خالص ہندوستانی ہے۔ عربی لفظوں میں جو سامی آوازیں آئی ہیں انہیں بھی بول چال میں ہند یا لیا ہے۔ لکھائی میں بھی اس کے پردیسی ہونے پر بہت زور دیا جاتا ہے درجنوں ہندوستانی آوازوں کے ظاہر کرنے کا اس میں سامان ہے اس میں ڑ، ڈ، ٹ، ٹھ، ڈھ، بھ، پھ، جھ، چھ اور کھ کیا پردیسی آوازوں کے نشان ہیں۔؟

دوستو! شاید اس وقت یہاں اردو دوست زیادہ جمع ہوں، آپ سے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا فرض ہے کہ اپنی عزیز زبان کی روح کو آپ کسی حال میں مسخ نہ ہونے دیں۔ کوئی اس روح سے ناواقف ہو تو اسے بتائیں کہ یہ روح کیا ہے۔ اس روح کو تازگی بخشیں کہ ایک اچھی سماجی زندگی کے بنانے میں آپ کا ادب کسی اور سے پیچھے نہ رہے۔ زبان اور ادب کا مقابلہ یہ نہیں کہ کسی سے روٹھ گئے، کسی کو بُرا سمجھ لیا، کسی کو دبا دیا، اس میں جیت اس کی ہے جو خدمت کے میدان میں اوروں سے بازی لے جائے۔ مقابلہ اس میں کیجیے کہ کس زبان کے گیت قوم کے دل کو گرماتے ہیں، کس کا ادب صالح اقدار کی ترویج کا ذریعہ بنتا ہے، کون اچھے آدمی، اچھی ریاست اور اچھے سماج کے بنانے میں، اس کو عدل وانصاف، صداقت وامن کی بنیادوں پر مضبوط کرتے ہیں، غلطی کرنے پر جرأت سے ٹوکنے میں، نیکی کو فراخ دلی سے سراہنے میں، دماغوں کو تنگ نظری اور تنگدلی کے جالوں سے صاف کرنے میں، علم کی سرحدیں آگے بڑھانے میں، آدمی نے جن سچائیوں کا سراغ لگا لیا ہے، کہیں لگایا ہو، کسی نے لگایا ہے، ان سے اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں کو منور کرنے میں، جذبۂ قومی کے ایک قومی اور مؤثر جذبہ بنانے میں وطن اور اہل وطن کی اچھائیوں اور خوبیوں سے وہ ذہنی وابستگی اور روحانی دلبستگی پیدا کرنے میں، جو قومی وفاداری کی جڑ ہے کون زبان دوسری زبانوں سے زیادہ کارگر ہے۔ یہ نیکی کا مقابلہ ہے، اس میں جیت ہار نہیں ہوتی۔ اس میں مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور دوسرے کے آگے بڑھانے

پر بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جتنا خود اپنے آگے نکلنے پر۔
میری التجا ہے اور مجھے امید ہے کہ تاریخی اتفاقات نے اردو ہندی کے تعلق میں جو گتھیاں سی ڈال دی ہیں وہ اردو اور ہندی دونوں کے کام کرنے والے اپنی سوجھ بوجھ اور صاف دلی سے اس طرح سلجھائیں گے کہ یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی یہ الجھنیں پیدا بھی ہوئی تھیں۔ محبت سے کہتے ہیں ٹوٹے دل جڑ جاتے ہیں اور ایسے جڑتے ہیں کہ پتا نہیں چلتا کہ کہاں بال پڑا تھا،

دل شکستہ در آں کوے میکنند درست
چنانکہ مینشناسی کہ از کجا بشکست

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اردو کسی طرح ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ سب ہندستانی شہری، ان کی زبان کچھ بھی ہو، دستورِ ہند کے مطابق ہندی کو دیس کی سرکاری زبان مانتے ہیں اور اس کی ترقی میں ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، اردو والے بھی اس سے باہر نہیں ہیں، پھر اردو ہندی کی رقیب کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ہندوستانی دستور کی تسلیم کی ہوئی قومی زبانوں میں سے ایک ہے اور ہندی سے سب سے قریب ہے، اس لیے اگر اُردو والوں کو کہیں کوئی شکایت ہو کہ ان کی زبان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ ہے تو میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان کی طرف سے پیروی ہندی والے کریں۔ اس سے بھروسا محبت کے ایسے سوتے پھوٹیں گے کہ سارے قومی زندگی انہیں سے سیراب ہو گی، سارے دیس میں لسانی سیاست کا رنگ ہی بدل جائے گا، ذہنی تعاون کی راہیں کھل جائیں گی، آپس کا ربط بڑھے گا کیا عجب ہے سارے دیس میں ایسی حسین اور شیریں زبان، ایسی سندر اور مدھر اور کومل بھاشا کا چلن ہو جائے جو بس ہزاروں کی گنتی میں عالموں اور ودوانوں تک محدود نہ ہو بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا سکے۔
بات میں بات نکل آئی اور میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ آپ کے ساتھ میں بھی شری بابو کو سننے کا مشتاق ہوں، اس لیے ختم کرتا ہوں اور بیٹھنے سے پہلے نہایت مسرت کے ساتھ اس اُردو نمایش اور ادارۂ تحقیقاتِ اردو کے کتب خانے

کا افتتاح کرتا ہوں۔

(اردو نمایش اور کتب خانہ ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ کے افتتاح کے موقع پر بہار کے گورنر ذاکر صاحب کا خطبۂ افتتاح)

ذاکر حسین

پٹنہ، ۷/۲ نومبر ۱۹۵۹ء

غلام حیدر

ذاکر حسین کی بچّوں کے ادب کو دین

اس مضمون کے اصلی متن سے پہلے کچھ وضاحتیں کر دینا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے عزّت مآب سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے نام کی بات ہے۔ انھیں ان سے قریب ترین لوگ — یعنی ان کے بچے — صرف 'میاں' کہتے تھے۔ خاندان کے بزرگ اس کے ساتھ 'ذاکر' کا نام بڑھا کر 'ذاکر میاں' کہتے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جسے انھوں نے ہمیشہ اپنا گھر ہی کہا۔ یہاں کے سب لوگ چھوٹے بڑے، ادنا اعلا، دوست ساتھی، حتیٰ کہ طالب علم بھی صرف ذاکر صاحب کہتے تھے اور تقریر، تحریر، مخاطب غرض ہر موقع پر یہی نام رواں رہا۔ باہر کے لوگ انھیں ان کی علمی ڈگری کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے، کچھ لوگ 'خاں' کا اضافہ بھی ضروری سمجھتے تھے اور پھر عہدوں کے ساتھ القابی لوازمات بڑھتے چلے گئے۔ میں نے چونکہ اپنی ابتدائی تعلیم جامعہ میں حاصل کی اس لیے انھیں 'ذاکر صاحب' ہی کہا اور اب اس مضمون میں بھی اپنی عادت کے مطابق یہی نام استعمال کیا ہے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کچھ ایسی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں کی طرح تھی کہ جب تک کوئی اس کے سائے میں رہتا تو اسے اس کے لطف و سرور کا احساس بھی مشکل سے ہوتا مگر جب اس چھاؤں سے نکل کر اسے اس نامہربان دنیا کی گرمی اور تندی محسوس ہوتی تو اسے اس کے صحیح فیض کی یاد آتی۔ چنانچہ جب اس مضمون کے لکھنے کے لیے میں نے خود اپنی یادوں کو کچھ کریدا، کچھ بزرگوں اور ساتھیوں سے گفتگو کر کے بھولے بسرے نقوش پر سے وقت کی گرد کی تہہ کو صاف کرنا چاہا تو اب یادوں کی ایک باڑھ سی امڈ نے

لگی ہے اور ان کی شخصیت سے مترشح ہونے والے وہ فیض برابر دماغ واحساس پر ابھرتے محسوس ہورہے ہیں جن سے ہم فی الحقیقت بہت کم فیض یاب ہو سکے ہیں۔
اب حیران ہوں کہ ان میں سے کیا چنوں، کیا چھوڑوں، کیا لکھوں کیا بھولنے کی کوشش کروں کہ یہ مضمون صرف یادوں اور پچھتاووں کی بھول بھلیاں ہو کر نہ رہ جائے بلکہ کسی قدر معروضی انداز میں ان کی تہہ در تہہ شخصیت کے ان گنت پہلوؤں میں سے کچھ گوشوں کی طرف نشان دہی کر سکے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو کہ بچوں کے ادب کو انھوں نے کیا، کتنا اور کس طرح دیا، جہاں تک میری معلومات ہے، ابھی کافی تشنۂ تحقیق ہے۔ کسی نے ابھی تک اس پہلو پر پوری سنجیدگی سے توجہ ہی نہیں کی ہے یقیناً زیر نظر مضمون بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکتا، چونکہ میرے خیال میں اردو میں بچوں کے ادب اور اس میں ذاکر صاحب کی دین کے تمام گوشوں پر ایک مبسوط اور مکمل تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے۔
بہر طور میں نے اس مضمون کو مندرجہ ذیل تین حصّوں میں بانٹا ہے۔

(i) بچوں کے ادب کو ذاکر صاحب کی تحریری دین، جسے انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں۔

(ii) ذاکر صاحب کے توسط سے بچوں کے ادب کو بحیثیت مجموعی فیض یا دین۔

(iii) ادب کا وہ عملی پہلو جو بچوں اور نوجوانوں میں تہذیب و تمدن پیدا کرنے یا کردار سازی میں براہ راست معاون ہوتا ہے۔

ایک معمولی سی یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ اس مضمون میں 'دین' کا لفظ انگریزی کے 'کنٹریبیوشن' CONTRIBUTION کے مترادف ہے۔ ہندی میں اس کا اظہار 'یوگ دان' سے ہوتا ہے مگر میں نے 'دین' کو ہی چنا ہے۔

آخر میں قارئین سے یہ معذرت کر لینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ میں نے پچھلے پچیس تیس سال میں نہ صرف بچوں کے لیے لکھا ہے بلکہ شعوری طور پر آسان، سیدھا سادا اور بے تکلف سا طرز بیان اپنانے کی کوشش کی، بلکہ عادت ڈالی ہے۔ اس لیے اگر اس مضمون میں کچھ خشکی یا ادبی چاشنی کا فقدان محسوس ہو تو مجھے معاف کر دیا جائے۔

بچّوں کے لیے ذاکر صاحب کی تحریریں

اس حصّے کی ابتدا میں بچوں کے مشہور ادیب اور ایک طرح سے خود ذاکر صاحب کے شاگرد معنوی کا ادب کے سلسلے میں ایک سیدھا سادا بیان دہرانا نامناسب نہ ہوگا۔

"ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین خیالات کو بہترین لفظوں میں، بہترین ترتیب کے ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔ اس میں سچ پوچھیے تو اپنے زمانے کے نہ صرف بہترین خیالات، الفاظ اور ترتیب ہوتی ہے بلکہ اپنے زمانے کی روح ہوتی ہے۔"[1]

اگر صرف اس کسوٹی پر بھی ذاکر صاحب کی بچوں کے لیے مخصوص تحریروں کو پرکھیں تب بھی کل مواد کے کم یا ناکافی ہونے کے علاوہ معنوی اعتبار سے اسے مکمل اور کافی معیاری پاتے ہیں۔

ایک مکمل بلکہ دائمی 'استاد' کی حیثیت سے ـــ اور یہ خطاب انھیں اپنے تمام اعزازوں میں سب سے زیادہ مرغوب تھا ـــ یہ بات فطری ہی تھی کہ ذاکر صاحب بچوں کے لیے تیار کی گئی نصابی یا غیر نصابی تحریروں سے سب سے زیادہ دل چسپی رکھیں۔ چنانچہ اپنی پوری زندگی میں تعلیمی، انتظامی، سماجی، سیاسی، غرض ہر طرح کے 'سمہائے روزگار' کے باوجود وہ کبھی اس خیال سے غافل نہیں رہے۔ ان کی لگ بھگ تمام تحریریں پہلے اسی رسالے 'پیام تعلیم' میں شائع ہوئی تھیں جو خود ان کے ایما پر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی سرپرستی میں ۱۹۲۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ بچوں کے لیے ان کی سب سے پہلی کہانی رقیہ ریحانہ کے نام سے تحریر کردہ 'باچھو' نومبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ذاکر صاحب کی زندگی میں کیا کیا کٹھن، خوش گوار اور ناخوش گوار، ہر طرح کے موڑ آئے ان کی تفصیلات یہاں دینا ضروری نہیں ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے یا کسی نہ کسی طرح ادب سے خود کو وابستہ ضرور رکھا۔ عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے اپنے مضمون 'کچھوا اور خرگوش۔ ایک تجزیہ' میں ذاکر صاحب کی اس کہانی

---

[1] اطہر پرویز۔ 'ادب کسے کہتے ہیں' ترقی اردو بیورو۔ ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۴-۱۵

کے متعلق لکھا ہے:۔

"اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کہانی ۱۹۲۶ء کے آس پاس لکھی گئی۔۔۔
گمان غالب یہ ہے کہ اسے ذاکر صاحب نے ۱۹۵۷ء میں بہار کا گورنر بننے
کے بعد لکھا ہے اور ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ منتخب ہونے کے بعد اس
پر نظر ثانی کی ہے۔۔۔"[1]

فی الوقت اس مسئلے سے بالکل قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کہانی فی الحقیقت بچوں کے لیے تصنیف ہے یا نہیں (اس پر بعد میں مختصر تبصرہ کیا جائے گا) اس بیان سے یہ بات بہر طور ظاہر ہوتی ہے کہ وہ لگ بھگ ۲۷-۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۷ء تک پراگندگیٔ حالات، انقلابات، قلت وقت اور شدت مصروفیت کے باوجود اس خیال سے غافل کبھی نہیں رہے۔ پھر بھی ۱۹۴۷ء سے پہلے ان کی تحریریں زیادہ اور زیادہ پابندی سے ملتی ہیں۔

ان کی تخلیقی ادب یعنی کہانیوں اور ڈراموں کی فہرست میں سب سے پہلے بلکہ زیادہ تر کہانیاں ایسی ملتی ہیں جو انھوں نے کچھ مصلحتوں کے پیش نظر اپنی لڑکی (جو چار پانچ سال کی عمر میں قرول باغ میں آناً فاناً انتقال کر گئی تھی) اس کے نام سے چھپوائی تھیں۔ اس کا اعتراف انھوں نے 'ابو خاں کی بکری' اور چودہ اور کہانیاں' خود ہی کیا ہے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں مکتبہ جامعہ نے کتابی شکل میں الگ الگ بھی شائع کی تھیں۔ ابو خاں کی بکری۔۔۔ مطبوعہ مکتبہ جامعہ، دوسرا اڈیشن، ۱۹۸۹ء، میں باقی چودہ کہانیاں ہیں ــــ عقاب، سعیدہ کی اماں، جولاہا اور بنیا، چھدّو، اندھا گھوڑا، آخری قدم، سچی محبت، ماں، بے کاری، پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی، مرغی اجمیر چلی، مرغی کا نرالا بچہ، اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم، اور آؤ گھر گھر کھیلیں۔

ان کے علاوہ ذاکر صاحب کی (رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع شدہ) کچھ اور کہانیاں جن میں سے کچھ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئیں، ان کے نام ہیں 'پاچھو' پن چکی والا، آدمی کی کہانی ایک ستارے کی زبانی، مہنگے انڈے اور ڈرامہ 'دیانت'، اور 'دکھو ناسونا'،

---

[1] عبداللہ ولی بخش قادری 'کچھوا اور خرگوش' ایک تعلیمی تجزیہ۔ نقش ذاکر، مرتبہ عبدالحق خاں۔ مکتبہ جامعہ، صفحہ ۲۱۸

ابھی تک بچوں کے لیے ان کی جن تحریروں کی تلاش کی جا سکی، وہ یہی ہیں۔ کچھ درسی کتابوں میں بھی ان کے کچھ چھوٹے مضمون چھپے ہیں۔

بچوں کی ایک کتاب "چھدّو" مطبوعہ مکتبہ جامعہ ۱۹۳۷ء میں چار میں سے تین کہانیاں تو رقیہ ریحانہ کے نام سے ہی ہیں لیکن ایک کہانی بعنوان "پان کو" ایسی بھی ملتی ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ویسے یہ ایک چینی لوک کہانی ہے۔ انداز تحریر ذاکر صاحب کی دوسری کہانیوں سے ضرور ملتا جلتا ہے مگر کہیں بھی یہ حوالہ نہ مل سکا کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ ذاکر صاحب کی ایک کتاب انگریزی میں بھی نظر آئی جس کا نام FABLES AND STORIES ہے۔ اصل میں یہ ان کی چھ کہانیوں۔ اندھا گھوڑا، عقاب جولاہا اور بنیا، اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم، سعیدہ کی اماں اور مرغی اجمیر علی کا ترجمہ ہے۔ جسے رادھے موہن صاحب نے کیا ہے اور انڈین پبلیکیشنس، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

ان تمام کہانیوں کو پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ ان میں سے کئی کہانیاں اگر ماخوذ نہیں تو کم سے ان کا بنیادی خیال کہیں اور سے لیا گیا ہے۔ لیکن اس سے ان میں کسی طرح کی اجنبیت کا احساس پیدا نہیں ہوتا اور ماحول، کردار، حالات و واقعات جگہوں کی تفصیلات وغیرہ سب پوری طرح مانوس محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کہانیوں کے بنیادی خیال کا کہیں سے مستعار لیے جانے کا خفیف سا اشارہ ذاکر صاحب کے اپنے ان چند جملوں میں ہی نظر آجاتا ہے جو انھوں نے "ابو خاں کی بکری ۔۔۔" کے پیش لفظ یا تعارف میں لکھے ہیں:۔

> "یہ کہانیاں بہت دن ہوئے، رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے انھیں نے سنائی تھیں۔ اور یہ کہہ کر سنائی تھیں کہ کہیں پڑھی ہیں یا کسی سے سنی ہیں مگر یاد نہیں کہ کب اور کہاں۔ میں نے ان سے پائی تھیں اس لیے ان کے نام سے شائع کیں۔ پھر رقیہ ریحانہ رخصت ہو گئیں۔"

چونکہ ان کی سب سے چھوٹی لڑکی ریحانہ لگ بھگ چار سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔ اور یہ عمر ایسی کسی طرح نہیں ہو سکتی کہ "ابو خاں کی بکری، عقاب، آخری قدم، سچی محبت" جیسی کہانیاں، جو اپنے بنیادی خیال کے اعتبار سے ہی کسی محکم مقصد کے تحت

لکھی گئی ہوں۔ ان کا ابتدائی تصور بھی کوئی اتنا چھوٹا بچہ بیان کر سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کا متذکرہ بالا بیان کسی حد تک کسر نفسی اور کچھ ضرورت شعری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کہانیاں کم سے کم اپنے بنیادی خیال کی حد تک کسی دوسری زبان سے یا کچھ اپنی اور کچھ غیر ملکی لوک کتھاؤں سے تعلق رکھتی ہیں جو کبھی انھوں نے بچپن میں سنی ہوں گی یا ان کے مطالعے میں آئی ہوں گی اور ان کے ذہن پر ان کہانیوں کے نقوش مرتسم ہو گئے ہوں گے۔ یہ بات خصوصاً بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے لیے نہ غیر معمولی ہے نہ معیوب۔ بہر حال ان میں سے ہر کہانی ایک اچھوتا خیال ضرور پیش کرتی ہے اور کچھ کہانیاں بچوں کے ذہنوں پر کچھ مثبت اقدار کے گہرے نقش ضرور چھوڑتی ہیں۔

گو کہ ذاکر صاحب کی کہانیوں پر بچوں کے ادب کے اصول و ضوابط کی روشنی میں تنقید یا تبصرہ ایک الگ موضوع ہو سکتا ہے (حالانکہ اردو میں ابھی بچوں کے ادب کے سلسلے میں اس صحت مند روایت کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی ہے) اور ان کے ایک ایک کہانی کا اس کے وقتی پس منظر کی روشنی میں تجزیہ کیا جا سکتا ہے لیکن فی الوقت ان کہانیوں کی کچھ ممتاز خصوصیات کا اجمالاً ذکر کیا جا رہا ہے۔

ان کی کچھ کہانیوں میں جو چیز سب سے ممتاز طور پر ابھرتی محسوس ہوتی ہے وہ بندھنوں کو توڑ کر ایک فطری اور خود اختیاری زندگی کی خواہش، آزادی کی حسرت اور اس کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس کے جذبات و احساسات کا والہانہ اظہار ہے۔ اس زمرے کی ایک مثالی کہانی تو خود "ابو خاں کی بکری" ہی ہے اس کے یہ چند جملے ملاحظہ ہوں:-

> "مگر عجیب بات ہے نہ ابو خاں کا پیار، نہ شام کے دانے کا لالچ ان بکریوں کو بھاگنے سے روکتا تھا، نہ بھیڑیئے کا ڈر۔ بس شاید یہ بات ہو کہ پہاڑی جانوروں کے مزاج میں آزادی کی بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اپنی آزادی کسی دام نہ دینے کو راضی نہیں ہوتے اور مصیبت اور خطروں کے باوجود آزاد رہنے کو آرام و آسائش کی قید سے اچھا جانتے ہیں"

مجھے اس وقت اسی سیاق میں اسماعیل میرٹھی کا یہ شعر یاد آرہا ہے

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر   تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

پھر جب ابو خاں کی بکری، چاندنی، پوری طرح جانتے بوجھتے کہ اسے بھیڑیا مار ڈالے گا۔ پوری ہمت سے بھیڑیے سے لڑ کر ختم ہو جاتی ہے، تو کہانی کے آخری جملے یہ ہیں:۔

"اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے وہ مصر ہے کہ چاندنی جیتی۔"

صحیح ہے ع برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ۔۔ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

کہانی عقاب میں عقاب جو ایک بلی کے بچے کو اپنے گھونسلے میں اٹھا لاتا ہے اور اپنے دوسرے شکاروں کے برخلاف اسے پالنا شروع کر دیتا ہے، اسے اُداس دیکھ کر سمجھاتا ہے۔

"طوفان جس سے دنیا والے ڈرتے کانپتے ہیں، ہمارے دروازے پر کیسے کیسے گیت گاتا ہے، کیا تجھے اس کا گانا اچھا نہیں لگتا؟ وادی والے آزادی کا مزہ کیا جانیں؟ وہاں تو غلام بستے ہیں غلام۔ ننھے ننھے سے جی، ہر دم خوف، ہر دم ہراس ۔۔۔۔۔۔۔"

ایک اور کہانی، مرغی کا نرالا بچہ، جو کسی پرانی کہانی سے ماخوذ محسوس ہوتی ہے، اس میں مرغی کا ایک نرالا بچہ جس کے ایک ہی پیر، ایک بازو، ایک آنکھ تھی اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے اور آخر میں ہوا اسے کسی مینار پہ اٹکا دیتی ہے، وہ آج تک وہیں سے ہوا کا رخ بتاتا ہے۔

"پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی"، میں بھی آزادی یا پکانے والی کی اس زیادتی کے خلاف بغاوت کے طور پر، کہ اس نے بے خیالی میں پوری کو آدھا جلا دیا تھا، وہ کڑھائی سے نکل کر بھاگ گئی۔ بدھو یعنی لڑکے سے بچی، کسانوں سے بچی، خرگوش سے بچی پھر لومڑی کے بھٹ میں گھس گئی، وہاں سے بھاگی، آخر میں ایک بھوکی کتیا نے اسے آدھا تو کھا لیا مگر اس کا باقی حصہ زمین میں گھس گیا جسے کتے آج تک ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بہر حال زیادتی کے خلاف ایک کم زور اور ناچیز سی شے کی بغاوت یہاں بھی موجود ہے۔

ان کی کچھ کہانیوں میں ایک اور خیال ـــ جو خود بندھنوں سے چھٹکارا پا لینے

یا آزادی کی خواہش کا ہی ایک دوسرا روپ ہے۔ زمین سے دور اڑنا، چاند ستاروں اور آسمان میں سیر کرنا، سمندر کی گہرائیوں میں اتر جانا وغیرہ وغیرہ ہے۔ یہ کہانیاں مکمل فنطاسیہ کے زمرے میں تو نہیں رکھی جاسکتیں مگر اس کے بہت قریب ضرور ہیں۔ شاید اگر ذاکر صاحب کے پاس وقت ہوتا اور وہ ایسی کہانیوں کو قلم برداشتہ لکھنے کے بجائے مکمل طور پر سکون سے تیار کر سکتے تو بچوں کے اردو ادب کو کچھ اچھی فنطاسیہ کہانیاں مل جاتیں۔ اس زمرے کی کہانیوں میں ایک 'چھدو' ہے، جس میں ایک طلسمی سنہری گھوڑے پر بیٹھ کر چھدو میدانوں، پہاڑوں، کھیتوں کھلیانوں اور جنگلوں سے گزرتا چلا جاتا ہے، پھر سمندر میں اسے ایک مچھلی کی سواری مل جاتی ہے، اپنے باپ کی آواز سن کر جو اسے ڈھونڈ رہا ہے وہ اور گہرا غوطہ لگاتا ہے، پھر اسے ایک پرندہ اوپر اڑا لے جاتا ہے جس پر یہ آسمان میں چاند ستاروں سے ہوتا ہوا بادلوں میں پہنچ جاتا ہے، پھر اسے بادل اڑائے اڑائے پھرتا ہے جہاں اسے اپنی ماں کی یاد آتی ہے اور وہ نیچے آجاتا ہے۔ 'باچھو' نام کی کہانی بھی اسی تصور کی کہانی ہے۔ خود 'عقاب' میں بھی بیکراں منظروں کے یہ خواب بیداری پوری طرح کھل کر دیکھے جاسکتے ہیں۔

جامعہ کے ابتدائی دور — علی گڑھ میں خیموں کی زندگی، پھر قرول باغ میں کئی الگ الگ کوٹھیوں کے کچھ کمروں کی گھٹن، پھر ۲۶-۱۹۲۵ء میں جامعہ کے اوکھلا منتقل ہونے پر یہاں کی مثالی ویرانی اور وہ پریشانیاں جن کا اندازہ لگانا بھی آج مشکل ہے، بجلی نہیں، میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں، کچھ کمرے موجود تو دروازے کھڑکیاں ندارد، کوئی بازار نہیں، ہو بھی تو خریدنے کو پیسے نہیں، چاروں طرف جنگل، سانپ، گیدڑ، کبھی کبھی بھیڑیے بھی۔ غرض دن رات کی زندگی ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھی۔۔ ایسے میں وہ شخص جو یہ سب کچھ جھیل رہا ہے اور اپنے ساتھیوں اور گھر والوں کو صبر و سکون سے اسے جھیلنے کی تلقین کر رہا ہے، وہ شخص جسے دنیا کی ہر خوبصورتی سے والہانہ محبت ہے، جب اپنے قلم سے ایک خیالی دنیا کا تانا بانا بنتا ہے تو اس کا نقشہ کچھ ایسا ہوتا ہے،

"پہاڑ کے دامن میں ایک ہری بھری لہلہاتی وادی ہے، جدھر دیکھو گھاس کا فرش، ننگے پاؤں بھی چلو تو ایسا معلوم ہو کہ پیر میں کسی ہوشیار کاریگر

کا بنایا ہوا بہت نرم چمڑے کا جوتا ہے۔۔۔ وادی میں چھوٹا سا دریا بہتا ہے، اس لیے پانی صاف ہے جیسے آئینہ، اور ٹھنڈا والا۔ دریا سے ہٹ کر ذرا اونچے پر بستی ہے۔۔۔ چھتیں ڈھلوان سرخ سرخ، بازار سلیقے کا، دکانیں خوب سجی۔۔۔ گاؤں کے ارد گرد دھان کے ایسے لہلہاتے کھیت کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔۔۔۔۔

'عقاب'

ایک اور خواب، کا مختصر سا ٹکڑا ملاحظہ ہو:۔

"بہت دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے دیس میں نیک لوگ بستے تھے اور دغا فریب بہت کم تھا۔ ہندو مسلمان سب ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کر سکتا تھا، جو جس کا حق ہوتا اسے مل جایا کرتا۔ ان دنوں میں ایک شہر تھا عادل آباد۔ پھر جب فرنگیوں نے یہاں قدم جمائے تو سارے سیاہ سفید کے مالک بن بیٹھے تو ہم پر ذمے داری نہ رہی، رنگ رنگ کے عیب پیدا ہو گئے۔۔۔۔۔۔"

اتنی کسک اور قنوطی انداز کے بعد، وہ ذاکر حسین، جو کسی مشن کے لیے جی رہے تھے پڑھنے والے، خصوصاً بچے کو، ایسی نا امیدی میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ چنانچہ آزادی حاصل ہونے سے پہلے ہی، اسی پیراگراف میں لکھا:۔

"اب فرنگی کا راج گیا، حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں آئی تو اب ایک نہیں سیکڑوں عادل آباد بسیں گے، پھولیں پھلیں گے۔ اس وقت تو اس پرانے شہر کا کچھ حال تمہیں سنائیں" (اندھا گھوڑا)

ان جملوں کو پڑھتے وقت مجھے بار بار خیال آیا کرتا ہے کہ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، ذاکر صاحب اور ایسے ہی بہت سے نیک لوگوں کے خواب دیکھیے کب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں۔

'سعیدہ کی اماں، یوں تو ایک بالکل معصوم بچی اور اس کی بیمار ماں کی کہانی ہے مگر جہاں مصنف آسمان، بادلوں، سورج اور اس کی کرنوں کے بیان پر آتا ہے تو اس کے انداز میں وہی خواب کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی کچھ کہانیاں خالص سماجی نوعیت کی ہیں۔ ان میں 'ماں' تو ایسی کہانی ہے کہ اس میں ہندوستان کی وہ زندگی پوری طرح ابھر آتی ہے جس میں ایک بیوہ ماں اپنے ہونہار بچے کو تعلیم حاصل کرنے شہر بھیجتی ہے، لڑکا محنتی بھی ہے، فرض شناس بھی، بہت آہستہ آہستہ کچھ محدود سی کامیابیاں بھی حاصل کرتا ہے مگر شادی کے بعد زندگی کے جھمیلوں میں ایسا پھنستا ہے کہ کوشش اور متواتر خیال کے باوجود برسوں ماں سے ملنے گاؤں نہیں جا پاتا۔ پھر جب سات سال بعد ماں کے پاس جاتا ہے تو اس کا پرانا چھوٹا سا مکان بک چکا ہے، ماں اندھی ہو چکی ہے، کسی اور کے یہاں رہتی ہے، لیکن جب حمید آتا ہے تو اس کی خوشی کا عالم ایسا ہی ہے کہ میں اس کے بیان کی خوبصورتی کو اپنے الفاظ دے کر ضائع کرنا پسند نہیں کروں گا۔ بس چند آخری جملوں سے پوری کہانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"مگر اماں یہ چادر، یہ غلاف، یہ جوتیاں، یہ سارا سامان، عطر، مراد آبادی اگالدان، اس کے لیے روپیہ کہاں سے آیا؟

ماں کی آنکھوں سے پانی کی دو چار بوندیں ٹپکیں اور اس نے ایسی آواز میں جس میں نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبت کا، کہا، بیٹا، تو اور یہ پوچھتا ہے؟ ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹا ہے۔ سات برس میں یہ تیار کر پائی ہوں۔ بیٹا سات برس میں!

ماں کی اس بات کو سن کر خاموشی کے فرشتے نے اس چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے پیر پھیلا دیئے۔ پھر رات بھر کسی نے کسی سے کچھ بات نہ کی۔"

اس کہانی کے انداز میں وہ پختگی اور دھیمی دھیمی آنچ کی سی کیفیت موجود ہے کہ پورا جذبہ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اگر اس کہانی کے لکھنے والے کا نام یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو اپنے انداز اور طرز بیان کی وجہ سے اسے پریم چند کی کہانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ زبانی روایت کے طور پر یہ بھی سنا ہے کہ یہ ان کے وطن کی کسی خاتون کی سچی کہانی تھی۔

خالص سماجی کہانیوں میں ایک کہانی 'سعیدہ کی اماں' بھی ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان کی شاہکار کہانی 'آخری قدم' ہے۔ جس میں جگہ جگہ ان لوگوں کو جو ذاکر صاحب

کی ذاتی زندگی اور ان فیوض سے جو براہ راست انھیں یا دوسرے افراد کو ان سے پہنچے ہیں، کسی قدر واقف ہیں، ان کی شخصیت کا پہلو جھلکتا نظر آئے گا، بے کاری، پن چکی والا بھی ان کی سماجی کہانیوں میں ہی شمار کی جا سکتی ہیں۔

ان کی کچھ کہانیاں پریوں، لوک کہانیوں، نیک لوگوں کی کرامتوں کے قصوں کے زمرے میں بھی آتی ہیں۔ ان میں جولاہا اور بنیا، اندھا گھوڑا، (جو بے حد خوبصورت تمثیلی کہانی کہی جا سکتی ہے) سچی محبت، مرغی کا نرالا بچہ، وغیرہ ہیں۔ ذاکر صاحب کے ڈرامے 'دیانت'، اور 'کھوٹا سونا'، بچوں کے ڈرامے کی کمی اور جامعہ میں بچوں کے ڈراموں کی پیش کش کی ایک خصوصی اہمیت کو مدّنظر رکھ کر اصلاحی انداز میں لکھے گئے تھے جو آسانی سے اسٹیج پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں 'دیانت' کو پریوں کی کہانی کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

میں معترف ہوں کہ یہ چند اشارے نہ ان کی کاوشوں پر کوئی تنقیدی مواد پیش کرتے ہیں نہ صحیح معنوں میں تعارفی ہی کہے جا سکتے ہیں۔ اور کسی مضمون کے ایک تہائی حصے میں اتنا لکھنا بھی شاید زیادتی تصور کی جائے گی۔ یہ تشنگی بہرحال اب بھی باقی ہے کہ ملک کے ایک عظیم ماہر تعلیم نے بچوں کی دلچسپی کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اس کے صحیح پس منظر کے ساتھ صحیح تحلیل و تجزیہ کیا جائے۔ شاید اس پس منظر کی صحیح معلومات کی کمی ہی کی وجہ سے آج ان کی کچھ کہانیوں کو پڑھتے وقت کچھ اور دکی کیفیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ بچوں کی تحریروں میں بھی ان کے کردار کی صوفیانہ روش، صالح اقدار کا کھل کر اعلان اور اس سلسلے میں کسی طرح بھی معاہدہ نہ کرنے کا اٹل رجحان ہر صورت میں موجود ہے۔

بہ حیثیت مجموعی ان کی کہانیوں کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ کچھ کہانیاں کسی قدر فلسفیانہ انداز میں لکھی گئی ہیں اور کافی بڑے بچوں، بلکہ شاید نوخیز سے بھی اگلی عمر والوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جن میں عقاب، ابو خاں کی بکری، اندھا گھوڑا، آخری قدم، سچی محبت، ماں، بے کاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک زبان کا سوال ہے، ان کی زبان پر کون حرف رکھ سکتا ہے۔ مگر بدنصیبی سے آج کے طالب علموں کا زبان کا معیار ہی اتنا گر گیا ہے کہ ان کی زبان اور طرز بیان کہیں کہیں مشکل لگنے لگتا ہے۔ یوں بھی یہ اس

لکھنے والے کا انداز بیان تھا جس نے آٹھویں جماعت میں اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں ایک مضمون میں یہ زبان لکھی تھی:

"اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ہر شخص کی مالی ترقی مجموعی ترقی ہوتی ہے، مگر طالب علم ہونے کی وجہ سے صرف دولت پیدا کرنے اور اپنے پیٹ بھرنے کو اپنا مقصد قرار دینا صرف طالب علم ہی کی نہیں بلکہ انسانیت کی بھی ذلت ہے ......

طالب علم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی طبیعت کو موجودہ حالت سے بہتر کرنا چاہتا ہے، جو اپنی قوتوں کو جہاں تک بڑھنے کی ان میں طاقت ہے وہاں تک ان کو بڑھانا چاہتا ہے۔ جو علم اور خیالات کے ان خزانوں سے جو ہزاروں برس میں سیکڑوں نسلیں اپنے آئندہ آنے والے وارثوں کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔

ع ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق

باشد بہ قدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو [1]

اس حصے کے بالکل آخر میں میں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ، اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے، عبداللہ ولی بخش قادری کے الفاظ میں ذاکر صاحب کی مشہور کتاب "کچھوا اور خرگوش" کے بارے میں ضرور کردوں۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپنے والوں کو اس کہانی نے اپنے نام اور ظاہر، سے خوب دھوکا دیا ہے۔ عموماً وہ بچوں کی کہانی سمجھی گئی ہے۔ اسے مرکزی وزارت تعلیم نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا، اور اسی وضع قطع کے ساتھ شائع کیا جب کہ ذاکر صاحب کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ۔ ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں مکتبہ جامعہ نے ۱۹۶۳ء میں پیش کیا تھا۔ کتاب کا مانوس اور شہرۂ آفاق والا عنوان اور اس کی یہ شان عالی دماغوں کے گریز کا باعث بنی اور بچے اسے سمجھنے سے قاصر تھے،

---

[1] ذاکر صاحب کا اولین مضمون "طالب علم کی زندگی" ۱۹۱۱ء۔ آٹھویں جماعت) مطبوعہ "گہوارہ"۔ جامعہ مڈل اسکول میگزین بسلسلہ ۹۰ سالہ سال گرہ ۱۹۸۶ء

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو خاطر خواہ پذیرائی آج تک حاصل نہیں ہو پائی ہے
یہ کہانی اپنے موضوع اور اپنی زبان دونوں اعتبار سے کلیتاً پختہ ذہنوں
کی چیز ہے اور بچوں سے صرف نام کا واسطہ ہے۔۔۔۔۔اور وہ ان کی
قوت اظہار، شوخی گفتار اور پاسداری احباب کا بھی نمونہ پیش کرتی ہے۔" [1]

بچوں کے ادب کو مجموعی دین

بچوں کے ادب کو ذاکر صاحب کی مجموعی دین، میرے نزدیک ان کی ذاتی تحریروں کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایک تجدیدی تحریک یا نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات ان کی زندگی کے پورے مشن کے لیے فطری طور پر بھی لازمی تھی کہ وہ بچوں کی کتابوں کی طرف ہر ممکن توجہ دیں۔ چونکہ خواہ کوئی طریقہ تعلیم بھی بچوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے اپنایا جائے کتاب کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ آج بصری ذرائع ابلاغ کے دور میں بھی تمام ماہرین تعلیم، ماہرین نفسیات، مصنف، ادیب، اور ثقافتی اقدار کو قومی زندگی میں اہمیت دینے والے چیخ چیخ کر لوگوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ بچے کو اچھی کتاب یا اچھے ادب سے بالکل بے تعلق نہ ہونے دیا جائے۔ اور ذاکر صاحب نے تو پورے یوروپ کا لگ بھگ شروع میں ہی دورہ کر لیا تھا جہاں بچوں کو اچھی کتابیں دینے کے کام کو کافی پہلے بنیادی حیثیت دی جا چکی تھی۔

بیگم صالحہ عابد حسین نے اور ذاکر صاحب کی بیٹی سعیدہ خورشید نے بچوں کے لیے اچھی کتابیں شائع کرنے کی ذاکر صاحب کی حسرت کا بار بار ذکر کیا ہے۔

"ان کی بڑی آرزو تھی کہ جیسی کتابیں بچوں کے لیے مغربی ملکوں میں

---

[1] عبداللہ ولی بخش قادری۔ کچھوا اور خرگوش، ایک تعلیمی تجزیہ۔ نقش ذاکر، مرتبہ عبدالحق خاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ صفحہ ۲۱۷

چھپتی ہیں ویسی ہمارے یہاں بھی چھپیں۔ یعنی اچھی لکھائی، عمدہ چھپائی، اچھے کاغذ، خوبصورت رنگین تصویروں کے ساتھ اچھی کہانیاں شائع ہوں، جسے دور سے دیکھ کر ہی بچے کا دل لوٹ پوٹ ہو جائے"۔ [1]

بچوں کے اردو ادب کے ۱۸۵۷ء سے پہلے حصے کے ذکر کو اختصار کے خیال سے صرف نظر کرتے ہوئے، بچوں کے ادب کا دوسرا اور قابل ذکر دور ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اسے کسی حد تک سرسید کی ادبی اور انسانی تحریک کی ایک شاخ یا کونپل کہا جاسکتا ہے۔ یہ دور جسے بچوں کے ادب کے بعض مبصرین ۱۹۴۷ء تک بڑھاتے ہیں اصل میں خود کئی چھوٹے چھوٹے حصوں پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر اس میں سب سے پہلے نصابی کتابوں کی تدوین و تیاری والا حصہ ہے، یا پہلی بار کچھ ایسے مضامین اور نظموں وغیرہ کی تیاری کا کام ہے جو کسی حد تک شعوری طور پر بچوں کے لیے ہی تیار کی گئی تھیں۔ ان میں سرسید اور مولوی ذکاء اللہ کے مضامین محمد حسین آزاد کی نصابی کتابیں اور معلوماتی مضامین، ڈپٹی نذیر احمد کی کچھ حکایات، حالی کی نظمیں اور سب سے اہم کڑی مولوی محمد اسماعیل کی درسی کتابیں، حکایتیں اور نظمیں شامل ہیں۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج جس قسم کے ادب کو بچوں کا ادب مانا جاتا ہے جس کی بنیادی خصوصیت صرف وعظ و نصیحت کے بجائے بچے کی اپنی دلچسپی اور انبساط کے توسط سے اس کی ذہنی اور علمی نشو و نما ہے۔ اس کی ابتدا اسماعیل میرٹھی کی ہی دین ہے۔ ان کی درسی حکایتیں اور نظمیں اور خصوصاً نظم و نثر کو ایک دوسرے میں اس طرح سمو دینے کا شیخ سعدی والا انداز جس سے یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن جائیں صرف بچوں کی دلچسپی کا ہی سبب نہیں بنتا بلکہ ان میں ادب عالیہ کے فہم و ادراک اور ذوق سلیم کی نشو و نما کے لیے ذہنی تربیت کی داغ بیل بھی ڈالتا ہے۔

بہر طور اردو میں بچوں کے ادب میں بیسویں صدی کے پہلے چوتھائی

---

[1] صالحہ عابد حسین۔ بچوں کے ذاکر صاحب، مرتبہ ولی اللہ بخش قادری۔ مکتبہ پیام تعلیم، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۸۳-۸۴

حصے اور کچھ بعد تک بھی، گو کہ کچھ وقیع نام۔ جیسے چکبست، اقبال، منشی پریم چند، حفیظ جالندھری، خواجہ حسن نظامی، امتیاز علی تاج، عظیم بیگ چغتائی، افسر میرٹھی وغیرہ۔ اور ان کی نظم و نثر کے بہت اچھے نمونے ضرور ملتے ہیں۔ مگر ان میں بیشتر حضرات اور ان کی تخلیقات کسی وقتی جذبے کی ہی دین تھیں کسی منصوبے کا حصہ نہیں تھیں۔ یہ سب بڑوں کے ادیب یا شاعر تھے۔ صرف افسر میرٹھی کو لگ بھگ پورے طور پر اور حفیظ اور چکبست کو کسی حد تک، بچوں کے ادب سے بحیثیت صنف زیادہ شغف تھا۔ اس دور میں ایک بات یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ صرف محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی اور افسر میرٹھی جیسے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر، جو تعلیمی میدان، خصوصاً بچوں کی نفسیات کا کسی قدر عملی تجربہ بھی رکھتے ہوں گے، باقی شعرا یا ادیبوں کا تعلق تعلیم و تعلم سے نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس دور کے بچوں کے ادب پر مجموعی طور پر نصابی اور اس سے بھی گہرا اصلاحی بلکہ واعظانہ اثر زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ اصل میں ابھی اس دور یا تصور کی ابتدا ہی نہیں ہوئی تھی جہاں بچے کو ایک علاحدہ اکائی، اس کی دنیا کو ایک الگ دنیا، اس کے کاموں کو انفرادی اہمیت اور اس کی دلچسپیوں، شرارتوں ضرورتوں اور ان کی تکمیل کو بڑوں کی دنیا سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت تک بچوں کے لیے عام طور پر بچوں کے لیے لکھنے والوں کا مقدس فریضہ، آخر کلام میں لفظی یا معنوی طور پر یہی ہوتا تھا کہ — بچو! اس کہانی سے تمہیں یہ سبق ملتا ہے کہ جھوٹ بولنا بہت بری بات ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب نے بچوں کی تربیت اور ان کی ذہنی نشو و نما کو ایک الٰہی فرض یا عبادت کے طور پر پورے منصوبے اور مکمل نظام کی طرح اٹھایا تھا، چنانچہ جامعہ کے قیام کے لگ بھگ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ایک اشاعتی ادارہ اردو اکادمی اور مکتبہ جامعہ بھی قایم کیا تھا۔ ۲۶-۱۹۲۵ء سے ہی ایک پندرہ روزہ اخبار پیام تعلیم کی داغ بیل بھی ڈال دی گئی تھی جس کی سرپرستی ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے سپرد تھی۔ شروع شروع میں اس رسالہ نما اخبار، میں بہت سیدھی سادی زبان میں بڑوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مضامین ہوتے تھے مگر صرف ایک سال بعد، یعنی ۱۹۲۷ء سے ہی اس میں بچوں کا صفحہ، علاحدہ

عنوان سے شامل کیا جانے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ بچوں کا حصہ بڑھتا چلا گیا اور چند سال بعد یہ بچوں کے لیے ایک بہترین معلوماتی، اصلاحی، تہذیبی، اور ادبی رسالہ ہو گیا جو چند چھوٹے چھوٹے وقفوں میں بند ہونے کے باوجود اب تک جاری ہے۔

اس رسالے کو چلاتے رہنے میں ذاکر صاحب، خاص طور پر، اور ان کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر عابد حسین صاحب، اور پروفیسر محمد مجیب اور جامعہ کے دوسرے اساتذہ کی کتنی کاوشیں شامل ہوں گی، اس کا اظہار اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور نت نئی پریشانیوں کے باوجود، یہ حضرات اس رسالے کو نہ صرف جاری رکھے رہے بلکہ خواہ ہندوستان میں ہوں یا ہندوستان سے باہر، متواتر اس کے لیے لکھتے بھی رہے۔ اس رسالے کی ایک اہم بلکہ منفرد خصوصیت یہ بھی رہی ہے جس سے میں ذاتی طور پر بھی فیضیاب ہوا ہوں ـــ کہ اس کے تمام اڈیٹروں نے نئے لکھنے والے، خصوصاً نونہال ادیبوں کی کاوشوں کو سراہا، انھیں چھاپا، ہمت افزائی کی، یہاں تک کہ تحریری یا زبانی مشورے، اصلاح اور تصحیح تک کے فرائض انجام دیئے۔ آج اردو کے کتنے ہی ادیب و مصنف ایسے ہیں جن کی ابتدائی ادبی اور تصنیفی تربیت اسی رسالے کے توسط سے ہوئی تھی۔

کسی قسم کے غلط فہمی کے ازالے کے لیے یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بچوں کے ادب میں پیام تعلیم واحد یا پہلا رسالہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں شاید سب سے پہلا رسالہ و بچوں کا اخبار، شائع ہوا، ۱۹۰۸ء میں پھول، ۱۹۲۲ء میں غنچہ وغیرہ شائع ہونے شروع ہو چکے تھے۔

بہر طور پیام تعلیم اور بحیثیت مجموعی مکتبہ جامعہ کا ایک اہم ترین رخ یہ ہے جس میں ذاکر صاحب کی کوششوں کو بالکل بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے ملک کے بہترین مفکروں، ادیبوں اور تقریباً ہر میدان کی جانی پہچانی شخصیتوں کو بچوں کے لیے لکھنے کے لیے تیار کیا اور ان سے برابر لکھواتے رہے۔ اسی لیے اس میں لکھنے والوں کی فہرست میں ایسے ایسے نام نظر آجاتے ہیں جن کے ادب عالیہ میں یا دوسرے میدانوں میں اپنے مخصوص مقام کے اثر کے تحت لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ انھوں نے بھی کبھی بچوں کے لیے لکھا ہوگا۔ کم سے کم اس سے

بچوں کے لیے لکھنے والوں کی وقعت میں اضافہ ہوا ہوگا اور اس تکلیف دہ تصور میں کچھ کمی آئی ہوگی کہ بچوں کے لیے لکھنے والے، کم علم، اور رھٹیچر، قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ حضرات تو بعد میں مستقلاً صرف بچوں کے لیے لکھنے والے ، ہی شمار ہونے لگے۔

نیچے دی ہوئی فہرست کو کسی طرح مکمل نہیں کہا جاسکتا، پھر بھی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے رسالوں میں ذاکر صاحب، عابد صاحب، مجیب صاحب کے علاوہ عبداللہ یوسف علی، سعید انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، غفار مدھولی، محمود علی خاں، شفیق الرحمن قدوائی، حافظ فیاض احمد، معین الدین حارث، سعد الدین انصاری، ڈاکٹر سدھیندر ناتھ بوس، خواجہ غلام السیدین، مولانا شوکت علی، محمد علی جوہر، مسٹر رام چندرن، محمود حسین خان گاندھی جی (ترجمہ) جواہر لال نہرو (ترجمہ) شفیع الدین نیر، حسین حسان، عبد الواحد سندھی، کرنل بشیر حسین زیدی، رشید احمد صدیقی، حامد علی خاں، غلام ربانی تاباں وغیرہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ذاکر صاحب کی ایسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ۴۷ء کے بعد بھی ہمیں بہت بڑے بڑے نام پیام تعلیم اور مکتبے کے بچوں کے مصنفین میں نظر آتے رہتے ہیں۔ شفیع الدین نیر، حسین حسان، اطہر پرویز، قدسیہ زیدی، اور کئی ایسے ایسے ناموں کے علاوہ جنھیں اردو ادب میں صرف بچوں کا ادیب مانا جاتا ہے کچھ اور نام اگلی نسل میں بھی ایسے آتے ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور اس سے اس صنف کو ایک وقار اور وقعت نصیب ہوتی ہے۔ ان میں کرشن چندر، کنھیا لال کپور، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، آصفہ مجیب، خواجہ احمد عباس، اطہر پرویز، عبداللہ ولی بخش قادری، یوسف ناظم، مظفر حنفی، غلام حیدر وغیرہ جیسے نام شامل ہیں۔

اس طرح ذاکر صاحب کی ایک اہم ترین دین، جو ان کی ذاتی تحریروں سے زیادہ اہم اور فیض رساں کہی جاسکتی ہے۔ یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے ادب کو ثانوی یا اضافی حیثیت سے اٹھا کر ایک بنیادی اور بے حد وقیع حیثیت عطا کردی اب سے یہ بذات خود ایک علاحدہ صنف ادب سمجھی جانے لگی۔

شفیع الدین نیّر، غفار مدھولی، حسین خاں، عبد الواحد سندھی، اور جامعہ کے بہت سے استادوں نے اور بعد میں اور بہت سے لوگوں نے جب اس کام کو سنجیدگی سے سنبھالا تو اسماعیل میرٹھی کی طرح پڑھنے والے زمرے کی زبان کی معلومات، علمی استعداد، سمجھ بوجھ، یہاں تک کہ گرد وپیش تک کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کی کہانی کے بنیادی خیال، اس کے پلاٹ اور پڑھنے والے کی عمر کی مناسبت سے کہانی کی طوالت، الفاظ کے استعمال، جملوں کی ساخت، بعض جملوں کی تکرار، ان کی موسیقیت، غرض نوک پلک سنوارنے کا پورا پورا خیال رکھا۔ نیچے دیئے ہوئے کہانیوں کے صرف چند عنوانوں سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتابیں بچوں کو کتنی پسند آتی ہوں گی۔ "تاک دنا دن تاکے سے، پھر میں جگنوں کیا خاک، پان کھاکر طبلہ بجاکر رام ناچا، ایک پوری تیل میں، ویکڑ دم کٹے کو ہو وغیرہ۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے ان کتابوں کی تصویروں کا معیار تو بہت اونچا نہ ہوتا تھا مگر تحریر جلی اور بے حد خوش خط، اور جملوں کی نشست تک کا خیال رکھا جاتا تھا۔

ایک اور اہم پہلو جس کا خیال پیام تعلیم اور مکتبہ جامعہ کی بچوں کی اشاعتوں میں شروع سے رکھا گیا وہ عام معلوماتی اور خصوصاً سائنسی اور جغرافیائی موضوعات کی شمولیت تھا۔ اوپر دیئے ہوئے لوگوں میں کسی نے اپنے سفر نامے، کسی نے کہانیوں اور قصوں کے ذریعے، کسی نے براہ راست سائنسی مضامین یا کتابیں لکھ کر، انٹرویو دے کر، غرض ہر طرح شروع سے ہی ان موضوعات پر کام کیا جنھیں آج کل بچوں کے ادب کی اصطلاح میں، نان فکشن، NON-FICTION کہا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں پیام تعلیم اور مکتبے کی مطبوعات کے ذریعے لگ بھگ ۱۹۴۵ء میں ایورسٹ کی کہانی، مقناطیس کی کہانی، بجلی کے کرشمے وغیرہ جیسی بے حد دلچسپ اور مفید کتابیں پڑھ چکا تھا۔

اس تجدید بلکہ تخلیق نو کے باوجود، جو ذاکر صاحب اور ان کے کچھ بے لوث ساتھیوں کے جذبے اور لگن سے ہی پوری کی جاسکتی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ ذاکر صاحب کا وہ خواب کہ ہندوستانی، خصوصاً اردو پڑھنے والے بچوں کے ہاتھوں میں بھی مغربی ممالک جیسی خوبصورت کتابیں آنے لگیں، ان کی اپنی زندگی میں کماحقہٗ پورا نہ ہوسکا

بلکہ ابھی تک بڑی حد تک تشنہ مندۂ تعبیر ہے۔ ان کے ایک عزیز دوست اور انتہائی باعمل کردار، کرنل بشیر حسین زیدی نے ذاکر صاحب اور اپنے کچھ دوستوں کی مدد سے 'کتابی دنیا لمٹیڈ' قائم کی تھی جو اپنی زندگی کے دو سال بھی پورے کیے بغیر تقسیم ملک اور اس کے نتیجے میں دہلی کی رواروی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یہ ان کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اپنے مختصر سے عرصۂ حیات میں ہی اس نے کچھ ایسی مفید اور گیٹ اپ وغیرہ کے اعتبار سے اتنی خوبصورت کتابیں شائع کی تھیں کہ وہ اپنے وقت کا مایہ ناز سرمایہ تھیں۔ کچھ بعد میں اس کام کو کسی حد تک نیشنل بک ٹرسٹ نے (زیادہ تر ترجموں کی صورت میں) پبلیکیشن ڈویژن، ترقی اردو بیورو وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ لیکن ۱۹۸۷ء سے ایک بڑی دلیرانہ کوشش ایک رضاکار تنظیم، بچوں کا ادبی ٹرسٹ، نئی دہلی نے کی (جس کا بانی اور سکریٹری راقم الحروف ہے) اگر حالات سازگار ہوں تو اس ادارے سے امید کی جا سکتی ہے کہ یہ ذاکر صاحب کے اس خواب کو بھی کسی حد تک پورا کر سکے۔

مضمون کے اس حصے کے اختتام پر سب سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ فی الحقیقت یہ دور ایک مکمل تحقیق کا متقاضی ہے۔ بہر طور زیر مضمون میں فراہم کی گئی معلومات کی کمی، تشنگی و پراگندگی کے اعتراف کے ساتھ صرف اتنا کہوں گا کہ اگر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں، اور ان سے ترغیب حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو اس کام میں اکثر بلامعاوضہ وقف کر دینے والوں کے جذبے لگن اور تحقیقات کو فراموش کر کے اردو میں بچوں کے ادب کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا جائے تو یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے سرسید تحریک، حالی، اقبال اور ترقی پسند تحریک کو حذف کر کے اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کر لیا جائے۔

کردار سازی

اب میں 'ادب' کے اس پہلو کا مختصراً ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا اظہار ہمارے بزرگ "باادب بانصیب بے ادب بے نصیب" کے مختصر سے جملے میں کیا کرتے تھے۔ ظ۔ انصاری نے بھی بچوں کے لیے اپنی ایک کتاب 'حاجی بابا کی ڈائری' میں،

شروع میں ایک مضمون بچوں کے لیے لکھنا، میں بھی اس "ادب" کی طرف بڑے خوبصورت انداز میں اشارہ کیا ہے:۔

"اس مضمون کا عنوان ہونا چاہیئے تھا: بچوں کا ادب، دوسروں نے یہی عنوان رکھا ہے، لیکن خاکسار، ناچیز کو خیال آیا کہ بچوں کا ادب کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک نہیں دو مضمون لکھوں۔ (۱) بچوں کا ادب (۲) بڑوں کا ادب۔ یعنی بچے کس طرح ادب کرتے ہیں۔ اور بڑوں کا ادب کیسے کرنا چاہیئے"۔ ؎

ذاکر صاحب استاد تھے چھوٹے بچوں، نوخیزوں، نوجوانوں سے لے کر اپنے ساتھیوں، استادوں تک اور عمر کے آخری حصے میں تو انھوں نے پورے ملک و قوم کو بھی کچھ اقدار و روایات کا سبق دینے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنے قریب کے لوگوں، خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کو "ادب" اور زندگی کا سلیقہ کس انداز میں سکھانے کی کوشش کرتے تھے یا کس کس طرح ان پر اثر انداز ہوتے تھے، ایسے کچھ واقعات میں میں بذات خود شریک رہا یا میرے ساتھی شریک رہے، کچھ دوسروں سے سُنے یا ان کا مشاہدہ کیا۔ اب مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کن کن کو چُنا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔ شاید سب سے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ چند واقعات کو ان کے مختصر پس منظر کے ساتھ بیان کر دیا جائے، فاضل قارئین ان سے خود ہی نتیجہ اخذ کرلیں گے۔ اس سلسلے میں بطور معذرت صرف اتنا عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس بیان میں میری کچھ ذاتی کمزوریوں، اچھی یا بری کیفیتوں یا کبھی ذم یا مدح کے رخ ظاہر ہونے کا اندیشہ ہے، مگر "ضرورت شعری" میں کچھ معمولی سقم بھی برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔

ذاکر صاحب سے پہلا براہ راست یا بالمشافہ معاملہ جامعہ کی پچیس سالہ مشہور و معروف جوبلی کے ہنگاموں کے چند دن بعد کچھ اس طرح ہوا کہ جامعہ کے

؎ ظ۔ انصاری۔ حاجی بمبا کی ڈائری، پیش لفظ بعنوان "بچوں کے لیے لکھنا"۔ مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی ۱۹۸۸ء۔ صفحہ ۳

کارکنوں نے اس وقت کے بدترین سماجی سیاسی ماحول کے باوجود، اس کی شاندار کامیابی پر ذاکر صاحب کو مبارک باد اور تہنیت پیش کرنے کے لیے ایک جلسہ کیا تھا اس جلسے کی تقریروں اور ان کچھ تحفوں سے جو ذاکر صاحب کو بطور مبارک باد پیش کیے گئے تھے، وہ کافی ناخوش ہوئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ جلسہ کچھ بے لطفی یا رواروی میں ختم ہوا تھا۔ میرا رول اس میں صرف اتنا تھا کہ میں نے قرول باغ کے اسکول سے آکر اقبال کی مشہور و معروف غزل نما نظم "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"، بڑی خوش الحانی سے پڑھی تھی۔ جس کام کے لیے میں اس زمانے میں وقف تھا۔ جلسے کے تناؤ سے بے تعلق، میں اپنے بڑے بھائی قیصر نقوی صاحب کے ساتھ (جنھوں نے خود اس جوبلی کا بہت کام کیا تھا) شیروانی ٹوپی پہنے میں صرف اپنی اچھی نظم خوانی پر نازاں کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ذاکر صاحب اپنے معمول سے زیادہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ شاید مجھے اپنی تحسین و توصیف کی امید ہو گی، مگر بہت جلدی ان کے کسی قدر خشک انداز اور تیکھے الفاظ نے یہ طلسم توڑ دیا۔ ان کے الفاظ کچھ اس طرح تھے:۔ "آپ نظم تو بہت اچھی پڑھتے ہیں۔ مگر ایک بات یاد رکھیے۔ ویسے یہ بات اصل میں تو مجھے آپ کے استادوں کو سمجھانی ہے، مگر آپ اسے ہمیشہ کے لیے گرہ میں باندھ لیجیے۔ اپنی زبان سے کبھی کوئی لفظ ایسا نہ نکالیے جسے آپ خود ہی پوری طرح سمجھتے نہ ہوں۔ آپ اپنے بزرگوں یا استادوں سے معافی مانگ لیجیے۔ آپ کیا جانیں کہ ستاروں سے آگے اور کون سے جہاں ہیں، آپ کو عشق کے کن کن امتحانوں کا پتہ ہے؟" وہ نہ معلوم اور کیا کیا کہتے رہے۔

میرا زعم اور احساس امتیاز تو پہلے دو جملوں میں ہی ٹوٹ چکا تھا، مگر آج سوچتا ہوں کہ یہ کتنا عظیم اصول ہے۔ اگر ہر مذہب کے ماننے والے ان تمام چیزوں کو سمجھ کر ادا کریں جو اپنی عبادتوں میں ہر وقت رٹتے رہتے ہیں، ہمارے سیاست دان ان اصولوں کو جن کی مالا وہ دن رات جپتے ہیں، مصلحین قوم اپنے زریں اقوال، کو فی الحقیقت سمجھ کر اپنی زبان سے ادا کریں تو اب و گل کی یہ دنیا بھی جنت سے کم نہ ہو۔

ایک اور منظر کا ذکر صرف تلمیحاً اس لیے کر رہا ہوں کہ میں بہت پہلے اپنے ایک مضمون 'ہڈی کی پلیٹ'، (جو ذاکر صاحب کی حیات میں ان سے اجازت حاصل کرنے کے بعد لکھا گیا تھا) میں اس واقعے کا تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

فرشی میز کے دونوں طرف بیٹھے ثانوی جماعتوں کے لڑکے کھانا کھا رہے ہیں ۔ ذاکر صاحب حسب معمول ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہیں اور ایک میز چن کر اس کی 'ہڈی کی پلیٹ'، (جس میں لڑکوں نے اپنی ناپسندیدہ سبزی کی پلٹیں لوٹ دی تھیں، اور روٹی کے کچھ کنارے بھی پڑے تھے) اپنی طرف بڑھا کر، روٹی کی ڈلیا سے روٹی لے کر اسی میں سے کھانا شروع کر دیتے ہیں، اس کے بعد جو الفاظ انھوں نے بھرپور محبت کے انداز میں ہم سے کہے تھے کچھ یوں تھے :۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ملک میں، بلکہ تمہارے اسی شہر میں، یا تمہارے آس پاس کی اسی بستی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنھیں اگر یہ بھی کھانے کو مل جائے، جو تم نے اس ہڈی کی پلیٹ میں پھینکا ہے، تو آج رات وہ بھوکے نہ سوئیں گے۔۔۔۔"

بچوں کی تادیب اور ان کی تربیت کا یہ پہلو ذاکر صاحب کی پوری زندگی میں سب سے زیادہ واضح اور روشن تھا، مگر لوگوں نے ان کے دوسرے کاموں کو زیادہ اہمیت دینا مناسب سمجھا۔

ذاکر صاحب نے کسی موقعے پر بھی اپنے اس 'کردار ساز استاد' کے رول کو فراموش نہیں ہونے دیا۔ ذرا یہ منظر بھی ملاحظہ ہو :۔ میرے بچپن سے یونیورسٹی تک کے ہم جماعت اور عزیز دوست پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے والد شفیق الرحمٰن قدوائی، ذاکر صاحب کے چند عزیز ترین ساتھیوں اور جامعہ کے بے حد فعال کارکنوں میں سے تھے۔ ان کا جب دہلی میں انتقال ہوا ہے تو میں اور صدیق صاحب انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں مصروف تھے۔ ان کے انتقال کی اطلاع ملتے ہی مجھے جو پہلا خیال آیا ہے وہ یہی تھا کہ صدیق کا یہ سال یقیناً ضائع ہو جائے گا چونکہ صرف ایک دن چھوڑ کر اگلا پرچہ تھا۔ اس سلسلے میں خود

صدیق صاحب کے لکھے ہوئے الفاظ ہی صورت حال کی بہترین عکاسی کر سکتے ہیں :-

"۔۔۔۔ (علی گڑھ سے دہلی آتے ہوئے) راستے میں ذاکر صاحب نے مجھے انتقال کی خبر سنائی، اور پھر انھوں نے جو کچھ کہا کچھ ایسا تھا کہ آج تک وہ لمحے بار بار یاد آتے ہوئے لگتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب تمہارے امتحان کا دوسرا پرچہ ہونے والا ہے۔ تم سب سے بڑے بھائی ہو۔ سب کہیں گے کہ ان حالات میں اب کیا امتحان دو گے۔ تمہارا جی چاہے گا کہ اس وقت اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو نہ چھوڑوں۔ مگر تم کیا ابھی سے حادثات کے آگے شکست قبول کرنے لگو گے۔ ظاہر ہے یہ بڑا حادثہ ہے۔ سب رو رہے ہوں گے اور تمہیں دیکھ کر اور روئیں گے۔ مگر تمہیں جتنا رونا ہے ابھی رو لو۔ وہاں پہنچ کر تمہیں رونا نہیں ہے تم سب کو سمجھاؤ گے، ڈھارس دو گے اور میرے ساتھ کل ہی آکر امتحان دو گے"۔ [1]

اور صدیق صاحب فی الحقیقت اگلے پرچے میں وقت پر موجود تھے۔ ذاکر صاحب کا یہ احساس فرض خواہ ہمیں عجیب لگے مگر ان کے لیے کوئی زیادہ غیر معمولی بات نہ تھی۔ ان میں بذات خود بھی اتنا ضبط و تحمل تھا کہ اپنی سب سے چھوٹی بچی کی غیر متوقع موت کی خبر ملے اور وہ اس وقت کے اپنے فرض کو ـــ یعنی بچوں کے سالانہ نتائج پر تقسیم انعامات کا کام ـــ سکون سے پورا کرتے رہیں۔ [2]

مختصراً، ایک منظر اور ملاحظہ ہو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۴۹-۱۹۴۸ء کے بعد سے نئی زندگی کے نت نئے پہلوؤں کا آغاز ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی کا ترانہ پیش ہو چکا ہے (جسے پہلی بار پیش کرنے والے چار طالب علموں میں ایک میں بھی تھا) پھر

---

[1] پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، 'ذاکر صاحب: ایک شفیق بزرگ، نقش ذاکر، مرتبہ عبدالحق خاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۷ء صفحہ ۳۱۲ [2] ملاحظہ ہو ذاکر صاحب کی کہانی، سعیدہ خورشید عالم۔ نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۹۶

ایک ,فوک سانگ اینسامبل تشکیل ہوا, پروفیسر نورالحسن اور پروفیسر مونس رضا کی سرپرستی اور وامق جونپوری کی شاعرانہ صلاحیتوں کے سائے میں مختلف صوبوں اور مختلف زبانوں کے لوک گیت اور گروپ سانگ تیار ہوئے۔ علی گڑھ میں پہلی بار یہ انہونی بات بھی وقوع پذیر ہوئی کہ لڑکوں اور لڑکیوں نے مل کر ڈرامے اور گروپ سانگ وغیرہ تیار کیے, اس گروپ نے دہلی میں منعقدہ انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ اپنی ثقافتی میراث اور اسے پیش کرنے کی غیر معمولی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا کر یونیورسٹی واپس ہوئے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت ہم سب کی وہ عمر تھی کہ چھوٹی سی کامیابی کا نشہ بھی کئی کئی دن دماغوں پر چڑھا رہتا تھا اور اس وقت تو سات روزہ فیسٹیول میں جنت نگاہ اور فردوس گوش ہر طرح کا خمار بھی شامل تھا۔ بہر طور واپسی کو ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے اور ہمارے پیر ابھی مشکل سے ہی زمین پر پڑ رہے تھے کہ ہمیں بالکل دفتری انداز میں اطلاع ملی کہ ذاکر صاحب نے پورے گروپ کو ناشتے پر مدعو کیا ہے۔

اس ملاقات کی تفصیل کو صرف یادوں کے گوشوں میں محفوظ رکھتے ہوئے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کئی گھنٹے کی نشست میں ذاکر صاحب نے ناشتے کے دوران, باغ میں ٹہلتے ہوئے, ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بات چیت کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو مہذب, بااخلاق, آزادانہ مگر مشرقی تہذیب کے تمام اصولوں کی پابندیوں, طرز گفتگو, طرز عمل, اور نشست و برخواست کی ترتیب کے بھرپور فرائض انجام دیئے۔ انھوں نے اپنے ذوق وشوق سے سینچے ہوئے چمن کا ایک ایک پھول تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو پیش کیا۔ لیکن اس ساری نشست کا نچوڑ ان کی وہ آخری گفتگو تھی جس نے ہمارے مہینوں کے خمار کو توڑ کر ہمیں پھر اسی سخت زمین پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں ہمیں ایک حقیقی زندگی گزارنی تھی۔ ان کے الفاظ کچھ اس انداز کے تھے۔

"آپ کے کندھوں پر اس عظیم یونیورسٹی کے اس تہذیب وتمدن کی ذمے داری رکھی گئی ہے, جس کا چرچا ساری دنیا میں ہے۔ آپ پر حقیقت

میں پوری قومی ثقافت کے سفیر ہونے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔
اس کی ذرا سی لغزش اس اعتماد کو توچکنا چور کر ہی دے گی جو آپ پر
اس یونیورسٹی نے کیا ہے۔ اس سے یونیورسٹی کے ماتھے پر ایسا کلنک
بھی لگ سکتا ہے جس سے ہمارا سر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھک جائے
گا اور اس کے لیے صرف آپ ذمے دار ہوں گے۔ آپ کی عمر میں
یقیناً سب ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔ یہ قانون قدرت ہے۔
یہ صحت مند علامت بھی ہے، مگر آزادی اور تہذیب یافتہ زندگی کی
کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں، کچھ آداب ہوتے ہیں۔۔۔۔۔''

انھوں نے اس وقت بہت کچھ کہا تھا جو اس سے پہلے کے خوشگوار ماحول کے تضاد میں ایک غیر متوقع جھٹکے یا جھنجھوڑ سے کم نہیں تھا، مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی اس تیکھی تقریر میں یہاں تک آگے بڑھ گئے تھے کہ مجھے ہوسٹل واپس آکر انگریزی کے لفظ FLIRTING کے مفہوم کو سمجھنا پڑا تھا۔ لیکن یقین جانئے کہ ان کی یہ تیکھی گفتگو بعد کے ماحول میں دوا کی بڑی باا ثر خوراک ثابت ہوئی تھی۔

میں آخر میں یہ ایک واقعہ صرف اس لیے دہرانا چاہتا ہوں کہ اس سے صرف ذاکر صاحب کی اس خصوصیت پر ہی روشنی نہیں پڑتی کہ وہ نوجوانوں کے جذبات اور ان کے جذبۂ خود اعتمادی کی کتنی قدر کرتے تھے بلکہ اس واقعے سے اس وقت کی یاد بھی آتی ہے جس دور میں مسلمان طالب علموں کو خاص طور پر اور تمام مذاہب کے طالب علموں کو عام طور پر اتنا فیض پہنچا ہے کہ آج تک اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کسی نے نہیں کی ہے۔

ذاکر صاحب جب علی گڑھ پہنچے ہیں تو وہاں کی زبوں حالی کے ایک رخ کا اندازہ تو رشید احمد صدیقی کے ان چند جملوں سے ہی لگایا جاسکتا ہے:

''۔۔۔۔۔ یونیورسٹی تقسیم ملک کے اندوہناک نتائج سے دوچار
تھی یونیورسٹی میں یونیورسٹی سے باہر دور نزدیک چاہے جس حیثیت
کا آدمی ہو جو کچھ جی میں آتا سناکر اور ایک طور پر ہم سے نیک چلنی
کی ضمانت لے کر چلا جاتا۔ اخبارات میں کاونسل میں، جلسوں میں

ہمارا ہی ذکر خیر ہوتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خطرے اور خواری کے وہ دن اب بھی یاد ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ،، [1]

لیکن اس کے علاوہ ایک بڑا ہمت شکن رخ اور بھی تھا ۔ وہ تھا تقسیم کے بعد یہاں رہ جانے والے طالب علموں کی مالی زبوں حالی کا ۔ یونیورسٹی میں اس وقت آنے والی آبادی کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جو عام حالت میں اپنے وطن میں رہ کر بھی کسی کالج میں پڑھنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتا تھا ۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا گواہ ہوں کہ اکیلا میں ہی نہیں ، میرے تمام دوستوں میں (جب کہ میں قلندری میں بھی بے حد کثیر المشرب رہا ہوں) میرا کوئی دوست سوائے شاہ افغانستان کے ، ایک قریبی عزیز کے ، ایسا نہیں تھا جس کے پاس یونیورسٹی کے اخراجات کے لیے اس کے گھر سے پورے پیسے آتے ہوں ۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں ، صرف دو چار کی حد تک ، کچھ پیشہ ور قسم کے ، نادار طالب علم ، جیسی ، کالی بھیڑیں بھی ہوں ۔

بہر طور میرا خیال ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سرسید کے ایم ۔ اے ۔ او ۔ کالج نے جتنا اہم کردار مسلمانوں ، اور بحیثیت مجموعی پورے شمالی ہندوستان کے جاگیردار اور زمیندار گھرانوں میں تعلیم کے فروغ میں انجام دیا تھا اتنا ہی ، بلکہ اگر بے لاگ تحقیق کی جائے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۴۸ء سے لگ بھگ پندرہ بیس سال تک شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کو باقی رکھنے میں ادا کیا تھا ۔ جو لوگ اس زمانے کے علی گڑھ سے واقف ہیں انھیں یاد ہو گا کہ ، فل اور ہاف فری شپ ، رڈیوسڈ ریٹس ، روم رینٹ کی معافی ، وغیرہ جیسی سہولتوں کے علاوہ ڈیوٹی سوسائٹی ، رفیع ریلیف سوسائٹی ، سیفی ریلیف فنڈ ، یونین ریلیف فنڈ ، پرووسٹ فنڈ ، اور نہ جانے کون کون سے طریقے طالب علموں کی مالی امداد کے لیے ایک مشنری جذبے کے ساتھ کام کرتے تھے ۔ اور پھر جب سب کچھ ختم ہو جاتا تو باقی تمام معاملات وائس چانسلر کو بھیج دیئے جاتے تھے ۔ مجھے

---

[1] ذاکر صاحب کی کہانی ۔ سعیدہ خورشید عالم ۔ نیشنل بک ٹرسٹ ، ۱۹۷۶ء ، صفحہ ۵۰

یاد نہیں آتا کہ کوئی طالب علم (جب کہ ایسے 'پھکڑ' ہی میرے زیادہ تر ساتھی تھے) صرف اس لیے امتحان سے محروم کر دیا گیا ہو کہ اس نے یونیورسٹی کے 'ڈیوز' ادا نہ کیے ہوں۔

ذاکر صاحب نے اس عمل میں ذاتی طور پر کتنا حصہ لیا اس کا صحیح اندازہ تو اس زمانے کی فائلوں کی گہری تحقیق سے ہی لگایا جا سکتا ہے لیکن میں ذاتی تجربے کی بنا پر کم سے کم اتنی بات کا ضرور شاہد ہوں کہ طالب علموں کی ایک بہت بڑی تعداد جن میں جامعہ سے علی گڑھ جانے والے طالب علم بطور خاص شامل تھے، ان کی لگ بھگ پوری ذمے داری ذاکر صاحب نے ذاتی طور پر قبول کی ہوئی تھی۔ ان میں بعض طالب علم ایسے بھی تھے جن کے ذاتی جیب خرچ تک انھیں ماہ بہ ماہ ذاکر صاحب کی طرف سے مل جاتے تھے۔ میں اسی سلسلے کے ایک غیر معمولی قصے کی یاد کے ساتھ اس شخص کے ذکرِ خیر کو ختم کروں گا جو اپنے ہر قول و عمل سے بچوں، نوخیزوں اور نوجوانوں کو، ان کی عمر کی ہر سطح پر، زندگی کا سلیقہ یا ادب، سکھانے اور ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔

میں اپنے ایک عزیز دوست کے ساتھ ایک ہی مقصد، یعنی مالی پریشانیوں کا حل تلاش کرنے کی غرض سے ان سے ملنے گیا۔ ہم دونوں 'نیشنل سیمپل سروے' کی کسی اسکیم میں جز وقتی کام کرنے اور اس سے کچھ کمانے کی تجویز لے کر گئے تھے تاکہ ذاکر صاحب پر سے ہماری مالی امداد کا کچھ بوجھ بھی کم ہو جائے اور اس سے بھی زیادہ ہمارے جیب خرچ وغیرہ کے لیے معقول انتظام ہو جائے، جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب نے ہماری تجویز کو تو پہلے جملے پر ہی یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ 'کام' اور 'پرورش' دو الگ چیزیں ہیں۔ شاید وہ چاہتے یہ تھے کہ ہم پوری توجہ سے ایم۔ اے۔ کی اپنی پڑھائی میں لگے رہیں۔

میرے وہ دوست بھی جامعہ سے ہی پڑھ کر گئے تھے جہاں خود ذاکر صاحب اور ان کے شاگردوں کی تربیت کے زیرِ اثر اپنے خیال کو بے جھجک بلکہ دو ٹوک انداز میں ظاہر کر دینے کا سبق بار بار سکھایا جاتا تھا۔ بہرحال میں تو خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سنتا رہا مگر میرے دوست میں بڑی جرأت رندانہ تھی۔ گفتگو کی

تفصیلات کو حذف کرتے ہوئے صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ ذاکر صاحب انھیں اپنی جیب سے جیب خرچ بھی دینے پر مصر تھے اور وہ اس بات پر جمے ہوئے تھے کہ وہ ذاتی جیب خرچ کے لیے کسی سے کچھ نہیں لینا چاہتے۔ اس اچھی خاصی ردّوقدح کا۔ جس میں ذاکر صاحب کے چہرے پر کچھ زیادہ سرخی محسوس ہونے لگی تھی آخری مکالمہ کچھ اس طرح تھا۔ ذاکر صاحب نے کسی قدر جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا:۔

"اچھا۔ آپ مجھے اپنا بزرگ مانتے ہیں۔ ؟

"جی۔ بالکل۔"

"تو پھر ایسے ایک بزرگ کا حکم سمجھ کر یہ رقم آپ مجھ سے ادھار کے طور پر لیتے رہیے"

اور یہ کہہ کر انھوں نے دس دس روپے کے دو نوٹ میرے دوست کی جیب میں رکھ دیئے اور کھڑے ہو کر برآمدے تک آ گئے۔

میرے دوست بھی اس دن نہ جانے کس ذہنی کیفیت میں تھے کہ انھوں نے دبے لفظوں میں کہا:۔

"میں نے مجبوراً ایک بزرگ کی بات تو مان لی ہے مگر ایک نوجوان کی حیثیت سے میرا دل اسے قبول نہیں کر پا رہا۔"

ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا جائے کہ اتنے غیر سعادت مندانہ بلکہ گستاخ جواب کا کسی عام بزرگ پر کیا ردّ عمل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہ اس "استاد" کی عظمت تھی جو ہر حال میں اپنے چھوٹوں سے صرف شفقت یا محبت ہی نہیں کرتا تھا بلکہ ان کی عزت بھی کرتا تھا، ان کو باوقار اور خوددار بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ قدم قدم پر ان میں خوداعتمادی اور مضبوطی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے میرے دوست کو بڑے والہانہ انداز میں گلے لگا لیا اور کہا:۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا بزرگ ضرور ہوں مگر ایسا بھی نہیں کہ کسی نوجوان کے احساسات کو اپنی بزرگی تلے روند ڈالوں۔ چاہیے، اس وقت تو ان روپیوں سے اپنی فوری ضرورتیں پوری کر لیجیے مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی آپ کے اس قابل قدر جذبے پر اپنے حق بزرگی کو فوقیت نہیں دوں گا۔"

سلیم تمنائی

ذکر ذاکر حسین

زمانۂ طالب علمی میں ایک کہانی "ابو خاں کی بکری" مزے لے لے کر پڑھی تھی اور استاد بنے تو طلبہ و طالبات کو بڑے شوق سے سنائی۔ اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو پڑھنے، سمجھنے اور جاننے کی ابتدا ہوئی۔ اور دیدِ حسین کا موقع یوں نکل آیا کہ ۵۳ء میں یونیسکو کی ایک نشست کے سلسلے میں یو۔ این۔ او۔ کے کئی اراکین، شہر نگاراں میسور میں حاضر تھے اور عقل و دانش کی باتیں کر رہے تھے کہ ایک شام عید کا چاند ہلکے سے مسکرایا۔ دوسرے دن اور نماز عید سے پہلے معزز ارکان یو ین او کو سجے سجائے رنگین خیمے میں کرسیوں پر براجمان دیکھا۔ جب "صفوں کو سیدھی کر دتم نماز کے اول"، کا نعرہ گونجا تمام نمازی صف آرا ہو گئے۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر مجیب صاحبان بھی تھے۔

بزم اردو، مہاراجہ کالج میسور میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو اردو طلبہ، کے ساتھ دیکھا اور سنا بھی۔ میسور یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے اجلاس میں بھی سنا مگر تمنائی کی تمنائی دل ہی دل میں رہ گئی۔ براہ راست کچھ بولنے، سننے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ اصل میں کم عمری آڑے آگئی۔ جھجک نے قدم تھام لیے۔

ہندی پرچار سبھا میسور کا ایک جلسہ شری ناگپا جی سابق صدر شعبۂ ہندی مہاراجہ کالج میسور نے منعقد کیا۔ جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو بلایا۔ قومی زبان ہندی کی جنوبی ہند میں ترقی کی مختصر کہانی سنائی اور کہا کہ مہاراجہ کالج میسور میں اب تک

ھندی پروفیسر کا تقرر نہیں ہوا۔ ذاکر صاحب سے درخواست ہے کہ بہ حیثیت رکنِ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن سفارش فرمائیں۔[1]

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں جو گاگر میں ساگر کی مثل تھی۔ جہاں ہندی زبان کو دلوں سے جوڑنے والی زبان بننے پر زور دیا وہاں اس حقیقت کا بھی ذکر کیا کہ اردو جاننے والے اس میدان میں قدم رکھیں تو وہ ہندی والوں سے آگے نکل جائیں۔

میں نے قدم آگے بڑھا کر مصافحہ کیا تو پوچھا۔ آپ کا شبھ نام؟

راقم نے مسکرا کر نام بتادیا تو فرمایا۔ آپ یہاں کہاں؟

بتایا کہ شری ناگپا جی نے یاد فرمایا تھا

کچھ اردو کا کام بھی یہاں ہورہا ہے؟

میں نے تفصیل بتائی۔ کنڑ اور ہندی کے ذریعے اردو سکھانے کے اپنے طریقے بتلائے۔ بڑا آدمی بچوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ تعلیم بالغان کے ساتھ منظور شدہ ہندی اردو امتحانوں کے مراکز قایم کرنے کی بات بھی بتائی تو خوش ہوئے اور فرمایا۔ جو کچھ آپ یہاں اردو اور ہندی کے پرچار کا کام کر رہے ہیں وہ مفید ہے۔ اس سے پہلے آپ مجھ سے ملے کیوں نہیں۔ اور بچوں سے اتنا گہرا تعلق ہے تو ان کے لیے بھی کچھ ضرور لکھیے۔ "پیام تعلیم" اسی مقصد کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

میں نے ہاں کردی اور سال کے سال پیام تعلیم کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔[2]

ڈاکٹر صاحب سے گہرا تعلق رکھنے والوں میں مرحوم نورالحق جاوید بھی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر مرحوم کے کئی خطوط ان کے نام دیکھے ہیں۔[3] تعلیمی میدان میں جاوید مرحوم نے جب کبھی صاحبِ موصوف سے کسی کی سفارش کی تو وہ سولہ آنے پوری ہوئی۔

ذاکر مرحوم کے بیسیوں خطوط صاحبانِ علم و ادب کے پاس محفوظ ہیں۔ محترمہ فوزیہ بیگم صاحبہ نے خطوط کا گلدستہ "گلہائے صد رنگ" کے نام سے پیش کیا اس میں مولوی

---

[1] بات بنی اور ہندی کے پہلے پروفیسر وہی ہوئے۔

[2] محمد حسن خاں ندوی، مدیر پیام تعلیم بھی میرے محسن رہے۔

[3] مولانا آزاد اور ذاکر حسین کے کئی خطوط جناب راہی فدائی اور نظام الحق عابد فرزند جاوید نے اوراق جاوداں میں پیش کیے ہیں۔

محمد خاں مرحوم اور آمنہ خاتون کے نام لکھے خطوط کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ اس میں ذاکر مرحوم کے دو خط بھی شامل ہی ہیں۔

پروفیسر ایم اے قادر صاحب نے اپنی تالیف 'حنائے علی گڑھ' میں تیرہ خطوط چھاپے ہیں جو موصوف کے نام ہیں۔

راقم نے رسالہ "سب رس" حیدرآباد (مطبوعہ، مورخہ ۱۹۸۸ء مارچ) میں اپنے ایک مضمون بعنوان "محمود خاں محمودؔ بنگلوری اور ان کے کارنامے" میں ایک خط نقل کیا ہے جو دس اپریل ۱۹۳۴ء کا ہے[1]

۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۹ء کے "مخزن" میسور میں دو خطوط ملتے ہیں جو مدیر "مخزن" مہاراجہ کالج میسور کے نام ہیں[2] جو رانچی (بہار) سے لکھے گئے جب کہ آپ گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔

مورخہ ۲؍جنوری ۱۹۶۳ء کو نائب صدر جمہوریۂ ہند، نئی دہلی کا خط مدیر سالنامہ

---

[1] محترمی محمود خاں صاحب! تسلیم۔ میری ذاتی رائے چنداں وقیع نہیں۔ میں ایسا مورخ نہیں ہوں۔ البتہ میسور کی دو اسلامی شخصیتیں یعنی حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے جو دلی تعلق ہے۔ اس کی بنا پر آپ کی کوشش کو بہت مفید اور قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔

ذاکر حسین

[2] (ا) مخزن کا پرچہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ کتب خانے میں بھیج دیا ہے۔ مگر مجھے یاد ہے کہ بہت اچھا تھا اور جس بات سے مجھے خاص خوشی ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ طلبا اس میں علمی و ادبی مسائل پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں اور اس کے صفحات پر آئندہ کے ادیب اور عالم اپنی مشق بہم پہنچاتے ہیں۔ مشہور لکھنے والوں کے مضامین جمع کر لینا بھی اچھا ہوتا ہے لیکن ایک تعلیم گاہ کے رسالے میں اگر طلبہ کو مشق کا موقع ملے تو بہت اچھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آج جو نوجوان مخزن میں لکھتے ہیں وہ چند سال بعد اُردو کے اچھے لکھنے والوں کی صف میں دکھائی دیں گے۔ (۱۹۵۶ء)

(ii) آپ اور آپ کے طلبہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ میسور کے باہر بھی بہت سے لوگ اسے آنکھوں سے لگائیں گے۔ (۱۹۵۹ء)

"فاروق"، یعنی ناچیز کے نام آیا۔

مکرم بندہ۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ فاروقیہ ہائی اسکول میسور کے طلبہ ایک سالنامہ نکال رہے ہیں۔ خدا کرے اچھا نکالیں اور اسے ہر سال بہتر بناتے جائیں۔

والسلام

خیر طلب۔ ۔ ۔ ذاکر حسین

میرے ایک شناسا پڑوسی اور ہم پیشہ کا نام نامی اسم گرامی سید حفیظ الدین صاحب ہے۔ انھوں نے ایک انگریزی کتاب بنام "So. I BECAME A TEACHER" لکھی۔ وہ اس کتاب پر ذاکر مرحوم کی رائے جاننا چاہتے تھے۔ ۱۷ر جون ۱۹۵۹ء کو راج بھون رانچی سے خط کا جواب انگریزی میں دیا۔

عزیزی سید حفیظ الدین

آپ مجھے معاف کیجیے کہ جواب خط میں دیر ہوئی۔ اصل میں سخت بیمار تھا۔ صحت یابی کے بعد تبدیلی کی خاطر نینی تال چلا گیا تھا۔ اب میں اپنے کام پر پلٹ آیا ہوں۔ آپ کا خط نینی تال میں ملا لیکن اب تک کتاب نہ پاسکا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کھو نہ گئی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ پڑھوں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص۔ ذاکر حسین

دوسرا خط بھی انگریزی زبان میں ہی تھا جو ۱۷ر جولائی ۱۹۵۹ء کو تحریر کیا تھا۔

عزیزی مسٹر حفیظ الدین

مورخہ ۲ر جولائی کو آپ کا خط اور کتاب So. I BECAME A TEACHER کا دوسرا نسخہ ملا۔ جب کہ میں نے کتاب کے نہ ملنے کی بات لکھ دی تھی۔ دفتر کے آخری وقت تک لانے اور لے جانے کی وجہ دیر ہوگئی۔ میں نے کتاب پڑھی اور دلچسپ پائی میں خوش ہوں کہ آپ سا با مقصد، ہمدرد و سنجیدہ انسان استاد ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جیسے اور بھی اس مزدوری اور سماجی خدمت کو اپنائیں۔

آپ کی کتاب میری اُس تقریر کی یاد دلا رہی ہے جو میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی تھی جو اسی موضوع پر تھی۔ میں اس کی نقل پانے میں کامیاب ہوا۔ اُسے ٹائپ کرا کے ملفوف کیا ہے۔

آپ کا مخلص
ذاکر حسین

ذاکر حسین مرحوم کو یتیم بچوں سے بھی محبت تھی۔ لفظ یتیم خانہ بھی ناپسند تھا۔ کیونکہ اس کا اثر ان بچوں کے دماغوں پر بُرا پڑتا اور ان کا احساس کمتری کا شکار ہونا تعجب نہ تھا۔ یتیم خانۂ نسواں میسور اور اس کے باپ صفت بزرگ معتمد کیپٹن جمال الدین مرحوم کو ذاکر مرحوم جانتے تھے۔ ادارہ کے لیے ڈیڑھ سو روپے کا فنڈ عنایت فرمایا۔ جس کی اطلاع اے۔ کے۔ مکرجی، انڈر سکریٹری نے پہلے ہی دے دی تھی۔ معتمد ادارے کی جانب سے عزیزہ مومنہ راحت سپروائزر ادارۂ ھٰذا نے شکریہ ادا کیا۔ موصوفہ اسی ادارے کی پروردہ تھیں۔ میسور یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کیا۔ تقسیم اسناد کے اجلاس میں ذاکر حسین مرحوم نے ہی اسناد پانے والے طلبہ وطالبات سے خطاب کیا تھا۔

صاحبِ موصوف کے صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہونے پر عزیزہ مومنہ راحت نے مبارکباد دی تو جواب میں لکھا۔

۱۲/ مئی ۱۹۶۷ء

محترمہ ۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ میرے صدر منتخب ہونے کی خوشی میں آپ نے جس خلوص اور محبت کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں۔ دعا فرمائیں کہ میں اپنے اس منصب کے فرائض کو پوری طرح انجام دے سکوں۔

یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے میسور یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ خدا مبارک کرے۔

والسلام
مخلص ذاکر حسین

یتیم خانۂ نسواں کی لڑکیوں نے آپ سے تصویر کی فرمائش کی تو اپنی دستخط شدہ تصویر بھجوا دی جس کی اطلاع پرسنل اسسٹنٹ جناب ایم اکرم نے مورخہ ۲۹/ فروری

۱۹۶۹ء کو دی تھی۔

محترمہ ۔ تسلیم

آپ کا خط مورخہ ۱۴ر فروری، عالی جناب صدر صاحب، جمہوریۂ ہند کے نام ملا۔ شکریہ اس اطلاع سے کہ مسلم یتیم خانۂ نسواں میسور کی لڑکی فاطمہ بی شاہین سلمہا کا عقد منور بیگ سلمہٗ کے ساتھ ۱۹ر مارچ کو ہونا قرار پایا ہے۔ صاحبِ موصوف جناب صدر صاحب بہت خوش ہوئے اور دعا فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ دلہا دلہن کو خوش اور اچھا رکھے۔ یہ شادی مبارک ہو۔

اطلاعاً عرض ہے — نیاز مند

ایم اکرم

یتیم بچیوں نے کافی خوشیاں منائیں۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ ان سب نے رو رو کر یاد اور محترمہ شاہ جہاں صاحبہ کو بہتے آنسوؤں کے بیچ تعزیت کا خط لکھا۔ محترمہ نے فوراً جواب دیا۔

"میرے شوہر ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال پر آپ نے اپنے تعزیت نامے میں جس ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کے لیے میں اور میرے خاندان کے لوگ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ آپ کی اس ہمدردی سے ہمیں اپنے اس غم کو برداشت کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

غم زدہ

شاہ جہاں بیگم

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد جب بھی جگنو کی طرح چمکتی ہے تو ۲۳ر اگست ۱۹۶۴ء کا دن چودھویں کا چاند بن جاتا ہے۔ آں جہانی داسپا جی (مرکزی وزیر) کرناٹک ہندی پرچار سمیتی بنگلور کے بانیوں میں سے تھے۔ ریاست کرناٹک سے قدم اٹھا۔ بڑھا اور مرکز میں بحیثیت وزیر پہنچا تو دہلی میں نائب صدر جمہوریۂ ہند ذاکر حسین خان سے قریب ہوئے اور تقسیم اسناد کے اجلاس میں تقریر فرمانے کا وعدہ لے لیا۔ رکن مجلس منتظمہ کے ناتے مجھے بنگلور بلایا گیا اور جب ذاکر مرحوم سے سب کا تعارف ہوا تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اور پوچھا آپ یہاں؟

میں نے جواب میں مسکرا کر عرض کیا۔ "کچھ آشائیں لے کر یہاں آیا ہوں"

پھر میں نے بتایا کہ آزادی کے بعد ہندی تعلیمی اداروں میں اردو، اونٹ کے منھ میں زیرہ ہی سہی، تھی۔ جو نکال پھینکی گئی۔ اردو جاننے والوں کو افسوس ہوا۔ انھیں اس سے دور رکھا، ثانوی یا مادری زبان کی حیثیت سے ایک علاحدہ امتحانی پرچہ اختیاری تھا جو انگریزی، کنڑ، اور سنسکرت زبانوں تک محدود تھا۔ کنڑ کے سوا دوسری دونوں زبانیں مادری زبان کے ضمن میں نہیں آتی تھیں البتہ ایک محدود اینگلو انڈین طبقے کی مادری زبان انگریزی رہی۔ راقم کی درخواست یہ تھی کہ ان تینوں زبانوں کے ساتھ اردو، مرہٹی، تمل، تلگو اور ملیالم بھی ہو۔ ترجمے میں بھی یہ زبانیں در آئیں۔

نائب صدر آں جہانی چھوٹو بھائی دلیسائی اور سکریٹری سری لواس مورتی نے اس اہمیت کو جانا اور اس طرح امیدواروں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔

جہاں آپ ہوں وہاں اردو اور ہندی، ماں جائی بہنیں ضرور رہیں گی۔ ڈاکر صاحب نے فرمایا۔ دوسری زبانوں کا بھی ساتھ رہے گا۔

جنوبی ہند کی ساری زبانیں سکھی سہیلیاں رہیں گی" میں نے کہا" ہندی سے ڈر کی بات دور ہوگی۔

ڈاکٹر ذاکر مرحوم نے خطبۂ صدارت اردو رسم الخط میں لکھا تھا۔ یہاں وہاں ہندی کے الفاظ اردو رسم الخط ہی میں لکھ دیئے تھے۔ میں نے درخواست کی کہ یہ تقریر میرے اپنے کتب خانے کی زینت بن جائے۔ اگر آپ مرحمت فرمائیں۔

"ہاں میں نے آپ کے کتب خانے کی تعریف یو پی کے اکثر اساتذہ سے سُنی ہے"[1] ذاکر مرحوم نے فرمایا۔ بھئی اصل مسودہ میرے پاس ہونا چاہیئے۔ اخباری نامہ نگاروں سے کبھی کبھی اصل عبارت درج کرنے میں بھول ہو جاتی ہے۔ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے، اصل مسودے کا پاس ہونا ضروری ہے۔

زیراکس کی سہولت نہ تھی۔ نقل کی اجازت مل گئی۔ یہ نقل سمیتی والوں نے مجھ سے مانگ لی۔ ہندی رسم خط میں یہ تقریر چھپی۔ اب آپ کی صالح نظر کی نذر ہے۔

---

[1] سید احتشام حسین رضوی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ سید محمد ٹونکی، خواجہ احمد فاروقی، وغیرہ نے اس غریب کی کٹیا میں قدم رکھنے کا کرم کیا تھا۔

خطبۂ صدارت

دوستو! میں دل سے آپ سب کا اور خاص طور سے اپنے دوست شری داسپاجی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میسور ریاست ہندی پرچار سمیتی کے اس جلسے میں مجھے یاد کیا ہے۔

آپ نے ریاست میسور میں ہندی کی جانکاری بڑھا کر ملک کی الگ الگ زبانوں کے بولنے والوں کو جوڑنے کی کڑی بنانے میں جو کام کیا ہے، اس کا حال سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ کام ہماری قومی زندگی کے لیے بڑی اہمیت کا کام ہے۔ خاصہ مشکل کام ہے۔ آپ کی ہندی پرچار سمیتی جس لگن سے اس کام کو کر رہی ہے۔ اس پر میں دل سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

ہمارا ملک ایک نرالا ملک ہے بڑا وسیع ملک ہے۔ مختلف زبانیں بولنے والے مختلف عقیدوں، مذہبوں کو ماننے والے، الگ الگ رنگ کے کھانے، کھانے والے، الگ الگ رنگ کے کپڑے پہننے والے، اس میں بستے ہیں۔ ملک کی حکومت عوامی ہے جمہوریت ہے، اسی میں سب کام، سب کے میل جول اور مدد ہی سے ہو سکتے ہیں۔ اس میل جول کے لیے اپنی سمجھانے اور دوسرے کی سمجھنے کے لیے ایک زبان کا ہونا بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اب تک ملک کے الگ الگ حصوں میں کام کاج اور عمل دخل اور سرکاری کام کے لیے پہلے فارسی اور پھر انگریزی سے کام لیا جاتا تھا مگر اس وقت پڑھے لکھے لوگ گنتی کے ہوتے تھے۔ اب ملک کے ہر بچے اور بچی کو تعلیم دینے کا انتظام ہو رہا ہے۔ سارا ملک لکھا پڑھا ملک ہو جائے گا۔ یہ بچوں کی تعلیم اپنی اپنی مادری زبان میں ہی ہو سکتی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کے کام کے سبب کروڑوں کے سر پر ایک غیر ملکی زبان کا بوجھ سر پر تو نہیں رکھا جا سکتا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیئے مگر بچوں کی تعلیم اپنی اپنی زبان میں ہوئی تو اتنا بڑا لکھا پڑھا ملک جڑا کیسے رہے گا؟ الگ الگ ہو کر بکھر جائے گا۔ اس لیے ان الگ الگ ٹکڑوں کو ملانے کے لیے ایک زبان سب کو سکھانی ضروری ہے اور ہمارے دستور نے ہندی کو دیوناگری رسم خط میں اس کام کے لیے چنا ہے۔ یہ ہمارا قومی فیصلہ ہے اور سب ہی نے اسے منظور کیا ہے۔ اس

لیے اب سب کی مدد سے سب کو ہندی سکھانے کی کوشش کرنا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کی ہندی پرچار سمیتی نے اس کام میں بہت کچھ ہاتھ بٹایا ہے۔ مگر اس بڑے کام میں کچھ بھولیں ہو سکتی ہیں۔ ان کی طرف دھیان دلاتے رہنا اور دھیان کرتے رہنا ضروری ہے۔

ایک بات جو کبھی بھی بھولنی نہیں چاہیئے، یہ ہے کہ ہندی ملک کو جوڑنے کے لیے چنی گئی ہے توڑنے کے لیے نہیں۔ یہ کسی کو گرانے کے لیے کھڑی نہیں کی گئی ہے۔ یہ مادری زبان کی مخالف نہیں ہے۔ ان کی پریمی ہے۔ ان کو مدد دینے والی ہے۔ یہ تو ان خزانوں سے اپنی جھولی بھرنے کا ارمان رکھتی ہے، یہ ان کا برا کیسے چاہ سکتی ہے؟ دوسری زبانوں کو اس کے سرکاری زبان ہونے پر ڈر ہو اور وہ بھول میں یہ سمجھیں کہ ان کو ہٹانے، مٹانے گھٹانے کے لیے نکلی ہے تو ہندی کا کام ہے کہ اپنے پیار بھرے برتاؤ سے اس ڈر کو دور کرے۔ خالی یہی نہیں کہنا چاہیئے کہ دستور میں ایسا حکم ہو چکا ہے۔ اسی لیے ماننا ہی ہوگا بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ بات دستور میں رکھی ہی اس لیے گئی ہے کہ اس میں سب کا فائدہ ہے۔ عوامی حکومت میں باتیں ڈرانے، دھمکانے سے طے نہیں ہوتیں۔ پریم اور محبت سے سمجھنے اور سمجھانے سے ہوتی ہیں۔ ہندی کا کام ہے کہ سب شک وشبہ کرنے والوں کے شبہے دور کرے۔ انھیں یقین دلائے کہ ایک زبان سب کو سکھانے کا کام اس لیے اٹھایا نہیں گیا ہے کہ سارے ملک میں بس ایک ہی زبان رہ جائے۔ بلکہ اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ ان کو جوڑنے کا انتظام کرکے ان میں ترقی اور وسعت کے راستے پر تیز تیز چلنے کے لیے ابھارا جائے۔

ہندی تو وہ جوڑنے والا دھاگہ بننا چاہتی ہے جس میں ملک کی ساری زبانوں کے پھول گوندکر ایک خوبصورت پھول مالا بن جائے۔ ہندوستانی اپنی الگ الگ زبانوں کے ساتھ ساتھ الگ الگ پھولوں کا ایک باغ ہو۔ سارے بسنے والوں کے لیے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہو۔ ہندی یہ نہیں چاہتی کہ ان رنگ برنگے پھولوں کے تختوں کو کھود پھینکے اور ایک سرے سے ہی ہل چلاکر باغ کو ادھر سے ادھر تک بس ایک کھیت بنائے۔ چاہے وہ گیہوں یا چاول ہی کا کھیت کیوں نہ سہی۔ ہندی کی جیت ہندی کی ترقی اس میں ہے کہ زبان کے بارے میں ملک کی رنگا رنگی کو ماننے اور ہر زبان بولنے

والے کو اس کا یقین دلائے کہ وہ یہی چاہتی ہے۔ وہ مقامی صوبائی زبانوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہے۔ ان کی ساتھی ہے۔ ان کو اہمیت دینا چاہتی ہے۔

دوسری بات جو میری سمجھ میں ہندی کے کام کرنے والوں کو یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ زبان کو جان کر بوجھل اور کٹھن نہیں بنانا چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں مشکلیں ہیں۔ زبان کے ادب کو کوئی ڈگر بتانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو زبان ادیب کو، شاعر کو اپنے خیالات ڈھالنے کے لیے اچھی لگتی ہے وہ اس کا استعمال کرتا ہے۔ اسے کون بتائے کہ ایسے لکھو اور ایسے نہ لکھو اور کیوں بتائے اور وہ کیوں کسی کے بتانے والے کو سنے۔ یہ بات سچ ہے مگر لکھنے والے بھی تو سمجھ والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ذرا بھی دھیان دیں تو شاید ہمیشہ نہیں تو بہتیرے بار تو ان کی سمجھ میں بھی آئے تا کہ اگر زبان بہت کٹھن ہو، بوجھل ہو، رائج بولی سے بہت دور ہو تو اس کے سمجھنے والے اور پڑھنے والے کم ہوں گے۔ ان ادیبوں اور شاعروں کا جی بھی تو چاہتا ہوگا کہ ان کے خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچیں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روشنی دیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں کو گرمائیں۔ کبھی کبھی ضرور یہ ہوگا کہ لکھنے والا اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو لکھے گا، اپنے دل کو بہلانے کے لیے، تھوڑی دیر کو دوسروں کو پڑھنے اور سننے والوں کو بھول جائے گا۔ ایسے حال میں اسے ایک ڈھب سے لکھنا چاہیئے۔ جو اس کے اپنے دل کو بھائے۔ چاہے وہ کسی کے دل کو بوجھل لگے چاہے ہلکا، چاہے آسان لگے چاہے مشکل، پر جب آپ ایک زبان کے چلن کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ جب آپ ان لوگوں میں اسے رائج کرنا چاہتے ہیں جو دوسری زبانیں بولتے ہیں۔ جب آپ اسے خالی عالموں کی زبان نہ بنا کر عوام کی زبان بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جب کروڑوں لوگوں کو اس کے ذریعے سے بولنے، سننے، سمجھنے سمجھانے کا کام لینا چاہتے ہیں تو پھر زبان کو آسان رکھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ عالموں اور پنڈتوں کی زبان کبھی لوگوں کی زبان نہیں بن پائی ہے۔ آپ بنا بھی دیں کسی ڈھب سے تو لوگ بدل لیں گے۔ وقت لگے گا۔ دو تین سو سال کا کام اکارت جائے گا۔ پھر لوگ ضرور اسے آسان بنالیں گے اور آسان بنانے میں اسے بہت کچھ بدل بھی دیں گے۔

تیسری بات جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے ہندی سیکھی ہے تو ہندی اردو کے جھگڑے ختم کرائیے۔ یہ جھگڑا ملک کے بٹوارے سے پہلے کے سیاسی عناصر کا دُم چھلا ہے۔ ملک کی کوئی زبان ہندی سے اتنی نزدیک نہیں ہے جتنی اردو۔ یہ کوئی غیر ملکی زبان نہیں ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں بنی پھلی پھولی ہے۔ جس کا ڈھانچہ ہندی ہے۔ اس میں بیسیوں آوازیں ایسی ہیں جنھیں ایران اور عرب سے کوئی ناتہ نہیں۔ یہ خالی مسلمانوں کی زبان بھی نہیں جب کہ ہندو ادیبوں اور شاعروں کا ایک لشکر کا لشکر ہے جس نے اس کی خدمت کی ہے اور اسے پروان چڑھایا ہے اور اگر یہ مسلمانوں کی زبان ہوتی بھی تو کیا کوئی مسلمان ہندوستانیوں کو ہندوستانی نہ سمجھ کر اچھا ہندوستانی رہ سکتا ہے؟ نہیں یہ ہندوستان کی اپنی لاڈلی ہے۔ یہیں جنم لیا ہے۔ یہیں بڑھی ہے اور یہیں پھلے پھولے گی۔ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو کو بہت کچھ مل سکتا ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ آپ اس لین دین میں مدد دیں گے۔

بس آخر میں ایک چوتھی بات اور کہنی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے ہندی سے ملک کی الگ الگ زبانیں بولنے والوں کو جوڑنے کا سامان بھی کر لیا۔ اردو، ہندی میں لین دین کا ڈھنگ بھی ڈال دیا۔ زبان کو عوامی زبان ہونے کے ناتے آسان بھی بنا لیا۔ تب بھی سوال رہتا ہے کہ اس زبان کے ذریعے سے کیسے خیالات زبان میں رائج ہوں گے۔ ادیب اور شاعر کو یہ بات بھی کوئی کیسے بتا سکتا ہے؟ مگر ادیب اور شاعر بھی تو سماج کے چاکر ہوتے ہیں۔ سماج کی خدمت کی دُھن ان میں ہوتی ہے۔ اس لیے سماج کے سامنے جو خیالات ہوتے ہیں وہ بھی انھیں اپناتے ہی ہیں۔

ہمارا سماج خود مختاری حکومت پانے اور آزاد ہو جانے کے بعد سے اس دھن میں لگا ہے کہ ایک نیک اور مہذب سماج بنے۔ ایسا سماج جس میں سب ہی سکھ چین سے رہ سکیں۔

ہم سے بھول ہوتی ہے۔ ہم ٹھوکر کھاتے ہیں مگر آدرش یہی ہمارے سامنے ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اچھا سماج کیسے بنے؟ دیکھیے۔ آدمی کو اس کی جنت سے دو چیزوں نے باہر نکالا ہے۔ ایک اس کی اپنی بڑھتی ہوئی تعداد نے۔ ایک نیچر کی کنجوسی نے۔ پہلے نے آدمی سے گھر کی آزادی چھینی، ساتھیوں کی کھینچا کھینچ ... ہے۔

کندھے سے کندھا رگڑتا ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اور آدمی امنڈتے ہوئے سماج کے بندھنوں میں جکڑ جاتا ہے۔

دوسرے نے یعنی قدرت کی کنجوسی نے اس سے وقت کی آزادی چھینی۔ سارا وقت پیٹ کا حساب چکانے میں بیتنے لگا۔ جیسے جانے میں یہی ساری توانائیاں کھپنے لگیں۔ گھٹنوں سر کا پسینہ بہانا، تب دو نوالے کھانا، سر چھپانا اور بدن ڈھانپنا، آدمی قدرت کے بندھنوں میں جکڑ گیا۔

آدمی کی تاریخ یوں کہو، اس کی ان کوششوں کی کہانی ہے جو اس نے ان بندھنوں کو ڈھیلا کرنے کے لیے برابر کی ہیں۔ جس نے انسانی ذات کو الگ الگ راستے بتائے اور اس پر چل کر دکھایا۔

یہ راستے چھوٹے چھوٹے تو بہتیرے ہوں گے، پر چار راستے چوڑے چوڑے ہیں۔ پہلا راستہ تو ہے ریل پیل سے، ادھر سے نکلتا جہاں بھیڑ ذرا کم ہو۔ ادلے بادلے سے وہاں نکل چلنا جہاں سورج زندگی بتانے کو ذرا آسان بنا دے۔ یہ ہے ہجرت اور مادرِ وطن کو تیاگ کر پیچھے جانے کا راستہ۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس ریل پیل میں دوسروں کو دباؤ، انھیں اپنا کرچا کر بناؤ۔ ان سے کام لو، انھیں کم دو، آپ زیادہ لو۔ یہ ہے بے لگام طاقت کا راستہ اوروں کے کندھوں پر اونچا ہو کر اوپر جانے کا۔ اندر سے اپنے کو ٹھیک کرتے کا راستہ۔

چوتھا راستہ ہے قدرت کو قابو میں لانے کا، اس پر قبضہ پانے کا۔ یہ ہے سائنس اور کام دھندے کا۔ آگے بڑھنے کا راستہ۔

پہلا راستہ یوں سمجھو بند ہے۔ زمین انسان سے بھرتی جاتی ہے۔ سب اچھی جگہیں گھر گئی ہیں۔ کوئی گھر چھوڑ کر جائے تو کہاں جائے اور بھر جائیں تو کتنے جائیں؟

دوسرے راستے پر طاقت والے تاریخ میں برابر چلتے رہے ہیں۔ بس چلے تو اب بھی چلیں گے مگر سچ یہ ہے کہ انسان نے کبھی اسے اچھا نہیں جانا ہے۔ دب گیا ہے تو سہہ لیا ہے۔ ڈھب لگا ہے تو اوپر والوں کو نیچے گرا دیا ہے۔ انسانی ذات اس سے اکتا گئی ہے۔ اسے بھی قیدی جاننا چاہیئے۔

اب رہ گئے بس دو راستے۔ ایک جو اندر کو جاتا ہے۔ ایک جو باہر کو جاتا ہے۔
ایک جو اپنی تکمیل کرتا ہے دوسرا جو قدرت کو زیر کرتا ہے اور سچ یہ ہے کہ ان
میں سے ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے۔ نیک برتاؤ، نیک چلن، سائنس
اور کام دھندے بہنیں بہنیں ہیں۔ ایک سے قدرت کی جسمانی طاقتیں قابو میں
آتی ہیں جو ہمارے اندر ہیں۔ دوسرے سے وہ جو ہمارے ارد گرد ہیں۔ اچھے
برتاؤ، نیک چلن، دل کے سہن سے، رضامندی سے، خوشی سے، امن اور شانتی
اور محبت سے آدمی کو آدمی بناتا ہے۔ کوشش آدمی کو آدمی بنانا چاہتی ہے۔ پر
بہت سی محنت سے سوجھ بوجھ سے عملی طاقت سے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک
کا فرض یہ ہے کہ ہم ان دونوں کو سموئیں۔ ہمیں عدم تشدد اور سائنس کو ملانا ہوگا۔
پورب اور پچھم کی اچھائیوں کو اکٹھا کرنا ہوگا۔ اندر کی طرف جاتے والے، آگے کو بڑھنے
والے راستوں کا سنگم ڈھونڈنا ہوگا۔ یہ ہم سب کو اپنی اپنی زندگی میں بھی کرنا ہوگا۔
اور زبان کے ذریعے ان خیالات کو اپنی ساری قوم میں بھی پھیلانا ہوگا۔

آپ نے جو یہاں ہندی زبان سیکھی ہے، اُس میں اپنی اپنی زبانوں کے
خیالات آپ پہچانیں گے۔ ہندی زبان میں جو خیالات ملیں گے، انھیں اپنی زبان
میں لائیں گے۔ کیسا اچھا ہو کہ دونوں طرف سے ایسا لین دین ہو کہ ہماری روحانی
طاقت بھی بڑھے اور ہماری اقتصادی طاقت بھی بڑھے۔ کیسا سکھی ہوگا ہمارا ملک۔
اگر ہماری ساری بھاشاؤں میں اور سب کو جوڑنے والی زبان ہندی، ہمیں اچھا
اور نیک بننے میں مدد دے اور ہمیں قدرت پر قابو پانے کی طاقت بھی عطا کرے
مجھے پوری امید ہے کہ آپ کے ہاتھوں یہ کام ہوگا۔ آپ سب کو ایک اچھا کام پورا
کرنے پر دل سے بدھائی دیتا ہوں۔

جے ہند

ذاکر حسین

اچھا استاد

آدمی کی زندگی ہمیشہ کسی دوسری زندگی سے وابستہ ہوتی ہے، اس کی ذہنی زندگی کا چراغ ہمیشہ کسی دوسری ذہنی زندگی سے روشن ہوتا ہے۔ زندگی کی لہلہاتی باڑی میں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، اور یوں ہر انسان کسی دوسرے کا استاد سکھانے والا بتانے والا اور بنانے والا ہوتا ہے۔ استاد کے معنیٰ کو اتنا بڑھا دیں تو بات بہت پھیل جائے گی۔ ہم تو یہاں صرف ان لوگوں سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو جان بوجھ کر سکھانے پڑھانے والے کا کام اختیار کرتے اور اسے عملی طور پر انجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس کام کو اختیار کرتے ہیں اس لیے کہ ان کی طبیعت کا رجحان ادھر ہوتا ہے۔ طبیعت کا رجحان ایک قدرتی چیز ہے، خود بخود کسی طرف کو جھکی ہوتی ہے، اس قسم کے کام کو جی چاہتا ہے اسی میں جی سکھ پاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی طبیعت کا جھکاؤ خود اپنی ذات کی طرف ہوتا ہے، ان میں قوت کی آرزو، کمائی کا لپکا، جمع کر کر کے ڈھیری لگانے کی لت، لالچ، ہوس، اوروں سے منوانے کی چاہ ہوتی ہے۔ بعض طبیعتوں کا جھکاؤ اپنی طرف نہیں، اوروں کی طرف ہوتا ہے۔ ان میں ہمدردی، ہمدمی، میل ملاپ، فیاضی دوسروں کو سہارا دینے اور مدد پہنچانے کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔ کسی کو ہر چیز کا کھوج لگانے اور ہر بات کی تہہ کو پہنچنے کی دھن ہوتی ہے۔ کوئی دنیا کو بنانے والے اور پالن ہار کے دھیان میں سرشار ہے، اپنے کو اس کے بڑے وجود میں ملا دینے، جدائی کو ختم کر کے وصل پیدا کرنے اور نجات حاصل کرنے کی لگن لگی ہے۔ کوئی چیزیں بناتا، بگاڑتا اور نئی نئی ایجادوں میں اپنے دل

کو تسلی دیتا ہے۔

آدمیوں کی اس بھیڑ میں معلّم کو کہاں ڈھونڈیں اور ان بھانت بھانت کی شخصیتوں میں اچھے اُستاد کو کہاں سے پکڑ نکالیں؟ اس سوال کے جواب میں اس بات سے مدد ملے گی کہ ہم یہ دیکھیں کہ جس کام کو آدمی کرنا چاہتا ہے، جن قدروں کا وہ حامل ہے جن خوبیوں کا وہ سیوک ہے یا بننا چاہتا ہے، وہ کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔ بعض خوبیاں صرف چیزوں میں آکر پوری ہوتی ہیں۔ بعض خوبیاں چیزوں اور آدمیوں دونوں میں اپنا کمال دکھاتی ہیں، مثلاً حسن کی خوبی چیزوں میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے، اور انسانوں میں بھی، صورت میں بھی اپنا جمال دکھاتی ہے اور سیرت میں بھی۔ بعض خوبیاں ایسی ہوتی ہیں کہ صرف آدمیوں میں تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں، جیسے اخلاقی اور مذہبی خوبیاں۔ اب جو شخص ایسی خوبیوں کا سیوک بنے جو صرف آدمیوں میں تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں تو وہ خود بخود یا تو اپنی ذات پر دھیان دے گا یا اوروں کی طرف توجہ کرے گا۔ ان میں سے جس کا دھیان اپنے پر جم جائے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسروں پر بھی دھیان دے۔ بے گنتی مذہبی لوگ ساری ساری عمر ایک اپنی ہی زندگی کے سنوارنے میں کھپا دیتے ہیں۔ ایک اپنی نجات کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور بعضے تو ترکٹی جا کر اپنی ناک کی چونچ کا مشاہدہ کرتے کرتے ساری عمر ختم کر دیتے ہیں مگر جو کسی خوبی کو دوسرے آدمیوں تک پہنچانا چاہتا ہے اسے اپنے سدھار پر بھی کچھ نہ کچھ دھیان کرنا ہوتا ہے۔ جو کسی کو کچھ سکھانا چاہتا ہے اسے خود بھی سیکھنا ہوتا ہے، جو کسی کو کچھ بنانا چاہتا ہے اسے خود بھی کچھ بننا ہوتا ہے ایسے آدمی کی ذہنی بناوٹ میں دو باتیں، ہمدردی اور دوسروں سے میل ملاپ کی خواہش پہلے دن سے ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ لوگ، یوں کہیئے کہ، جماعتی اور سماجی آدمی ہوتے ہیں۔

استاد بھی اسی قسم کا سماجی آدمی ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر جماعتی آدمی استاد نہیں ہوتا مگر ہر اچھا استاد ضرور اسی سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ جماعتی آدمی ہونا، دوسرے آدمیوں کی زندگیوں میں ان خوبیوں کا خواہاں ہونا جن کا یہ آپ سیوک ہے، اوروں کو کچھ بنانے کا شوق اور اس کے لیے خود کچھ بننے یا ہونے کی ضرورت، یہ اچھے استاد کے ذہن کی بناوٹ کا تانا بانا ہے۔ بازار میں اس سے ملتا جلتا نقلی مال بھی بہت ملتا ہے۔ مگر اس

سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے ایسے استاد بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت دوسرے آدمیوں کی طرف ذرا نہیں جھکتی انھیں کسی خاص خوبی سے بھی کوئی دلی لگاؤ نہیں ہوتا۔ انھیں بس اپنا پیٹ پالنا ہوتا ہے دوسروں کو کچھ ہنر سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ دکان لگاتے ہیں، لوگ دام دیتے ہیں، یہ ہنر بیچتے ہیں۔ غلہ بیچ کر نہ کمایا، زراعت کی دو کتابیں لکھ کر کمایا۔ اسی استاد کے روپ میں اور لوگ بھی ہوتے ہیں اکثر استادوں کے بھیس میں ایسے کاری گر ہوتے ہیں جن کی ساری عمر کی کوشش سے کچھ جھوٹے ریاکار، جو دیکھنے میں تو بہت اچھے مذہبی اور اخلاقی لوگ ہیں، پیدا ہوتے ہیں، مگر ان کے نیک عمل کی جڑیں ان کے دل تک نہیں پہنچیں ۔ یہ لوگ جھوٹے مال پر اپنے کارخانے کا ٹھپا لگادینا کافی سمجھتے ہیں اور اصل دھات کو بدلنے کی جگہ ملمع کردینے پر راضی رہتے ہیں۔

سچے استاد کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں سے محبت رکھتا ہو اس کے دل میں آدمیوں سے بحیثیت آدمی پیار ہو۔ آپ ان سچے معلموں، اچھے استادوں پر نظر ڈالیے تو ان میں بہت سے گہرے مذہبی لوگ نظر آئیں گے حسن وجمال کے دلدادہ آرٹسٹ بھی ان کی صف میں ملیں گے، لیکن یہ صفتیں ان کی ذہنی بناوٹ میں بیل بوٹے ہیں تانا بانا وہی، خدمت کا شوق اور بنی نوع کی محبت ہے۔

استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا ہے "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں، ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے یہ اس میں مدد دیتا ہے، اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔

اچھے استاد کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کی طبیعت کا میلان آپ ہی آپ بچوں اور نوجوانوں کی بنتی ہوئی شخصیتوں کی طرف ہوتا ہے۔ ان ہی میں رہ کر اسے راحت ملتی ہے، ان کے بغیر دنیا میں پردیسی کی طرح بھٹکتا ہے یہ بس مدرسے کی جماعت ہی میں استاد نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت اس کا دل اپنے شاگردوں میں ہی اٹکا ہوتا ہے۔ استاد کی اس محبت کی تشریح بہت مشکل ہے ممکن ہے اس میں

اور بہت سے سادہ جذبات کی آمیزش ہوتی ہو، ممکن ہے اپنے کو منوانے کی خواہش بھی اس کے دل میں کام کرتی ہو، ممکن ہے بچّوں کا دل ہاتھ میں لینے، اپنے لیے ان کی محبت اور اطاعت حاصل کرنے کی آرزو بھی اس میں ملی ہوتی ہو، یعنی تھوڑی سی خودغرضی بھی۔ ہاں کیوں نہیں، ضرور یہ بھی ہوتا ہوگا اور اگر میل زیادہ ہو جائے تو اصلی جوہر کی خوبیاں ممکن ہے کہ دب جائیں، مگر غور سے دیکھیے تو اچھے استاد کے سارے کام میں ایسے مول تول اور حساب کتاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا ہے۔ اچھا استاد اپنے بہت سے کاموں کو بچّوں ہی کی طرح قدرتی طور پر زیادہ سوچے بغیر ہی کر گزرتا ہے۔ جو کام اپنا مقصد آپ ہوتے ہیں اور اپنے سے باہر کوئی غرض نہیں رکھتے انھیں کھیل کہتے ہیں۔ ہاں تو استاد کا کام بہت کچھ تو کھیل ہی کھیل میں انجام پا جاتا ہے۔ اس کا کام اکثر اپنا انعام آپ ہوتا ہے۔ دنیا داروں، ناپ تول کرنے والوں کی نظر میں یہ حماقت ہو تو بے شک اچھا استاد اس حماقت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یورپ کے ایک مشہور استاد پستالوزی نے ایک جگہ اپنا اور ایک حسابی کتابی دنیادار کا مکالمہ خوب لکھا ہے۔ پستالوزی نے کہا "میں تو اپنی زندگی میں ہمیشہ کچھ بچّہ ہی سا رہا، شاید یہی بات تھی کہ لوگ ہزاروں رنگ سے مجھ سے کھیلتے رہے" عقل مند دنیادار بولا "اگر آپ کا حال یہ ہے تو اچھا ہو کہ آپ کسی کونے میں جا کر بیٹھ رہیں، اپنی حماقتوں پر شرمائیں اور بس چپ رہیں۔" جواب ملا "جی ہاں شاید آپ کا خیال درست ہو" دنیادار بھلا کب چپ ہونے والا تھا، بولا "تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟" پستالوزی نے کہا "جی ہاں ایسا بھی کر چکا ہوں۔ لیکن کیا کروں، اب بھی کچھ ایسے آدمی پڑے ہیں جن سے لوگ اسی طرح کھیلتے ہیں جیسے مجھ سے کھیلتے تھے کبھی کبھی ان سے کچھ کھیلنے کو جی چاہتا ہے" دنیادار بزرگ اس سادگی کی تاب نہ لا سکے اور بے تکلف ہو کے بولے "یار، تم اب تک بس ننھے بچّے ہی ہو" تو پستالوزی کیا اچھا جواب دیتا ہے، جس میں اچھے معلّم کی روح جھلکتی ہے، "جی ہاں، بچّہ ہی ہوں اور مرتے دم تک بچّہ رہنا چاہتا ہوں تمھیں کیا بتاؤں، دل کو اس میں کیسی راحت ملتی ہے کہ آدمی ذرا ذرا بچّہ بھی ہو یقین کر سکے، بھروسہ کر سکے، محبت کر سکے، غلطی ہو جائے، بھول چوک ہو، حماقت ہو تو ان سے لوٹ آئے اور آپ کے سارے عقل مند لفنگوں سے زیادہ بھولا، زیادہ اچھا اور آخر میں چل کر زیادہ عقل مند بھی نکلے۔ جناب عالی، اس کے خلاف بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا، مگر پھر بھی اس میں بڑا مزا ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے

سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے، روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گم راہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔

یہ قول ایک اچھے استاد ہی کا ہو سکتا تھا۔ عقل مند لوگ اسے حماقت جانیں تو اچھا حماقت ہی سہی، اور اسے بچپن بتائیں تو بے شک بچپن ہے اور جب تک استاد میں یہ بچپن ہے وہ بچوں کے دل کے راز جانتا ہے اور ان کی زندگی میں برابر کا شریک ہو کر ان کو بلندی کی طرف لے جا سکتا ہے جس استاد میں یہ بچپن نہیں ہوتا وہ بچوں کے دل کی بولی نہیں سمجھتا، نہ انھیں اپنی سمجھا سکتا ہے۔ نادانی سے جدھر قدم اٹھاتا ہے تو کچھ نہ کچھ کچل ڈالتا ہے، کچھ نہ کچھ توڑ ڈالتا ہے جس استاد میں علمی تحقیق کا انہماک یا غور و خوض کی زیادتی ہو وہ اس کے بچپن کو کم کر دیتے ہیں، وہ پہلے سے بہتر عالم ہو جاتا ہو یا وہ چیز جسے "ماہرِ تعلیم" کہتے ہیں۔ پر استاد وہ پہلے سے بُرا ہوتا ہے۔

ہاں، میں نے استاد کی جو یہ پہلی پہچان بتائی کہ اسے بچوں اور نوجوانوں سے قدرتی لگاؤ اور انس ہو اور وہ بچوں میں بچہ بن سکے تو یہ ہے تو پہلی اور ضروری چیز مگر صرف یہی کافی نہیں۔ ہر اچھے استاد میں اس کا ہونا ضروری ہے، پر ہر وہ شخص جس میں یہ ہو اچھا استاد نہیں ہوتا۔ محبت کے اس میلان کو ایک خاص طریقے سے کام میں لانے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ یہ صلاحیت مشق اور محنت سے بڑھ سکتی ہے مگر ہوتی یہ بھی قدرتی ہے اور خداداد۔ اسے بہتیرے علوم سے مدد بھی ملتی ہے۔ تعلیمات اور نفسیات کے اصول جاننے سے بھی کام نکلتا ہے، مگر اصل بات یہ ہے کہ اچھے استاد میں بچوں کی شخصیت کو سمجھنے کی قدرتی صلاحیت ہونی چاہیے۔ جب کوئی کسی بڑھتی ہوئی، بدلتی ہوئی زندہ چیز پر اثر ڈالنا چاہے جیسے کہ استاد چاہتا ہے، تو اس چیز کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ اچھے استاد میں وہ صفت ہونی چاہیے جو اچھے ڈراما لکھنے والے، اچھے ناول نگار، اچھے مورخ میں ہوتی ہے۔ کہ وہ ایک چھوٹے سے واقعے سے، ایک ذرا سی بات سے، ایک معمولی سی حرکت سے، چہرے کے رنگ سے، آنکھوں سے، تیور سے، غرض اظہار کے معمولی سے طریقے سے پورے آدمی کی کیفیت کا پتہ لگا لیتے ہیں نفسیات کے عام قاعدے یہاں آکر دھوکا دیتے ہیں اور حجاب بن جاتے ہیں۔ کوئی قدرتی وجدانی قوت ہوتی

ہے جو ان ننھے ننھے دریچوں سے جھانک کر روح کی چھپی ہوئی کیفیتوں کو دیکھ لیتی اور سمجھ لیتی ہے۔ اچھے استاد کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اس میں یہ وجدان ہو اور احساس کی یہ تیزی مگر سمجھ لینا اور جان لینا بھی تو کافی نہیں، سمجھ کر، جان کر، صحیح طور سے اثر ڈالنے کی صلاحیت بھی تو ہونی چاہیے۔ تشخیص کے بغیر علاج نہیں ہوتا، لیکن کسی کو خالی تشخیص آتی ہو اور علاج نہ آتا ہو تو وہ بھی تو شفا نہیں بخش سکتا۔ استاد کی طبیعت بہت حاضر ہونی چاہیے کہ معاملے کو سمجھتے ہی تقریباً بلا غور کیے صحیح تدبیر اس کی سمجھ میں آجائے کتابیں پڑھ کر بچوں پر اثر ڈالنے والے غور ہی کرتے رہتے ہیں اور معاملے اور اس کی تدبیر کے بے شمار کتابی امکانات کے گورکھ دھندے میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں اور اچھا استاد اپنے فطری ٹیکٹ سے صحیح تدبیر کر گزرتا ہے۔ کبھی ہنس کر، کبھی خفا ہو کر، کبھی تعریف کر کے، کبھی نرم سی ملامت سے، کبھی اکسا کر، کبھی ذرا روک کر، کبھی اپنی طرف کھینچ کر، کبھی اپنے سے دور کر کے، کبھی نکتہ چینی سے اور کبھی چشم پوشی سے یہ اپنا کام کر لیتا ہے۔ ان سب موقعوں کے لیے کتابوں میں ہدایتیں درج ہوں۔ اس لیے کہ کتابوں میں تو اب سب کچھ درج ہے۔ پر جس وقت کام پڑتا ہے تو "لال کتاب" کے دیکھنے کا موقع نہیں ہوتا اور اگر اس کی کوئی عام ہدایت یاد بھی ہو تو اس عام قاعدے کو اس خاص معاملے پر لگانا بھی جب ہی ممکن ہوتا ہے جب کہ استاد میں یہ قدرتی "ٹیکٹ" موجود ہو۔

مصلحوں اور پیغمبروں کی طرح استاد کو بنی بنائی شخصیتوں سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ ان سے سروکار ہوتا ہے جو ابھی بن رہی ہیں۔ مصلح اور پیغمبر تو بنی ہوئی شخصیتوں سے اپنا کام لے لیتے ہیں۔ انھیں ان عقیدوں، رسموں، اداروں اور خیالوں کا خادم بنا دیتے ہیں جن کے پھیلانے یا قدیم کرنے کے لیے یہ آئے ہیں۔ جو انھیں قتل کرنے نکلتے ہیں ان کی زندگی کا رخ بدل کر انھیں مخالفوں کے واسطے قہر بنا دیتے ہیں جو پہلے ایک طرف جھکتا تھا اس کا سر اب دوسرے کے سامنے جھکا دیتے ہیں استاد کو سابقہ پڑتا ہے بے بنی شخصیتوں سے اسے اپنے شاگرد کی بننے والی شخصیت کا رخ سمجھنا اور اس کے امکانات ترقی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور اسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد کرنی ہوتی ہے۔ نہ خالی عقل کی نگاہ سے یہ امکانات دکھائی دیتے ہیں، کہ آدمی کی زندگی میں نہ جانے کتنے غیر عقلی حصے ملے ہیں، نہ خالی وجدان اور طبیعت کی ذکاوت پر استاد بھروسہ کر سکتا ہے۔ یہاں عقل اور وجدان کو ملانے کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا استاد ان مختلف سانچوں سے آشنا ہوتا ہے جن میں آدمی کی سیرت عموماً ڈھلتی ہے اور ان عام معلومات کے ساتھ بچے کی خاص حالت کا مشاہدہ اسے صحیح نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کی ہوئی صفتوں کے ساتھ اچھے استاد میں مشاہدے کی صفت بھی ہونی چاہیئے کہ اس کے بغیر وہ اپنے شاگرد کی پوری شخصیت کی تشخیص نہیں کر سکتا۔ اس کے بغیر اس کی پوری ترقی میں مدد نہیں دے سکتا۔ اس مشاہدے میں اکثر خود استاد کی بنائی شخصیت روک بن جاتی ہے۔ آدمی مردہ چیزوں کا مشاہدہ تو کچھ بے تکلفی سے کر سکتا ہے۔ پر انسان کے جسم کا مشاہدہ تک بے تکلفی سے کرنا دشوار ہے۔ دل اور روح کا مشاہدہ تو کیسے بے تعلقی سے ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے خود اپنے سے لڑنا اور اپنے کو دبانا ہوتا ہے محنتی اور بدشوق، سیدھے اور شریر، مطیع اور گستاخ، تیز اور سست ہنس مکھ اور رونی صورت سب کو ایک نظر سے بے تعلقی کے ساتھ دیکھنا سہل کام نہیں۔ مگر اچھے استاد کا کام بھی سہل نہیں ہوتا اور یہ شرف ہر ایک کو تو حاصل نہیں ہو سکتا۔

استاد کا اصلی کام سیرت کی تیاری ہے۔ اور ساری تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ بچے کے ارادے اور عمل کی قوت کو کسی سیدھی راہ پر ڈ ے اور سچے اصولوں کی روشنی میں، اچھی عادتوں کی مدد سے، اس کی سیرت میں یک سوئی اور پختگی پیدا کر دے۔ جو شخص استاد بن کر تعلیم کا یہ کام انجام دے اسے خود بھی تو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ سیرت کو کس راہ پر ڈالے خود اس کی سیرت کا بھی تو کوئی رنگ خود اس کی زندگی کا بھی تو کوئی مستقل ڈھنگ ہونا چاہیئے۔ اس کے اثر سے بچے میں یک سوئی تو تب ہی پیدا ہوگی کہ خود اس میں یک سوئی ہو۔ جو خود تھالی کے بینگن کی طرح ادھر ادھر لڑھکتا ہو وہ دوسروں کو ایک سمت میں کیسے چلا سکے گا؟ یک سو سیرت کے مختلف اجزا پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، اتنا کہنا بس ہے کہ اچھی سیرت اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے ارادے میں کچھ مضبوطی ہو، جس کی رائے میں صحت ہو، جو صحیح حکم لگا سکے اور ٹھیک تمیز کر سکے، جس کے جذبات میں لطافت ہو اور جو دوسرے کے حال کو اس لطافت کی وجہ سے آسانی کے ساتھ سمجھ سکے۔ پھر جن میں ان خوبیوں کے لیے، جنھیں وہ خوبیاں جانتا ہے، جوش اور ولولہ ہو، اور تین صفتوں کا ذکر تو پہلے کسی نہ کسی سلسلے میں ہو چکا ہے۔ یہ آخری جوش اور ولولے کی صفت بھی یاد رہے کہ استاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ اچھے استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے، گہرائی اور پایہ داری بھی۔ اس کی روح میں حق و صداقت

حسن وجمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہرے سے ایک گرمی پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو کھرا بناتا ہے۔

اس جگہ ایک بات صاف کر دینا اچھا ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کی سیرت کو اپنے اثر سے جو رنگ دیتا ہے اس میں شاید کسی کو حکمرانی اور قوت اور جبر کا مشابہ نظر آئے، کہ حکمراں بھی دوسروں کے ارادوں کو اپنا تابع بناتے ہیں اور استاد بھی دوسروں کی زندگی کو اپنے نقش پر چلانے کی تدبیر کرتا ہے۔ اور دوسروں سے اپنے ارادے پورے کراتا ہے لیکن یہ دھوکا ہے۔ بات یوں نہیں۔ اچھے استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرّہ بھی نہیں ہوتا اس میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکمران جبر کرتے ہیں، یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلاتے ہیں یہ اُزار چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے، ایک کے وسائل ہیں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت، ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے دوسرا مشورہ، وہ غلام بناتا ہے اور یہ ساتھی۔

ان خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی صفتیں اچھے استاد میں پائی جاتی ہیں۔ اچھا مدرس ہونے کے لیے یہ اچھا مقرر ہوتا ہے اور ایسی ہی بہت سی چھوٹی چھوٹی خوبیاں اور رکھتا ہے مگر اس کا امتیاز یہی ہے کہ اس کی زندگی کی جڑیں محبت کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں، اس لیے یہ وہاں امید رکھتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں، وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں، اسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ زندگی کی پستیوں کو بھی دیکھتا ہے، لیکن ان کی وجہ سے اس کی بلندیوں کو بھول نہیں جاتا، اور بڑے کی قدر کے ساتھ ساتھ چھوٹے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ فوق البشر کا تصور بھی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے بس بچّے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچّے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد۔

ذاکر حسین

سیرت کی تعمیر

سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہاد فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ۔ حس جماعتی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائداری۔ ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کردوں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوت فیصلہ آشکار ہوتی ہے، ارادے کے بعد میں اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات، خود مختاری جب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو۔ دوسرے نے کر کے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو، جن طبائع میں خود اپنے بل پر ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ قوت فیصلہ سے ارادہ بروقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلہ میں برابر لیت ولعل ہی ہوتی رہی ہے تو ارادہ کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک نیتی تسویف کے چکر سے عمل کے میدان میں نہیں آسکتی اور سیرت کی تعمیر میں یہ تسویف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہو جاتا ہے، ورنہ ہر فیصلے کے بعد نظر ثانی و نظر ثالث کا سلسلہ جاری رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوت ارادہ بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت یعنی ثبات قدم ارادے کو

خارجی رکاوٹوں اور مخالف قوتوں کے اثر سے بچاتی ہے ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے نامساعد ہونے کی وجہ سے شرمندہ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دیئے جاتے یا بالکل ترک کر دیئے جاتے ہیں۔

قوت ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں، جن میں تغیر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض پر مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار معلم اپنے بچوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے، یعنی ارادہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور بچہ شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے۔ ارادے کی قوت کے اندازے میں ایک بات نوجوانوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ ارادے کی قوت اس کی ابتدائی شدت سے عبارت نہیں، اس لیے کہ کتنے کام ہیں کہ ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کون سی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو۔ مضبوط ارادہ دراصل شدت اور مدت کا حاصل ضرب ہوتا ہے ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں۔ اور ہماری قومی زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتہ مار کر مصروف ہونا ضروری ہے قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر فرط جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا قصد کر لیں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلّہ میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انھیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں کہ مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لیے دوسری شرط قوت فکر ہے، منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت صحیح نتیجے پر پہنچ سکتے نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک ٹھیک سوچ سمجھ نہ سکے وہ بھلا عمل میں یکسوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربی معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا ہے جیسے اندھا ٹٹول ٹٹول کر چلے لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے، جیسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوت عمل کو اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتا ہے یا بخت و اتفاق کے سہارے ڈگمگاتا

آگے بڑھتا ہے، ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے۔ منطقی استدلال اور حکمی فکر کی صلاحیت کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی۔ اس لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے۔ ارادہ کرکے اس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر نتیجے پر جرح کی جائے۔ اسے جانچا جائے پرکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کوشش کرکے ان فطری موانع کو دور کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ جذبات کے طوفان تعجیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خود غرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکر منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کی ان جھانکڑوں کو پیہم کوشش سے دور بھی کر دیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی فکر کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشوونما دے دی گئی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہوگئی، بس ہر قضیے پر شبہہ کرنے اور اسے پرکھنے کی عادت راسخ کی جاسکتی ہے، مگر علمی مسائل پر غور کرنے کی مشق عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی، نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو کچھ اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں۔ اور اصول ہی کافی نہیں، ان پر عمل کرنے کا موقع ہونا بھی ضروری ہے۔ اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا، نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی لازم ہے۔

آپ جس زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر ہر قدم قدم پر ملیں گے سیاسی اور مذہبی نجات فروشوں کی صدائیں، وقت کی سہانی راگنیاں مرغوب عام، مقبول عام سطحی دلیلیں، ناممکن مطالبے، ضدیں، ہٹ دھرمیاں، جماعتی خود غرضیاں، یہ سب اور نہ جانے کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح نتیجوں پر پہنچنے سے روکیں گے آپ کو اگر اپنی سیرت کی تعمیر عزیز ہو گی تو آپ اُن کا مقابلہ کریں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اسے اپنے لیے گوارا بنائیں گے۔ اپنے فکر کی نگرانی اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی متاع عزیز کی، اور سیرت سازی کی اس شرط دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے، شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے،

دوسروں کا عکس رہیں گے اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر منزل سے بہت پہلے ختم ہو جائے گا۔

سیرت کی تربیت کے لیے تیسری شرط اشیاء اور اشخاص سے دو چار ہونے میں ذکاوت حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے۔ حواس ظاہری کے فعل میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں کوئی وہ سب سنتا ہے جس کے لیے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں، کوئی رنگ کے وہ فرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھتے، مزے چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھوکر وہ محسوس کر لیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے۔ مصور، ماہر موسیقی، موتی پرکھنے والے، جواہرات کے بیوپاری، چاک پر کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوتِ حس سے دوسرے بنی نوع کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقات انسانی میں بھی ایسی ذکاوتِ حس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں، کچھ بے حس سے، کچھ بہت تیز، کچھ بہت کند، کچھ ذکی، کچھ غبی، بعض بہت جلد دوسروں کو سمجھ لیتے ہیں، آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں۔ جبلی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں، دوسروں کے مافی الضمیر تک اُن کی اُن میں پہنچ جاتے ہیں، بعض اس کے بالکل برعکس انسانوں اور چیزوں سے برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشوونما پاتی ہے۔ کتاب کے کیڑے اور خبری علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم ہوتے ہیں زندگی کی ناکامیاں، بچپن میں دل شکستگی، آلام روزگار کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کر دیتے ہیں۔ خود غرضی کی شدت، خود پرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکۂ لطیف سے عاری کر دیتی ہے۔ بے غرض خدمت بے لاگ میل جول اس کو جلا دیتے ہیں۔ آدمیوں سے سابقہ میں، عمل کے متنوع تجربے میں، طرح طرح کی صحبتوں میں، زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتی ہے۔ خلوت میں اکثر ٹھٹھر جاتی ہے، جلوت میں نکھرتی ہے۔ تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشوونما میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی اجنبی سے رہتے

ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے، یعنی یہ کہ نفس مشاہدات و افکار و تصورات سے کتنا اثر لیتا ہے۔ اور اسے کتنی دیر تک قائم رکھتا ہے۔ ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں اور کتنی مدت تک چلتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ پتھر کو کوئی آدمی کیسے بنا دے اور گوبر تو انسان کے دل کی طرح کیسے ڈھرکنے لگے؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے، ہوا کا ہر جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے، لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بھی بدل جاتی ہے۔ ان کی سیرت میں یکسوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے۔ ان پر ہر رنگ چڑھ جاتا ہے، یہ ہر تیز رو کے پیچھے چلتے ہیں مگر بس تھوڑی دور یہ ہر تحریک کے علم بردار بن جاتے ہیں۔ مگر بس چند دن کو، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں آئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں۔ سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے درپے ہوتے ہیں، ہر اشتہاری دوا کو آزمانا چاہتے ہیں! بڑے دل چسپ ہوتے ہیں یہ نیک دل، ہلکے ہلکے لوگ۔ مگر سیرت کی یک سوئی انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ سیرت پختہ بنتی ہے ان کی جن کے ذہن (میں) اگر کوئی نیا خیال جگہ پاتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا ہے۔ ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری وساری ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر لیتے ہیں اور اس کو سب نئے تجربات وواردات کا محور بناتے ہیں، بحر زندگی کی ہر ہوا کو اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے اور یہ وابستگی فکر وضمیر اگر اقدار متعلقہ سے ہو جائے تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا جاگنا، مرنا جینا سب کچھ اس کے لیے ہے۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری میں ایسی گہرائی اور ایسی پائداری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یکسو سیرت میں بدل جاتی ہیں۔

ذاکر حسین

سیرت کی تربیت

(یہ وہ خطبہ ہے جو ۲۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا گیا)

جناب صدر اور حضرات!

میں اپنے محترم کرم فرما عالی مرتبت وزیر صاحب تعلیمات[1] اور اپنے عزیز دوست پیرزادے صاحب[2] کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقع پر یاد فرمایا اور جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو مخاطب کرنے کا شرف بخشا۔ اس لیے اور بھی شکر گزار ہوں کہ اس دعوت نے پہلی بار ریاست بہاول پور میں حاضری کا موقع دیا، جس کے بیدار مغز حکمراں کے نام سے اس خاندان عباسی کی یاد تازہ ہے جس کی خدمت گذاری کو عدل و انصاف اور علم و حکمت کبھی فراموش نہ کریں گے۔ خدا انہیں اپنی مخلوق کی خدمت کی توفیق اور علم و حکمت کی دست گیری کی سعادت سے مالا مال فرمائے۔ بغداد جدید[3] میں اگر اگر اس بلدۂ مبارک کی یاد آئے تو کیا عجب ہے:

پڑی خاک ایتھنز میں جہاں جہاں سے
ہوا زندہ پھر نام یوناں جہاں سے

جہاں برابر

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

---

[1] عالی مرتبت میجر شمس الدین صاحب

[2] پیرزادہ عبدالرشید صاحب پرنسپل بہاول پور کالج

[3] یہ خطبہ "بغداد جدید" بہاول پور میں پڑھا گیا تھا۔

ولقمان وسقراط کے دُرِّ مکنوں

وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطون

ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانون

پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفون

یہیں آکے مہرِ سکوت ان کی ٹوٹی

اسی باغِ رعنا سے بُو اس کی پھوٹی

اس خاندانِ خلافت اور اس فخر البلاد بغداد کے ساتھ نسبت سے یہاں کی حکومت اور خصوصًا یہاں کے علمی اور تعلیمی کام کرنے والوں کی ذمّے داری بہت بڑھ جاتی ہے، خدا انہیں اس کے اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ سب کو بھی، اے عزیزانِ جواں ہمت! اس کا ولولہ اور اس کی ہمت عطا ہو کہ آپ اس بغداد جدید کو اس پرانے بغداد کا ہمسر بنانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اس کے علمی شغف اس کی بے تعصبی، اس کی وسیع الخیالی کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں اور اپنے بس بھر کچھ دکھائیں۔ تمدّنی زندگی میں دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے۔ تعلیم و تربیت کی قلم رو میں تو ماضی کی تمام تحصیلات ذہنی آنے والی نسلوں کی میراث ہوتی ہیں۔ یہی ذہنی زندگی کے لیے بمنزلہ غذا ہیں، یہی ذہنی ارتقا میں بامِ ترقی کا زینہ۔ ماضی کی تحصیلات میں کہ سب کی سب کسی نہ کسی کاوش ذہنی ہی سے تو عبارت ہوتی ہیں، انسانی ذہن اپنی قوتوں اور توانائیوں کو سُلا سا دیتے ہیں چھپا دیتے ہیں، محفوظ کر دیتے ہیں۔ جب کوئی دوسرا ذہن، جس کی ساخت کو اس ذہنی کاوش سے کچھ مناسبت ہو جس نے ذہنی قوتوں کو ان اشیائے تمدّن میں بطور خزینہ چھپا کر محفوظ کیا ہے، ہاں، جب کوئی دوسرا ذہن ان اشیائے تمدّن سے دوچار ہوتا ہے تو یہ پوشیدہ قوتیں آشکار، خوابیدہ توانائیاں بیدار ہو جاتی ہیں اور تربیتِ ذہنی کا کام انجام دیتی ہیں۔ اس لیے اگر تعلیم والے ماضی کی تحصیلات سے بیزاری ظاہر کریں تو سچ یہ ہے کہ وہ، شاید بے جانے، عملِ تعلیم کی ماہیت سے بے خبری کا اقرار کرتے ہیں۔ تعلیم تو نام ہی ماضی کے ذہنِ معروض کو حال کے ذہنِ موضوع میں منتقل اور بیدار کرنے کا ہے۔

ہاں، اس سے کوئی یہ سمجھ لے کہ حال اور مستقبل ماضی کی تحصیلات سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے تو بڑی ہی بھول ہوگی، اس لیے کہ یہ تو ذہنی ارتقا کے سفر کو بیچ میں ہی قطع کر دینا ہوا۔ ذہن بے شک ذہن کی پچھلی کاوشوں ہی سے تربیت پاتا ہے اور غذا حاصل کرتا ہے، لیکن جب تربیت پا چکتا ہے تو ذہنی تشکیلات کے بے شمار امکانات اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ قدامت پرستی اور جمود ذہنی اگر اس وسیع میدان کو تنگ کرنا چاہیں تو گویا ایک جوان حوصلہ مند فرس کو کولھو کا بیل بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ زندگی ہر دم نئے مسائل سے دوچار ہوتی ہے، اس کا دھارا ایک لمحے کے لیے کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا، حالات کا تغیر نئے انتظام چاہتا ہے، نئے اداروں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک نئی کل کی ایجاد، ایک نئی قوتِ محرکہ کا انکشاف سارے نظام دولت آفرینی کو درہم برہم کر دیتا ہے، تقسیمِ عمل اور تنظیم کار کے سارے نقشے پلٹ جاتے ہیں، زندگی کا ڈھنگ ہی اور ہو جاتا ہے۔ ایک نیا تصورِ حیات سیاسی اور معاشرتی زندگی کی بنیادوں تک کو ہلا دیتا ہے اور ایک نئی عمارت کی نئی داغ بیل ڈالنے پر مجبور کرتا ہے، ایک کلمۂ پاک اپنی جڑوں کو ضمیر انسانی میں مضبوط جما کر اپنی شاخیں آسمان تک بھیج سکتا ہے، ایک اچھی زندگی کا اسوۂ حسنہ ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے لیے رحمت بن جاتا ہے، ایک گندا خیال، ایک فاسد مگر دل فریب تصورِ زندگی مدتوں تک زندگی کے چشموں کو مسموم کر سکتا ہے، ایک خود غرضی، ایک ہٹ، ایک کوتاہ اندیشی بسا اوقات قوموں کی قوموں کے لیے زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ جس زندگی کا توازن اتنا نازک ہو اس کے مطالبوں سے جامد ذہن عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ماضی منزل نہیں رختِ سفر فراہم کرنے کا مخزن ہے۔ بغداد کے کارناموں سے آنکھیں بند کر لیتا تو اپنی میراث کو ٹھکراتا ہے، سفر پر بغیر سامانِ سفر کے چل کھڑا ہوتا ہے، لیکن سفر بغداد سے بغداد کا نہیں ہے۔ جو بنانا ہے وہ وہ نہیں جو بنایا جا چکا ہے۔ بنانا پھر سے بغداد نہیں ہے۔ بغداد جدید بنانا ہے۔

اس نئی زندگی، اس نئے آئین، ان نئے اداروں، اس نئے تمدن، اس نئے بغداد کے معمار آپ ہی نوجوان ہوں گے۔ اس تمدنِ جماعتی کی تعمیر کا ایک دشوار مگر

نہایت حکیمانہ مطالبہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ معمار خود اپنی تعمیر بھی کرے۔ قدرت نے جو صلاحیتیں جو قوتیں، جو جبلتیں، جو استعدادیں، جو میلات، جو خواہشات اسے ارزانی فرمائی ہیں ان کے بے ترتیب انبار میں نظم و ترتیب پیدا کرے، ان میں یک جہتی اور یک سوئی کی تدبیر کرے اور اپنی بے ترتیب انفرادیت سے ایک مرتب سیرت بنائے اور اس سیرت کو بالارادہ اقدارِ عالیہ مطلقہ سے وابستہ کر کے آزاد اخلاقی شخصیت کے مرتبۂ بلند پر پہنچائے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت، یہ ہے ان معماروں کی تعمیر کا راستہ۔

ان تصورات کی وضاحت کا یہ وقت نہیں، صرف اتنا اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجۂ اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جماعتی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرے اور پایہ داری۔ ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کر دوں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں، دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوتِ فیصلہ آشکار ہوتی ہیں، ارادے کے بعد اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔ خود مختاری جب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو، دوسرے نے کر کے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو۔ جن طبائع میں خود اپنے بل پر ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی پیدا ہو سکتی ہے؟ قوتِ فیصلہ سے ارادہ بروقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلے میں برابر لیت و لعل ہی ہوتی رہے تو ارادے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک نیتیں تسویف کے چکر سے عمل کے میدان میں نہیں آسکتیں اور سیرت کی تعمیر میں یہ تسویف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا، ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہو جاتا ہے۔ ورنہ ہر فیصلے کے بعد نظرِ ثانی و نظرِ ثالث کا سلسلہ جاری

رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوّت ارادی بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت یعنی ثباتِ قدم، ارادے کو خارجی رُکاوٹوں اور مخالف قوتوں کے اثر سے بچاتی ہے، ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے ناسا عد ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دیے جاتے یا بالکل ترک کر دیے جاتے ہیں۔

قوّتِ ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں، جن میں تغیّر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض پر مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار معلّم اپنے بچوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ یعنی ارادہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور بچہّ شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے۔ ارادے کی قوّت کے اندازے میں ایک بات نوجوان کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ ارادے کی قوّت اس کی ابتدائی شدّت سے عبارت نہیں۔ اس لیے کہ کتنے کام ہیں جو ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کون سی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو؟ مضبوط ارادہ در اصل شدّت اور مدّت کا حاصل ضرب ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں اور ہماری قومی زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتّا مار کر مصروف ہونا ضروری ہے۔ قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر فرطِ جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا قصد کریں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلّے میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انہیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں کہ مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لیے دوسری شرط قوت فکر ہے۔ منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت، صحیح نتیجے پر پہنچ سکنے، نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک ٹھیک سوچ سمجھ نہ سکے وہ بھلا عمل میں یک سوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربی معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا

ہے، جیسے اندھا ٹٹول ٹٹول کر چلے، لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے، جسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوتِ عمل کو اس کان سے سُن کر اس کان سے نکال دیتا ہے یا بخت و اتفاق کے سہارے ڈگمگاتا آگے بڑھتا ہے، ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے۔ منطقی استدلال اور حکمی فکر کی صلاحیت کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی، اس کے لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے، ارادہ کر کے اس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر نتیجے پر جرح کی جائے، اسے جانچا جائے، پرکھا جائے۔ یہی نہیں کوشش کر کے ان فطری موانع کو دور کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہو جاتے ہیں جذبات کے طوفان، تعجیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خود غرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکرِ منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کے ان جھاڑوں کو بہم کوشش سے دور بھی کر دیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی سوچنے کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشوونما دے لی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہو گئی، بس ہر قضیے پر شبہہ کرنے اور اسے پرکھنے کی عادت راسخ کی جا سکتی ہے۔ مگر علمی مسائل پر مشق عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی، نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو کچھ اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں۔ اور اصول ہی کافی نہیں، ان پر عمل کرنے کا موقع بھی ہونا ضروری ہے۔ اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا، نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی تو لازم ہے۔

آپ جس زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر ہر قدم پر ملیں گے۔ سیاسی اور مذہبی نجات فروشوں کی صدائیں، وقت کی سہانی راگنیاں، مرغوبِ عام، مقبولِ عام، سطحی دلیلیں، ناممکن مطالبے، ضدیں، ہٹ دھرمیاں، جماعتی خود غرضیاں، یہ سب اور نہ جانے اور کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح

نتیجوں پر   سے روکیں گے۔ آپ کو اگر اپنی سیرت کی تعمیر عزیز ہوگی تو آپ ان کا مقابلہ کریں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اُسے اپنے لیے گوارا بنائیں گے، اپنے فکر کی نگرانی اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی متاعِ عزیز کی، اور سیرت سازی کی اسی شرطِ دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے، شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے، دوسروں کا عکس رہیں گے، اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر منزل سے پہلے پہلے ختم ہو جائے گا۔

سیرت کی تربیت کے لیے تیسری شرط اشیاء اور اشخاص سے دوچار ہونے میں ذکاوتِ حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے۔ حواس ظاہری کے فعل میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی وہ سب سنتا ہے جس کے لیے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں، کوئی رنگ کے وہ عرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھتے، وہ مزہ چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھو کر وہ محسوس کر لیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے، مصوّر، ماہر موسیقی، موتی پرکھنے والے جواہرات کے بیوپاری، چاک پر کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوتِ حس سے دوسرے بنی نوع کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقاتِ انسانی میں بھی ایسی ذکاوتِ حس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں کچھ بے حس سے، کچھ بہت تیز، کچھ بہت کُند، کچھ ذکی، کچھ غبی، بعض بہت جلد دوسروں کو سمجھ لیتے ہیں، آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں، جبلی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں، دوسرے کے مافی الضمیر تک آن کی آن میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اس کے بالکل برعکس۔ انسانوں اور چیزوں کو برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشوونما پاتی ہے، کتاب کے کیڑے اور خبری علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم ہوتے ہیں۔ زندگی کی ناکامیاں، بچپن میں دل شکستگی، آلام

روزگار کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کر دیتے ہیں۔ خود غرضی کی شدّت، خود پرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکۂ لطیف سے عاری کر دیتی ہے۔ بے غرض خدمت، بے لاگ میل جول، اس کو جلا دیتے ہیں۔ آدمیوں سے سابقے میں، عمل کے متنوع تجربے میں، طرح طرح کی صحبتوں میں زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتی ہے خلوت میں اکثر ٹھہر جاتی ہے، جلوت میں نکھر جاتی ہے، تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشوونما میں اس کا بڑا حصّہ ہے۔ جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی اجنبی سے رہتے ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے، یعنی یہ کہ نفس مشاہدات وافکار و تصوّرات سے کتنا اثر لیتا ہے اور اسے کتنی دیر تک قایم رکھتا ہے، ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں اور کتنی مدت تک چلتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ پتھر کو کوئی آدمی کیسے بنادے اور گوبر کا تودہ انسان کے دل کی طرح کیسے دھڑکنے لگے؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے، لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بدل بھی جاتی ہے۔ ان کی سیرت میں یک سوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے۔ ان پر ہر رنگ چڑھ جاتا ہے، مگر ذرا سی دھوپ میں یہ رنگ اتر بھی جاتا ہے۔ یہ ہر تیز رَو کے پیچھے چلتے ہیں مگر بس تھوڑی دور، یہ ہر تحریک کے علم بردار بن جاتے ہیں، مگر بس چند دن کو، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں، مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں، زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں، آئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں، سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے درپے ہوتے ہیں، ہر اشتہاری دوا کو آزمانا چاہتے ہیں؛ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ نیک دل ہلکے پھلکے لوگ، مگر سیرت کی یک سوئی انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ سیرت پختہ بنتی ہے ان کی جن کے ذہن میں آکر کوئی نیا خیال جگہ پاتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا

ہے، ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری وساری ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر لیتے ہیں، اسی کو سب نئے تجربات وواردات کا محور بناتے ہیں، بحرِ زندگی کی ہر ہوا کو اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے، اور یہ وابستگی فکر وضمیر اگر اقدار مطلقہ سے ہو جائے، تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا جاگنا مرنا جینا سب کچھ اسی کے لیے ہے۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری میں ایسی گہرائی اور ایسی پائے داری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یک سو سیرت میں بدل جاتی ہیں۔

یک سو سیرت کی یہ چار شرطیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا اگر تعلیم کے زمانے میں معلّم کے پیشِ نظر ہوں تو وہ مناسب تدبیروں سے ان کی نشوونما کا سامان کرتا ہے اور انفرادیت کو دبائے یا مٹائے بغیر اس کے عناصر ترکیبی میں نظم پیدا کرنے کی صورت نکالتا ہے لیکن آپ جو اس وقت میرے مخاطب ہیں، جو اپنی رسم تعلیم کی تکمیل کے بعد اس کالج سے سند لے کر جا رہے ہیں، آپ کے لیے اب یہ معلّم کیا کر سکیں گے؟ اب تو یہ سب کچھ آپ کو خود ہی کرنا ہوگا، اپنی تعلیم و تربیت اب کُلیتًا اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔

تعلیم میں بیرونی اور اندرونی تشکیل، حکم اور آزادی، دوسرے کی بتائی راہ پر چلنا اور اپنی کاوش سے خود راہ نکالنا اور اسے طے کرنا، ان دونوں کی اعتباری حدود اور تاثیر کا مسئلہ بڑا اہم اور مشکل مسئلہ ہے، لیکن عمر کی جس منزل میں آپ داخل ہو رہے ہیں اس میں خارجی تشکیل کا کام تقریبًا ختم ہو چکتا ہے اور داخلی تربیت کا زمانہ آجاتا ہے۔ جوں جوں سیرت اخلاقی بنیادوں پر استوار ہوتی جاتی ہے اسی قدر معلّم اور والدین کا کام گھٹتا جاتا ہے۔ اور اپنی تعلیم و تربیت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا زمانہ آجاتا ہے۔

اس "اپنی تعلیم آپ" کے معنیٰ کیا ہیں؟ کیا بس لفظ ہیں کہ بول دیے یا ان کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ جس مطالبہ سے جو کر دیا یا اسے پورا کرنے کے لیے عملِ پیہم کی شرط ہے؟ اپنی تربیت آپ کرنے کے معنیٰ ہیں اپنی روح کو، کہ پست و بلند

ادناو ، اسفل وارفع کی آماج گاہ ہے نیچے سے اوپر لے جانے کی سعیٔ مسلسل، پست جبلتوں اور محرکوں، بُری عادتوں اور خواہشوں، غلط افکار اور خیالات کے دلدل سے اپنے کو نکال کر اخلاقِ حسنہ کی شاہراہ پر ڈالنا، اپنی انفرادی صلاحیتوں اور یک سوئی و یک جہتی پیدا کر کے اپنی سیرت کی ساری قوت کو ان اخلاقی معیاروں کا تابع بنانا اور شخصیت اخلاقی کی منزل کی طرف باوجود ناکامیوں اور مایوسیوں کے برابر بڑھے جانا۔ یہ کام دراصل جہادِ زندگانی میں ایک سپاہی کا کام ہے، وہ سپاہی جو باطل کی ان قوتوں ہی سے برسرِ پیکار نہیں ہوتا جو خارج سے زندگی کو بگاڑنا چاہتی ہیں بلکہ باطل کی ان طاقتوں سے بھی جو نفس کے اندر روح کی جڑوں کو گھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں، جن کی چھپی ہوئی فوج روح کی مملکت کو تاراج کرتی ہے، اور اخلاقِ حسنہ کی بستیوں کو اجاڑتی رہتی ہے۔ سچا مجاہد ان سے بھی لڑتا ہے، اُن سے بھی یہ جماعت کی زندگی کو بھی اقدارِ عالیہ کا خادم بنانا چاہتا ہے اور اپنی شخصی صلاحیتوں کو بھی۔ اس کا ثباتِ قدم، اس کی خود اعتمادی، اس کا خلوص، اس کا اقدارِ اعلا پر ایمانِ محکم، اس پیکرِ حیات میں اس کے ہتھیار ہوتے ہیں اور ضبطِ نفس، بے غرض خدمت اور اخلاقی جرأت اس جہاد میں اس کے رفیقِ راہ ہوتے ہیں۔

زندگی میں ہم جس شخص کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے نفس پر قابو حاصل ہے، اس کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس صفت کی دل سے قدر کرتے ہیں، ہو سکے تو اسے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش بھی کریں مگر بس "طبیعت ادھر نہیں آتی!" اس صفتِ اخلاقی کی تیاری اطاعت کی مشق سے ہوتی ہے۔ پہلے بچے کی اس اطاعت سے وہ مجبوراً کرتا ہے، پھر بڑے کی اس اطاعت سے جو وہ سمجھ کر کرتا ہے، ایک کو خارجی اطاعت کہہ سکتے ہیں، دوسری کو داخلی پہلی میں خوف کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے، دوسری میں سمجھ اور عقل کو۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے خوف کا عنصر کم ہوتا جاتا ہے۔ آپ جو اب زندگی کی کشاکش سے بلاواسطہ دوچار ہونے کے لیے کمربستہ ہو رہے ہیں، آپ کہ گھر اور مدرسے اور کالج کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی تربیت کو آپ سنبھالنے کی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں، آپ

کو جاننا چاہیئے کہ اگر گھر اور مدرسے اور کالج نے آپ میں اطاعتِ داخلی کی بنیادیں استوار نہیں کی ہیں تو آپ کے اس نئے کام کی دشواری ناممکن کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر آپ کے زادِ راہ میں چند اخلاقی اصول بھی نہیں ہیں جو آپ کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوں، اگر آپ کے اندر احساسِ اقدار ہی پیدا نہیں ہوا ہے، اگر اخلاقی احکام کی پابندی کو آسان بنانے والی عادتیں آپ میں پڑی ہی نہیں ہیں تو یوں سمجھیے کہ آپ تیراکی کی ابتدائی مشق کے بغیر ہی دریا میں کود رہے ہیں، اور دریا بھی طوفانی ہے، قدم قدم پر بھنور ہیں۔ آپ سابقہ تیاری کے بغیر ایک شریر اور منہ زور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ رہے ہیں، نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں! خدا السیول کی بھی مدد کرتا ہے اور بسا اوقات یہ بھی ڈوبتے نہیں، ساحلِ مراد پر پہنچ جاتے ہیں اور گر کر چور چور نہیں بلکہ منزلِ مقصود پر جا اترتے ہیں۔ اس کا فضل ہے جس پر ہو جائے۔ کبھی کسی کی ایک نظر، کبھی زندگی کے بے شمار حادثوں میں کوئی حادثہ، کوئی شدید وارداتِ قلبی، سابقہ بے توجہی کی تلافی کر دیتے ہیں، آدمی کو کسی اخلاقی اصول کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ اب زیادہ توجہ اور زیادہ خلوص سے اس پر چل کر پہلے سے عادتوں کے نہ پڑنے کی کمی کو جیسے تیسے پورا کر لیتا ہے۔ لیکن آپ میں سے بہتوں کو آپ کی تعلیم و تربیت نے کچھ نہ کچھ عادتیں تو اس زندگی کے دشوار سفر کے لیے ساتھ دی ہی ہوں گی۔ ان تصوراتِ اخلاقی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھتے جانا، ان کی حکمت کے علم کے ساتھ ان کی اطاعت کے داخلی میلان کو قوی تر کرتے جانا، یہ اب آپ کا تعلیمی تربیتی کام ہے، جسے خود آپ کو انجام دینا ہے۔ اور اس بصیرتِ اخلاقی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں صداقت ہو، آپ خود تو اپنے سے جھوٹ نہ بولیں، خود اپنے کو تو دھوکا نہ دیں۔ عادتوں کو راسخ کرنے کے لیے ضرورت ہے مشق کی اور مشق کے لیے موقع کی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کا موقع ہے، جو اس سے کام لیتا ہے وہ اپنی عادتیں سنوارتا جاتا ہے۔

آپ کے نفس کے جو دو حصے ہیں، ایک جو حیوان کی حیثیت سے پیدائش سے ساتھ ہے، دوسرا جو انسان کی حیثیت سے ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے، ایک جو طبیعت کا ساتھی ہے دوسرا جو اخلاق کا پابند ہے، ایک جو من مانی زندگی چاہتا

ہے، دوسرا جو آزادی سے خود اپنے کو احکام اخلاقی میں باندھ کر رکھنا چاہتا ہے، آپ کا سینہ ان دونوں کی کشاکش کا عرصۂ کارزار ہے۔ اس کشاکش میں فتح کس کی ہو، طبیعت کی یا اخلاق کی، حیوانی جبلّت کی یا انسانی اقدار کی؟ دوسرے کی فتح کا سامان کرنا اور برابر کرتے رہنا، "آپ اپنی تربیت" کا کام ہے۔

آپ سے زندگی میں جو کام سرزد ہوں گے ان میں سے بعض تو میکانکی محرکات کے ردِّ عمل کے طور پر ظاہر ہوں گے۔ ان سے سیرت کی تربیت میں زیادہ مدد نہ ملے گی۔ تربیت کے لیے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے، کچھ تامّل درکار ہے۔ اس میکانکی ردِّ عمل میں اس کا موقع ہی نہیں ہوتا۔ بعض اعمال ان عادتوں سے پیدا ہوں گے جو پچھلی مشق اور تکرار سے پڑ چکی ہیں۔ یہ بھی حقیقی معنوں میں تربیت کا کام انجام نہ دیں گے۔ ہاں، جو اعمال نئے تصورات و افکار سے اخلاقی اقدار اور مطالبات سے پیدا ہوں گے وہ اپنی تربیت آپ کرنے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ نئے افکار و اقدار حکم دیتے ہیں اور حکم جتنا واضح ہوتا ہے تعمیل اتنی ہی سہل ہوتی ہے۔ مگر خالی حکم کی وضاحت کافی نہیں ہوتی، قوتِ ارادی کی مضبوطی بھی درکار ہوتی ہے جو دوسرے پست احکام کو، خواہشوں اور خود غرضیوں کے وساوس کو، نفسِ امارہ کے فریبوں، لالچوں اور طفل تسلیوں کو کہ ہر اخلاقی حکم اور ہر نیک ارادے کے خلاف فوج در فوج سینۂ انسانی میں ابھرتے ہیں، پسپا کر سکے۔ اور باطل کی یہ فوجیں جب پسپائی کے بعد پھر قلب کے کسی حصے میں جا چھپیں اور موقع پاکر پھر غفلت میں وار کریں تو ان کو پھر شکست دینا اور دبائے رکھنا اس پر منحصر ہے کہ آپ کے اخلاقی مطالبے سے جو توانائیاں پیدا ہوئی ہیں وہ کس درجے کی ہیں، وقتی ہیں یا پائے دار، آپ کی ارادی توجہ اس پر کہاں تک مرتکز رہ سکتی ہے۔ اس دشوار کام میں توجہ کو جمانا سہل ہو جاتا ہے اگر آدمی اپنی صلاحیتوں، اپنی کمزوریوں، اپنی خوبیوں اور برائیوں سے واقف ہو، اپنے کو پہچانتا ہو۔

اور یہ اپنی پہچان کیسے پیدا ہوتی ہے؟ بیٹھے بیٹھے خود بخود اپنے پر منکشف نہیں ہوتی، نہ کوئی آن کر کان میں یہ راز بتا جاتا ہے۔ اس کا پتا کام کرنے سے پتہ چلتا ہے، عمل کے میدان میں کودنے سے چلتا ہے۔ آزادی کے ساتھ صحیح اور غلط دونوں

راہوں پر چلنے کا موقع ملنے سے، زمانے کے نرم گرم دونوں جھٹکنے سے، نیکی کرنے اور بدی کرنے سے، ٹھوکریں کھانے اور ٹھوکر کھا کر سنبھلنے سے، گناہ سے اور توبہ سے چلتا ہے۔ کامیابیوں سے زیادہ ناکامیاباں اس کا سراغ دیتی ہیں۔ غلطی کا موقع نہ پاکر صحیح کام کرتے رہنے والوں کو، گناہ کا امکان نہ پاکر معصومیت پر مجبور فخر کرنے والوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کا رمز شناس تو وہ ہوتا ہے جو معصیت کی ٹھوکر کھاتا ہے، گرتا ہے مگر گر کر اپنا سر سجدے میں رکھ دیتا ہے۔ اپنے کو پہچاننے کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی آزاد ہو اور اسے متنوع عمل کا موقع ملے۔ لیکن آزادی عمل کے بعد بھی اپنی تربیت وہی کر سکتا ہے۔ جس میں صداقت کا جذبہ کار فرما ہو۔ اس کا کہہ دینا سہل ہے، کرنا مشکل۔ آدمی کو شاید کوئی چیز اتنی مرغوب نہیں جتنی اپنے متعلق اچھی باتیں باور کرنا۔ خوشامد کا سارا جادو اسی پر تو مبنی ہے، اور دوسرے نہ کریں تو آدمی خود اپنی خوشامد کر لیتا ہے اپنے کو فریب دیتا ہے، اپنے سے جھوٹ بولتا ہے۔ جس پر خود فریبی کا یہ بھوت مسلّط ہو وہ آزاد عمل کی دنیا میں بھی اپنے کو نہیں پہچان پاتا۔ اس لیے ہر شخص کا جو اپنی اخلاقی تربیت آپ کرنا چاہتا ہو نہایت اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس دشمن سے چوکنا رہے، کہ ذرا آنکھ جھپکی اور اس نے وار کیا۔ اپنے سے اپنے متعلق سچ بولنے کی عادت بڑی قیمتی عادت ہے اور ڈالے سے پڑتی ہے، آپ ہی آپ نہیں پڑ جاتی۔ بہتیرے تو عمل کے میدان میں ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ اپنے سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ یہ کام میں لگ کر کام کے حسن و قبح سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے شاید یہ خیال کافی ہوتا ہے کہ میرا کام ہے اس لیے اچھا ہی ہوگا۔ جہاں اپنے کام پر دشمن کی سی تنقیدی نظر نہ رہی وہیں سے آدمی کی ترقی بند ہو جاتی ہے۔ اپنے کام پر بیگانہ وار نظر ڈالنے، اپنے ارادے اور نیت و خلوص کو پرکھتے رہنے کی عادت شخصیت کی تربیت کے لیے از بس ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنا غفلت ہے اور شخصیت کی تربیت بیداری چاہتی ہے وساوس نفس کے لشکر اسی غفلت میں کامیاب شب خون مارتے ہیں اور ہارنے والے کو معرکے کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اپنے سے یہ بے خبری اچھی نہیں۔ آزاد عمل اور اس پر تنقیدی نظر کے مواقع زندگی کے سب ہی شعبوں میں

ملتے ہیں مگر جو اپنی سیرت کی تربیت کے کام کو اہم کام جانتا ہے وہ اپنے لیے بے غرض خدمت کے خاص میدان کا متلاشی رہتا ہے۔ اس میں عمل کے اندر اخلاقی آزادی کا یقین واضح طور پر سامنے رہتا ہے۔ رے وانگبین کی لاگ کے بغیر جو کام ہوتا ہے وہ آزاد اخلاقی مطالبے ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بڑی شخصیتوں کے لیے تو یہ میدان روز بروز وسیع تر ہوتا جاتا ہے، لیکن معمولی حیثیت کے لوگ بھی اپنی سیرت کی تربیت کے لیے کوئی نہ کوئی کام بے لوث خدمت کا منتخب کر سکتے ہیں۔ بسا اوقات کسی وقتی جذبے سے آدمی ایسے کسی کام کی ذمے داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس گھڑی کو خوش قسمتی کی گھڑی سمجھنا چاہیئے۔ اس کام کو چاہے چھوٹا سا ہی کام ہو برابر انجام دیتے رہنا اپنی تربیت میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ پہلے چھوٹا سا کام ہوتا ہے، مگر اس پر جمنے سے سیرت میں ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے جو اس کے حلقۂ عمل کو وسعت دیتا ہے اور بسا اوقات ایک چھوٹے سے بے غرض کام کی پابندی سیرت میں بڑی پختگی پیدا کر دیتی ہے اور بڑھ کر اور پھیل کر اس کے مختلف پہلوؤں پر چھا جاتی ہے۔ بد نصیب ہیں وہ جو اس کے فیض سے محروم ہیں۔

پہلے بیان کر چکا ہوں کہ سیرت کی تربیت کا کام دراصل ایک جنگ ہے جس میں بعض قوتوں کا ساتھ دینا ہے، بعض سے لڑنا ہے۔ یہ کام مجاہدانہ کام ہے۔ اس مجاہد کی خصوصی صفت اس کی اخلاقی جرأت ہوتی ہے۔ جو سیرت بنانا چاہتا ہے اُسے اپنے اندر یہ صفت پیدا کرنی چاہیئے۔ اخلاقی جرأت آدمی کو اخلاقی اقدار مطلقہ کا سپاہی بناتی ہے، اس میں ایک مستقل عزم پیدا کرتی ہے کہ جب اور جہاں یہ اقدار مطلقہ خطرے میں ہوں، جب ان کے ساتھی بچھڑ جائیں اور دشمنوں کا نرغہ ہو، جہاں رسم یا عادت یا تن آسانی ان کی ظاہری اطاعت کو بھی بس ایک بے حقیقت ڈھونگ سا بنا دیں تو یہ انہیں زندہ کرنے، انہیں زندہ رکھنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دے۔ جہاں اور جب کبھی، جی ہاں، جہاں اور جب کبھی۔ ہماری تاریخ ایسی اخلاقی جرأت کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، ہر شریف قوم کی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں ایسا نہ ہو تو قوم کو شرافت کا تمغۂ امتیاز ہی کیسے حاصل ہو؟ ہر وہ نوجوان جو اپنی قوم کے لیے یہ تمغہ حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے اپنے اندر یہ مجاہدانہ

صفت پیدا کرنے کے لیے بے قرار ہونا چاہیے اور اسے پیدا کرنے کے لیے اس کی نشانیاں معلوم ہونی چاہئیں۔ اسے جاننا چاہیے کہ اس کی ایک نشانی تو وہ شجاعت ہے جو اپنی آسایش اور زحمت، سود و زیاں اور دوسروں کی واہ وا یا لعن طعن کا میزانیہ بنائے بغیر اس معرکے میں ثبات قدم عطا کرتی ہے، دوسری نشانی اس قدرِ اخلاقی کا پورا یقین ہے جس کے لیے آدمی سینہ سپر ہو رہا ہے، اور تیسری نشانی یہ ہے کہ اس قدر کی حفاظت اور حمایت میں اسے اپنی ذمے داری کا پورا احساس ہے۔ سمجھی بوجھی ذمّے داری اور استقلال و پامردی کے ساتھ اس کے لیے جان تک کھپانے کی آمادگی ہو تو جرأت اخلاقی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں نہ غرور کو دخل ہوتا ہے، نہ جذبات سے مغلوبیت کو، یہ کھلی آنکھوں دہکتی آگ میں کودتی ہے اور مسکراتی ہوئی سولی پر چڑھتی ہے۔ یہ کسی وقتی جوش و خروش کے ریلے میں میدان میں نہیں اترتی، بلکہ عرصے تک انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارنا بھی جانتی ہے۔ یہ ہم خیالوں کے مجمعوں میں بڑھ بڑھ کر اطاعتی نہیں بناتی، نہ تالیوں اور نعروں اور ہجے جے کار ول کی تھکاری پر جھپاتی ہے، یہ ایک لفظ بھی کہتی ہے تو اس کی ذمّے داری کا پورا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کرتی ہے، یہ بھڑکتی ہی نہیں، سلگتی بھی ہے، اس کی نشانی ہی ہے سمجھی بوجھی ذمّے داری اور اس کے پورا کرنے کے لیے سعی پیہم۔ اس سے سیرت اقدارِ عالیہ کی جاگیر بن جاتی ہے اور جو سیرت اپنے کو شعوری طور پر اقدارِ مطلقہ کا خادم بنائے وہ شخصیت بن جاتی ہے۔ شخصیت کائنات کی شاید سب سے گراں بہا متاع ہے۔ اس پر فرشتے رشک کر سکتے ہیں اور خالق کائنات اپنے شاہکار پر ناز کر سکتا ہے۔

میرا پیام آپ کو یہی ہے کہ اپنی سیرت کی تربیت کو اب اپنے ہاتھ میں لیجیے، ضبط نفس اور بے غرض خدمت سے اس کے عناصر کی پرورش کیجیے، اچھی سیرت بنائیے اور اُسے اقدارِ عالیہ مطلقہ کا خادم بنا کر شخصیت اخلاق، یعنی بندۂ مومن اور مردِ مجاہد کے مرتبۂ بلند پر پہنچائیے۔ یہ کام بڑا دشوار ہے اور عمر بھر کا کام ہے مگر اسی کام کے کرنے کے لیے ہی تو زندگی عطا ہوئی ہے، یہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کیسے انجام پائے گا، اس میں تو زندگی ہی کھپانی چاہیے۔

جو جان دے کے پائیں تو فوزِ عظیم ہو
وہ چیز مانگتے ہیں تن آسانیوں میں ہم

تن آسانی چھوڑیے اور اس کام میں لگ جائیے۔

خدا حافظ

ذاکر حسین

ماں

ماسٹر حمید دلّی شہر میں بارہ ٹوٹی پر ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ ان کا گھر مئو رشید آباد میں ایک محلّہ پہاڑی ہے، وہاں تھا۔ ان کے باپ بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حمید کی تعلیم پہلے تو محلّے کی مسجد میں ہوئی۔ تھوڑے دن مُلّا جیون کے مکتب میں انھوں نے پڑھا۔ پھر باپ نے تحصیل کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ حمید اردو مڈل کا امتحان دینے والا تھا کہ بستی میں طاعون کی ایسی وبا پھیلی کہ گھر گھر ماتم تھا۔ اس وبا میں حمید کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حمید کی ماں کے پاس کفن دفن کے بعد کل ستائیس روپئے بچے۔ حمید مڈل کے امتحان میں پاس ہو گیا۔ اب اسے انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ حمید نے مڈل کے امتحان کے لیے ساری دنیا کا جغرافیہ یاد کر ڈالا مگر عجیب بات ہے جب اس نے سوچا کہ کس شہر میں جا کر انگریزی پڑھوں تو بس ایک دلّی کا خیال ذہن میں آیا۔ شاید اس لیے کہ بچپن میں کہانیوں میں دلی شہر کا ذکر سنا تھا یا اس لیے کہ اس محلے کے ایک صاحب دلی میں پولیس میں نوکر تھے اور ہر برس دو برس بعد گھر جایا کرتے تھے۔ حمید نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ دلّی کیسا شہر ہے تو انھوں نے کچھ مسکرا کر بوجھ بجھکڑ کی طرح کہا تھا
”میاں لڑکے تم ان چیزوں کو کیا سمجھو، دلی بڑا گھٹا ہوا شہر ہے۔“
خیر تو حمید کے نزدیک دلّی ہی ایک شہر تھا جہاں جا کر یہ انگریزی مدرسے

میں پڑھ سکتا تھا۔ ماں سے پندرہ روپے لیے اور دلی پہونچا۔ اس گنجے ہوئے شہر میں گھنٹوں گھومنے کے بعد یہ گلی قاسم جان میں اپنے پڑوسی نصر اللہ خاں کانسٹبل کے گھر پہونچا۔ نصر اللہ خاں نے جو حمید کے باپ کو اچھی طرح جانتے تھے، حمید کی بڑی خاطر کی اور اپنے چھوٹے سے مکان کے دروازے میں اس کے لیے ایک کھٹولا ڈال دیا۔ حمید اب یہیں رہنے لگا۔ ایک مدرسے میں نام بھی لکھ گیا اور تین سال میں یہ دسویں درجے تک پہونچ گیا۔ اس زمانے میں حمید نے اپنی جماعت کے ایک لڑکے کو جو حساب میں کمزور تھا، حساب پڑھانا شروع کر دیا۔ اس لڑکے کا باپ حمید کو سات روپے مہینہ دیا کرتا تھا۔ حمید نے نصر اللہ خاں سے کہا کہ اب میرے پاس دام ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں بھٹیارے کے ہاں روٹی کھالیا کروں۔ نصر اللہ خاں نے کچھ اس طرح کہا "صاحبزادے کچھ بے وقوف ہوئے ہو۔" حمید کی پھر ہمت نہ پڑی کہ کچھ کہے۔

دس مہینے میں حمید نے ستّر روپے تو دلی میں کمائے اور جو پندرہ ماں سے لے کر چلا تھا اس میں سے بھی دس باقی تھے۔ ایک دفعہ ماں نے اور دو روپے کا منی آڈر بھیجا تھا، کل ہوئے بیاسی روپے۔ مدرسے میں سردیوں کی چھٹی تھی نصر اللہ خاں نے بھی رخصت لی اور وطن کا قصد کیا تو حمید کو ساتھ لیتے گئے۔

اس زمانے میں حمید کی ماں کے پاس بس اپنے شوہر کے وقت کے بارہ روپے تھے اور آنگن والا کٹھل کا پیڑ جو ہر سال پچیس تیس روپے میں بک جاتا تھا۔ مگر جب حمید گھر پہونچا ہے تو ماں نے ایک عزیز کے ہاں اس کی شادی کا سارا بندوبست کر رکھا تھا۔ شادی جیسے تیسے ہو گئی۔ شادی کے ساتویں روز حمید دہلی واپس چلا آیا۔ یہاں آکر امتحان کی تیاری میں لگ گیا۔ مارچ میں امتحان ہوا اور یہ دوسرے درجے میں پاس ہو گیا۔ اب نوکری کی فکر ہوئی۔ بہت دن اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد ایک مدرسے میں عیوضی پر کام کرنے کا موقع ملا۔ حمید آدمی تھا محنتی، اس کا صدر مدرس اس کے کام سے بہت خوش ہوا اور اس نے ایک پکی جگہ دلوا دی۔

حمید کو اب بیس روپے مہینہ ملتے تھے۔ اس نے پھر ہمت کر کے نصر اللہ

خاں سے کہا کہ "چچا، اگر اجازت دیں تو میں الگ کوئی کوٹھری لے لوں"، نصراللہ خاں نے کہا "اچھا میاں۔ تمہاری یہی رائے ہے تو لے لو۔" اور کچھ دیر کے بعد بولے "میں خود تمہیں سستا سا مکان ڈھونڈھ دوں گا جس میں زنانہ بھی ہو۔" حمید خود بھی سوچ رہا تھا کہ اب اپنی بیوی کو مئو سے جا کر لے آئے۔ نصراللہ خاں کی بھی رائے معلوم ہوئی تو تین روپئے ماہوار کا ایک چھوٹا سا بے آنگن کا گھر ملتے ہی یہ تین دن کی رخصت لے کر گھر گیا اور اپنی بیوی کو ساتھ لے آیا۔ غریب ماں پھر اکیلی رہ گئی۔

بیوی کو دہلی لائے سات برس ہو گئے۔ اس زمانے میں حمید کے ہاں تین لڑکے ہوئے اور ایک لڑکی جس میں سے دو لڑکے مر گئے۔ بیوی بھی بہت بیمار رہی۔ ایک دفعہ خود اسے بھی لو لگ گئی تو کوئی تیرہ چودہ دن چارپائی پر پڑا رہا۔ ادھر مدرسے میں بھی کام بڑھتا گیا۔ تنخواہ اب اس کی تیس روپئے تھی اور دس روپئے مہینے پر ایک لڑکے کو اس کے گھر پر بھی پڑھایا کرتا تھا۔ مگر دلی کا خرچ، بال بچوں کا ساتھ۔ غریب حمید کے پاس بچتا بچاتا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے ماں کے خط پر خط آتے تھے۔ خود بھی اس کا جی بہت چاہتا تھا مگر گھر جانے کی نوبت نہ آتی۔

ماسٹر حمید کا قاعدہ تھا کہ صبح محلے کی مسجد میں نماز پڑھی اور اپنے دروازے میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر آدھا پارہ قرآن مجید کا پڑھا۔ پھر اور کوئی کام کیا۔ تقریباً روز جب یہ نماز پڑھ کر لوٹتے تو ایک ستر برس کی بوڑھی، سفید بالوں اور جھکی کمر والی دھوبن "جنگیا" راستے میں اپنی لادی لیے گھاٹ کو جاتی ملتی تھی۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ کوئی سات آٹھ دن سے جنگیا نہ ملی۔ کوئی ایسی بات نہ تھی مگر آٹھویں دن جب ماسٹر حمید صبح صبح مدرسے جانے کے لیے نکلے تو کونے والے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے نہ رہا گیا اور انھوں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھ کر ایک لڑکے سے جو سامنے تھا پوچھا "اماں لڑکے، جنگیا دھوبن کا کیا حال ہے؟" لڑکے نے کہا "جنگیا تو کل رات کو ایک بجے مر گئی۔ اس کی برادری والے کل جمنا پر اسے پھونک بھی آئے۔"

ماسٹر حمید کا بے چاری جنکیا سے کیا واسطہ! مگر یہ خبر سن کر ان کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ راستے بھر سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتے رہے۔ مدرسے پہونچے تو اداس اداس۔ ساتھیوں نے پوچھا بھی کہ "کہیے مزاج کیسا ہے؟" یہ کہہ کر کہ "کوئی بات نہیں" ٹال دیا۔ گھر آئے تو بھی سست سست، بیوی نے پوچھا تو اسے بھی کچھ نہ بتایا مگر تیسرے روز بقرعید کی چھٹی ہونے والی تھی۔ حمید نے دو دن کی رخصت کی درخواست اور دی اور عین بقرعید کے دن مؤرشید آباد کا ٹکٹ لے ریل میں سوار ہو گیا عید کا دن ریل میں کٹا۔ نہ نماز نہ قربانی۔ مگر دن بھر اس سفید سر کا دھیان لگا رہا جس نے برسوں سوتے وقت اس کے بستر پر جھک کر دعائیں دی تھیں، اس گود کا جس میں برسوں اس نے آرام کیا تھا، اس چہرے کا جسے دیکھ کر اس کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں اور جسے اب کوئی سات برس سے نہ دیکھا تھا۔

حمید کوئی برا بیٹا نہ تھا۔ کوئی یہ بھی نہ سمجھے کہ ماں کی محبت اس کے دل میں نہ تھی یا جورو بچوں میں پڑ کر یہ اپنی ماں کو بھول گیا تھا۔ یہ سال میں تین چار مرتبہ اپنی ماں کو چار چار پانچ پانچ روپئے کا منی آڈر بھیج دیتا تھا اور یہ رقم اس غریب بال بچوں والے مدرس کے لیے بہت تھی۔ گھر ماں کو خط لکھتا تھا تو بچوں کے ہاتھ میں قلم دے کر خط پر کچھ نہ کچھ نشان دادی کے لیے کرا دیتا۔ اس کی بیوی نے بھی کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ بھی برابر اپنے ہاتھ سے خط میں سلام لکھتی تھی۔ ماں کا خط بھی تقریباً ہر مہینے آ جاتا تھا۔ اس میں بستی کی، اِدھر اُدھر کی خبریں ہوتیں اور ہمیشہ یہ سوال کہ بیٹا گھر کب آئے گا۔ ماں یہ خط ایک درزن سے لکھوایا کرتی تھی۔ اس کی لکھائی ایسے کیڑے مکوڑوں کی سی ہوتی کہ خط کا بہت سا حصہ مشکل سے پڑھا جاتا مگر یہ سوال ہمیشہ بہت صاف صاف کارڈ پر لکھا ہوتا تھا۔ اس کا جواب ہر بار حمید بھی یہی لکھ دیتا کہ "انشاء اللہ اگلے آموں کے موسم میں"۔ مگر ہر سال آموں کا موسم گزر جاتا تھا اور ماں کو بیٹے کی شکل دیکھنی نہ نصیب ہوتی تھی۔ حمید چاہتا تھا کہ سارے کنبے کو ساتھ لے کر جائے۔ پھر اتنے دن سے نوکر تھا، ماں کے لیے اور دوسرے عزیزوں اور پڑوسیوں کے لیے دہلی کے تحفے بھی لے جائے

اوران سب کے لیے کبھی دام نہ ہو پائے۔ سات برس ارادے ہی ارادے میں کٹ گئے۔ مگر جنکیا کی موت کی خبر نے نہ جانے حمید کے دل پر کیا اثر کیا کہ یہ اکیلا چل ہی کھڑا ہوا۔

ہاں تو بقر عید کے دن مغرب سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے ماسٹر حمید مئورشید آباد پہونچے۔ خوب زور کی بارش ہو رہی تھی۔ ماسٹر صاحب کے پاس بس ایک چھتری تھی، کچھ اور سامان تو ساتھ تھا نہیں۔ چھتری لگا یوں ہی پیدل سیدھے گھر گئے۔ مئورشید آباد میں لوگ برسات کے پانی کی نکاسی کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھتے۔ اس لیے بارش میں اکثر راستے بھی پانی سے بھر جاتے ہیں۔ ماسٹر حمید ایک جگہ پھسل کر گرے بھی، کئی جگہ تقریباً گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزرنا پڑا۔ خیر جیسے تیسے یہ اپنے گھر پہونچے۔ گھر کا دروازہ بند تھا انھوں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ کوئی نہ بولا۔ پھر زور سے کھٹکھٹائی۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ چھتری نیچے رکھ کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ خوب ٹھوکا اور دو ایک دفعہ بے ساختہ زور سے "اماں، اماں" بھی ماسٹر حمید کے منھ سے نکل گیا تو ایک کوٹھری کے اندر سے کسی نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "یہ کون ہے اماں والا یہاں کسی کی اماں نہیں رہتی۔" ماسٹر صاحب بولے "ارے بھائی حمید کی ماں کا گھر یہی تو ہے نا"، تو ایک موٹا سا آدمی بس ایک دھوتی باندھے، آنکھیں ملتا اور ایک ہاتھ میں چھتری کی جگہ سوپ لیے پانی سے اپنا بچاؤ کرتا دروازے پر آیا۔ یہ عوض قصائی کا بیٹا لچھو تھا جو بقر عید کے دن کی کلیجی اور دل گردوں کے کباب کھا کر، ہضم کرنے کے لیے سو رہا تھا۔ اس نے کوئی چار برس ہوئے حمید کی ماں سے یہ مکان خرید لیا تھا۔ اس نے بس ایک دو جملوں میں یہ سب روداد حمید سے کہہ دی اور بتایا کہ تمہاری ماں اب وہ نواسی درزن کا جو گھر کونے میں ہے، اس میں رہتی ہے۔

لچھو نے تو یہ کہہ کر دروازہ بند کیا اور جا کر پھر اپنی چارپائی پر پڑ رہا۔ ماسٹر حمید کے ایک دو منٹ تک تو قدم ہی نہ اٹھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے دل میں تیر مارا اور کام تمام کر دیا۔ مکان بک گیا؟ اور مجھے خبر تک نہ ہوئی؟

یا اللہ کیا ماں پر اتنی تنگی تھی؟ میں تو سمجھا تھا کچھ ابا نے چھوڑا تھا، کچھ میں بھیج دیتا تھا، کچھ آمدنی کٹہل کے پیڑ سے ہو جاتی ہوگی اور کام چلتا ہوگا مگر یہ تو اپنی جھونپڑی بھی پرائے ہاتھوں بک گئی۔ یہی سوچتے سوچتے جب سر اٹھایا تو نواسی درزن کے مکان کے سامنے پہونچ گیا تھا۔ اس نے زنجیر ہلانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھ بھاری پڑ گیا ہے۔ خیر زنجیر کھنکھٹائی۔ نواسی خود وہیں پاس بیٹھی کچھ سی رہی تھی، دروازے پر آئی اور حمید کو پہچان گئی۔ اس نے نہ کچھ کہا نہ سُنا۔ چلاتی ہوئی سیدھی اندر گئی کہ "حمید کی ماں، حمید کی ماں، حمید آگیا"۔

حمید کی ماں سے کوئی سال بھر سے اٹھا بیٹھا بھی مشکل سے جاتا تھا۔ مگر یہ خبر سن کر نہ جانے کہاں کی طاقت آگئی کہ جھٹ چارپائی سے کود کر دروازے کو دوڑی، حمید کو لپٹا لیا اور زار زار رونے لگی۔ حمید کی ماں کے بدن میں بس ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ اور نہ جانے آدمی بوڑھا ہوتے ہوتے گھِس جاتا ہے یا کیا کہ یہ بالکل بچوں کی طرح ذرا سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہاں سر کے بال سفید تھے جیسے براق۔ گردن پر سر کا بوجھ اٹھانا بھی مشکل تھا اور سفید سر برابر ہلے جاتا تھا۔ نہ جانے کمزوری سے نہ جانے محبت کی زیادتی سے، سارے بدن میں رعشہ تھا۔ کئی منٹ تک یہ حال رہا، نہ ماں نے کچھ کہا نہ بیٹے نے۔ آخر اس سکوت کو ماں نے ہی توڑا اور کہا "بیٹا کالے کوسوں سے آیا ہے۔ پانی میں شرابور، ذرا بیٹھ جا تو چائے بنا لاؤں"۔ حمید کی زبان سے اس کے جواب میں یہ نکلا "اماں تم نے گھر بیچ ڈالا، مجھے خبر تو کی ہوتی"۔ اماں نے کہا "بیٹا خبر کرنے سے کیا فائدہ ہوتا؟ تجھے اور فکریں کیا کم ہیں؟ اور یہ بے چاری نواسی، اللہ بھلا کرے، بہت خیال کرتی ہے، مجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ بیٹا تو آگیا، میری تو زندگی ہو گئی"۔

حمید نے اب ذرا نظر اٹھا کر مکان کو دیکھا تو سامنے ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ اس میں نواسی کے دو بچے ایک جھنگلی چارپائی پر پڑے سو رہے تھے۔ ایک الگ کونے میں کھیل رہا تھا اور ایک چلا چلا کر رو رہا تھا۔

نواسی اسے چپ کر کے چولہے میں آگ سلگانے لگی تو حمید نے دیکھا کہ بے چاری کا کرتا پیٹھ پر بالکل پھٹا ہوا ہے۔ کپڑے دھلے ہوئے صاف مزدور

تھے۔ کیوں نہ ہوتے عید کا دن تھا۔ حمید نے ماں سے پوچھا" اماں کیا تم بھی یہیں سوتی ہو؟"

ماں نے کہا" نہیں بیٹا میں ادھر کی دوسری کوٹھری میں رہتی ہوں یہاں تو نواسی سوتی ہے جو تمہیں خط لکھا کرتی ہے۔"

"اماں کیا تم اب بھی کچھ کام کرتی ہو۔ اب تو تمہارے ہاتھ تھک جاتے ہوں گے۔"

"نہیں بیٹا" ماں نے کہا" ہاتھ تو ابھی تک کام دیتے ہیں۔ مگر کوئی ڈیڑھ سال سے آنکھیں بے کار ہیں، نگاہ نہیں جمتی۔"

حمید چلایا" آنکھیں؟ اماں تو کیا تم مجھے بھی نہیں دیکھ سکتیں؟"

ماں نے حمید کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر گالوں پر، اس کے سر کو چھاتی سے لگایا۔ منہ پر کچھ مسکراہٹ سی آئی اور کہا" بیٹا تجھے تو دیکھ سکتی ہوں اللہ کا شکر ہے۔ سورج نکلتا ہے اسے بھی دیکھ سکتی ہوں۔ گھر بھی دیکھ لیتی ہوں مگر اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں بیٹا تیرا سب سے چھوٹا ننھا اب کتنے دنوں کا ہوا؟"

"اماں تمہاری دعا سے ڈیڑھ برس کا ہے۔" "اچھا تو وہ کرتا ٹوپی اس کے بالکل ٹھیک ہوگا۔" یہ کہہ کر ماں نے ایک میلی سی گٹھری کھولی اور اس میں سے ٹٹول کر ایک لچکا لگا ہوا ریشمی کرتا نکالا اور ایک لال خوبصورت گول ٹوپی جس پر سچی کناری ٹکی ہوئی تھی۔ "اماں کیا تم نے ننھے مجید کے لیے سیا ہے۔" حمید نے پوچھا اور آنکھیں ذرا نم ہوگئی تھیں، ہاتھ سے انھیں پوچھا۔

"نہیں بیٹا" ماں نے کہا" یہ سیے تو تھے میں نے تیری سلمہ کے لیے مگر تم آئے ہی نہیں اور وہ بے چاری چل بسی" ساری گفتگو میں شکایت کا بس یہی ایک لفظ تھا اور بس۔ حمید، ماں کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور نہ جانے کن خیالوں میں گم ہوگیا۔ اسی طرح شاید کوئی دو گھنٹے گزر گئے۔ اس عرصے میں پڑوس کے کمہار کی بیوی نصیبن بھی گھر میں آگئی تھی اور یہ تینوں عورتیں نہ جانے ادھر ادھر کیا کرتی پھرتی تھیں کہ کوئی آٹھ بجے حمید کی ماں نے آکر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا" بیٹا آج تو، تو میرے ساتھ روٹی کھائے گا۔"

حمید جو سوگیا تھا چونک پڑا اور کہا "اماں اور نہیں تو کیا"۔ اس کا خیال تھا کہ ماں جب اس غربت کی حالت میں دن کاٹ رہی ہے تو جو جوار کی روٹی اور کچھ دال دلیا ہوگا مگر وہاں تو ایسے ٹھاٹ کا دستر خوان چنا ہوا تھا کہ حمید حیرت میں رہ گیا۔ کباب تھے، کلیجی تھی، پراٹھے تھے، انڈوں کے چلے تھے، ماش کی دال تھی، مٹو کا تیز تیز سر کا تھا، آم کی چٹنی تھی، ایک پیالے میں دودھ تھا، ایک تشتری میں بالائی اور ایک رکابی میں کٹے ہوئے قلمی آم۔ حمید حیرت میں تھا کہ اس غربت میں یہ سب سامان کہاں سے آیا۔ کچھ سمجھا کہ دوڑ دھوپ تو نصیبن اور نواسی نے کی ہے مگر دام آخر کہاں سے آئے؟ یہ سوچتا جاتا اور نوالا منہ میں دیا جاتا، مگر منہ میں نوالا یہ سوچ کر ایسا معلوم ہوتا کہ نوالا کچھ بڑھ گیا ہے اور منہ چلانے میں دقت ہوتی ہے۔ کھانا ختم ہوا تو حمید کے منہ سے بے ساختہ وہ دعا نکلی جو بچپن میں ماں نے اسے سکھائی تھی اور جو اس نے برسوں سے کھانے کے بعد نہ پڑھی تھی۔

کھانا کھا کر حمید پھر ماں کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نصیبن اور نواسی باہر چلی گئیں اور حمید کی ماں نے قریب آ کر اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹا، برا نہ مانو تو ایک بات کہوں"۔

حمید کا منہ زرد پڑ گیا دل بیٹھنے سا لگا۔ اسے خیال ہوا کہ شاید ماں یہ کہے گی کہ "مجھے اس پرائے گھر سے نکال کر اپنے ساتھ لے چل یا کوئی دوسرا گھر لے دے"۔

یہی خیال دل میں آ رہے تھے مگر حمید نے کہا "اماں ضرور کہو"۔

ماں نے کہا "بیٹا تو لشکر روں کا رہنے والا ہے۔ مدرسے میں نوکر ہے۔ میں پرائے گھر پڑی ہوں۔ تیری کیا خاطر کروں۔ نصیبن کو بھیج کر خاں صاحب کی کوٹھی میں تیرے لیے ایک کمرہ صاف کرایا ہے اور کھاٹ ڈلوا دی ہے مگر جی یہی چاہتا ہے کہ تو میرے ساتھ رہتا۔ کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ کیا تو میرا یہ ارمان پورا کر سکتا ہے میں نے اسی امید پر نصیبن کے ہاں سے یہ چارپائی بھی منگالی ہے"، سامنے چھپر میں ایک چارپائی کھڑی تھی جس کی ادوان غالباً اسی وقت کسی گئی تھی۔

ماں کی یہ بات سُن کر حمید کا جی بھر آیا۔ منہ سے آواز نہ نکلی۔ گھبراہٹ میں ادِھر اُدھر دیکھا اور بولا "اماں یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں تمہارے پاس

نہ رہوں گا تو کہاں جاؤں گا۔"

ماں نے حمید کی پیشانی پر بوسہ دیا اور جھٹ نصیبن سے وہ چارپائی اپنی کوٹھری میں ڈلوادی۔ پھر ایک گٹھری کھولی۔ اس میں سے ایک سفید چادر نکالی جس پر بڑی خوبصورت بیل لگی تھی۔ دو تکیے نکالے۔ صاف صاف غلاف چاروں طرف جھالر۔ اوڑھنے کے لیے ایک باریک چادر۔ تکیوں پر کوئی اچھا سا عطر ملا۔ ایک نیا اگال دان پٹی کے نیچے لاکر رکھا۔ اور بیٹے کی طرف بڑھی اور کہا۔ "بیٹا اب تم سو رہو۔ بہت تھک گئے ہو گے۔"

حمید یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا اور حیرت میں تھا کہ یا اللہ یہ سب کہاں سے آیا۔ آخر نہ رہا گیا۔ اور اس نے پوچھ ہی لیا کہ "اماں یہ کھانے اور یہ سارا سامان کہاں سے آیا۔"

اماں بولی "بیٹا اب مٹو بھی لشکر ہی ہے۔ اللہ رکھے سب چیز ملتی ہے اور کھانا سو آج تو بقرعید کا دن تھا۔ گوشت پڑوسیوں کے گھر سے آیا تھا اور چیزیں بھی ادھر ادھر سے کرلیں۔

"مگر اماں یہ چادر، یہ غلاف، یہ جوتیاں، یہ سارا سامان، عطر، مرادآبادی اگال دان، اس کے لیے روپیہ کہاں سے آیا؟"

ماں کی اندھی آنکھوں سے پانی کی دو چار بوندیں ٹپکیں اور اس نے ایسی آواز میں جس نے نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبت کا کہا "بیٹا تو اور یہ پوچھتا ہے! ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹا ہے۔ سات برس میں یہ تیاری کر پائی ہوں ـ بیٹا، سات برس میں!"

ماں کی اس بات کو سن کر خاموشی کے فرشتے نے اس چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے پر پھیلا دیئے۔ پھر رات بھر کسی نے کسی سے کچھ بات نہ کی۔

ذاکر حسین

اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم

ایک لکڑ ہارا تھا۔ جنگل میں جاکر روز لکڑیاں کاٹتا اور شہر میں جاکر شام کو بیچ دیتا۔ ایک دن اس خیال سے کہ آس پاس سے تو سب لکڑہارے لکڑی کاٹ لے جاتے ہیں، سوکھی لکڑی آسانی سے ملتی نہیں، یہ دور جنگل کے اندر چلا گیا۔ سردی کا موسم تھا۔ کٹکٹی کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے۔ اس کی انگلیاں بالکل سُن ہوئی جاتی تھیں۔ یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلہاڑی رکھ دیتا اور دونوں ہاتھ منھ کے پاس لے جاکر خوب زور سے ان میں پھونک مارتا کہ گرم ہو جائیں۔

جنگل میں نہ معلوم کس کس قسم کی مخلوق رہتی ہے۔ سنا ہے اس میں چھوٹے چھوٹے سے بالشت بھر کے آدمی بھی ہوتے ہیں۔ ان کی داڑھی مونچھ سب کچھ ہوتی ہے۔ مگر ہوتے ہیں بس مینخ ہی سے۔ ہم تم جیسا کوئی آدمی ان کی بستی میں چلا جائے تو اُسے بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں کہ دیکھیں یہ کرتا کیا ہے۔ لیکن یہ ہم لوگوں سے ذرا اچھے ہوتے ہیں کہ ان کے لڑکے کسی پردیسی کو ستاتے نہیں نہ ان پر تالیاں بجاتے ہیں۔ نہ پتھر پھینکتے ہیں۔ خود ہمارے یہاں بھی اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔ لیکن ان کے یہاں تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔

خیر۔ لکڑ ہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ تو ایک میاں بالشتیے بھی کہیں بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ میاں بالشتیے نے جو دیکھا کہ یہ بار بار ہاتھ

میں کچھ پھونکتا ہے، تو سوچنے لگے کہ یہ کیا بات ہے۔ دیر تک اپنی بتاشا سی ٹھوڑی اپنے ننھے سے ہاتھ پر دھرے بیٹھے رہے، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو یہ اپنی جگہ سے اٹھے، اور کچھ دور چل کر پھر لوٹ آئے کہ نہ معلوم کہیں پوچھنے سے یہ آدمی برا نہ مانے۔ مگر پھر نہ رہا گیا۔ آخر کو ٹھمک ٹھمک لکڑہارے کے پاس گئے اور کہا۔

"سلام بھائی، بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھیں۔"

لکڑہارے کو یہ ذرا سا انگوٹھے برابر آدمی دیکھ کر تعجب بھی ہوا، ہنسی بھی آئی مگر اس نے ہنسی کو روک کر کہا۔

"ہاں ہاں بھئی ضرور پوچھو۔"

"بس یہ پوچھتا ہوں کہ تم منھ سے ہاتھوں میں پھونک سی کیوں مارتے ہو؟"

لکڑہارے نے جواب دیا۔ "سردی بہت ہے۔ ہاتھ ٹھٹھرے جاتے ہیں۔ میں منھ سے پھونک کر انھیں ذرا گرما لیتا ہوں، پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں پھر پھونک لیتا ہوں۔"

میاں بالشتیے نے اپنا سپاری جیسا سر ہلا دیا اور کہا "اچھا اچھا یہ بات ہے۔" یہ کہہ کر بالشتیے میاں وہاں سے کھسک گئے مگر رہے آس پاس ہی اور کہیں سے بیٹھے برابر دیکھا کیے کہ لکڑہارا اور کیا کرتا ہے۔

دوپہر کا وقت آیا۔ لکڑہارے کو کھانا پکانے کی فکر ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے دو پتھر اٹھا کر چولھا بنایا۔ اس کے پاس چھوٹی سی ہانڈی تھی۔ آگ سلگا کر اسے چولھے پر رکھا اور اس میں آلو اُبلنے کے لیے رکھ دیئے۔ گیلی لکڑی تھی اس لیے آگ بار بار ٹھنڈی ہو جاتی تو لکڑہارا منھ سے پھونک کر تیز کر دیتا۔

"ارے" بالشتیے نے دور سے دیکھ کر اپنے جی میں کہا "اب یہ پھر پھونکتا ہے۔ کیا اس کے منھ سے آگ نکلتی ہے؟" لیکن چپ چاپ بیٹھا دیکھا کیا۔ لکڑہارے کو بھوک زیادہ لگی تھی، اس لیے چڑھی ہوئی ہانڈی میں سے ایک آلو جو ابھی پورے طور پر اُبلا بھی نہ تھا، نکال لیا۔ اُسے کھانا چاہا تو وہ ایسا گرم تھا جیسے آگ۔ اس نے مشکل سے اسے اپنی ایک انگلی اور انگوٹھے سے دبا کر توڑا

اور اسے منہ سے فو فو کر کے پھونکنے لگا۔

"ارے،، بالشیتے نے پھر جی میں کہا "یہ پھر پھونکتا ہے۔ اب کیا اس آلو کو پھونک کر جلائے گا"۔ لیکن آلو جلا جلایا کچھ نہیں۔ وہ تو تھوڑی دیر فو فو کر کے لکڑہارے نے اسے اپنے منہ میں رکھ لیا اور غپ غپ کھانے لگا۔ اب تو اس بالشیتے کی حیرانی کا حال نہ پوچھو۔ اس سے پھر نہ رہا گیا اور ٹھمک ٹھمک پھر لکڑہارے کے پاس آیا اور کہا "سلام! بھائی بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھیں"۔

لکڑہارے نے کہا۔ "بُرا کیوں مانوں گا۔ پوچھو۔"

بالشیتے نے کہا "تم نے صبح مجھ سے کہا تھا کہ منہ سے پھونک کر اپنے ہاتھوں کو گرماتا ہوں۔ اب اس آلو کو کیوں پھونکتے تھے۔ یہ تو خود بہت گرم تھا اسے اور گرمانے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں میاں ٹِلّو۔ یہ آلو بہت گرم ہے۔ میں اسے منہ سے پھونک پھونک کر ٹھنڈا کر رہا ہوں"۔

بات تو کچھ ایسی نہ تھی مگر یہ سُن کر میاں بالشیتے کا منہ پیلا پڑ گیا۔ ڈر کے مارے کپ کپ کانپنے لگے۔ برابر پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ لکڑہارے سے ڈر کر کچھ سہم سے گئے تھے۔ ذرا سا آدمی یوں ہی دیکھ کر ہنسی آئے۔ لیکن اس تھر تھر، کپ کپ کی حالت میں دیکھ کر تو ہر کسی کو ہنسی بھی آئے، رنج بھی ہو لکڑہارے کو بھی ہنسی آئی۔ لیکن وہ بھی بھلا مانس تھا۔ اس نے آخر پوچھا کہ "کیوں میاں کیا ہوا، کیا جاڑا بہت لگ رہا ہے"۔ مگر میاں بالشیتے تھے کہ برابر پیچھے ہی ہٹتے چلے گئے۔ اور جب کافی دور ہو گئے تو بولے۔ "یہ نہ جانے کیا بَلا ہے۔ کوئی بھوت ہے یا جن ہے۔ اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم، ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی"۔ اور سچ ہے یہ بات ان میاں بالشیتے کی ننھّی سی کھوپڑی میں آنے کی تھی بھی نہیں۔

فہمیدہ بیگم

ذاکر صاحب کا شعور زبان

ذاکر صاحب عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ نگاہ بلند، خیالات عظیم، فکر و نظر میں گہرائی، مشاہدہ میں باریک بینی اور تیزی، مطالعہ وسیع، کئی علوم و فنون کی معلومات کا مخزن، انسانیت اور وضع داری کا مثالی نمونہ، درویش صفت انسان، صبر وضبط کا پیکر۔ ان کی درویشانہ شان نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگائے۔ سچائی کی رگڑ اور سادگی پسندی نے دوست و دشمن، رشتہ دار ہر ایک کے دل میں جگہ بنائی۔

ان کی رنگا رنگ شخصیت، کہانی نویس، مقرر، مترجم، خطیب، ماہر تعلیم، عمدہ منتظم وغیرہ کے روپ میں جلوہ افروز ہوئی۔ وہ اپنی انھیں جلوہ سامانیوں کے ساتھ علمی، ادبی دنیا میں تقریباً ۵۰ سال تک چمکتے رہے۔ غالباً ان کا پہلا یا دوسرا شائع شدہ مضمون ۱۹۲۰ء کا ہے جو انگریزی میں
کے عنوان سے مارچ یا اگست میں علی گڑھ میگزین جلد ۷ شمارہ نمبر ۱۱-۱۲ میں منظر عام پر آیا۔ مسرور ہاشمی صاحب نے اردو میں ابدیت یا کھلونا کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ذاکر صاحب کی تحریروں، خطبات، مضامین، تقریروں، تراجم اور دیگر تخلیقات کی زبان اور انداز بیان میں جو ہم آہنگی ملتی ہے وہ ان کی ذہنی یکسوئی، فکر و نظر کی استواری کی مظہر ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ اپنے آپ کو حالات کے سپرد نہیں کیا۔ یہی اصل وجہ ہے کہ ان کے قول و عمل

میں تضاد نہیں ملتا بلکہ بہت زیادہ مطابقت ملتی ہے خواہ وہ جامعہ کے استاد کی کرسی پر براجمان ہوں یا وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز گورنر کی حیثیت سے مخاطب ہوں یا نائب صدر ہند اور صدر جمہوریہ مملکت ہند کی اعلا ترین مسند سے تحریریں یا تقریریں پیش کر رہے ہوں۔ ذاکر حسین کی تحریروں و تقریروں کی زبان کا مطالعہ کسی نے پیش کیا ہو میری نظروں سے نہیں گزرا۔ البتہ ان کے ایک آدھ مدح نے ان کی زبان کی دلکشی کو سراہا ضرور ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی نے ابتدائیہ میں تحریر کیا ہے:

"انھوں نے پٹیالہ یونیورسٹی میں گرو گوبند سنگھ جی بھون کے افتتاح کے موقع پر ایک اہم خطبہ دیا تھا۔ قریب سینتالیس برس کے اس عرصہ سے متعلق جو تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں ان کی سیرت کی صلابت اور فکر کی جرأت نمایاں ہے ان اقدار عالیہ کا ذکر بار بار اور مختلف انداز میں ملتا ہے جن کی خدمات کا شوق ان کے دل میں صوفی حسن شاہؒ کی توجہ خاص سے تو جوانی ہی میں پیدا ہو گیا تھا"

(ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں۔ ابتدائیہ صفحہ ۵)

پروفیسر مجیب نے تعلیمی خطبات کے دیباچہ میں ان کی زبان کے بارے میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

"ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہ خطبات نہ جانے کتنی مشکل سے لکھے گئے اور اب کتنے پس و پیش کے بعد شائع کیے جا رہے ہیں۔ آپ اسے یقین نہ کریں گے۔ اور زبان کی روانی اور بیان کی قدرت جو ان خطبات کی ایک نمایاں خوبی ہے خود اس کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھنے میں کوئی دشواری، کوئی تکلف نہ ہوتا۔ پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ یہ کام جو مصنف کی استعداد کو دیکھتے ہوئے کوئی دیر طلب کام نہیں، بہت مشکل سے انجام پا سکا ہے۔ خطبات کی زبان کی روانی قلم کی روانی نہیں ہے۔ بیان کی قدرت وہ نہیں ہے جو ادیب مشق سے حاصل کرتے ہیں، یہ اس طرح

لکھے ہی نہیں گئے جیسے کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ کتاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم اور علم کے ساتھ انسان کو اپنے اندر بند کرلے اور اس لیے ہر کتاب نامکمل رہ جاتی ہے۔ جیسے وہ کپڑا جو پہننے والے کا جسم دیکھے بغیر کاٹا گیا ہو۔ ادبی تصانیف میں زبان کی قینچی اکثر کاٹنے کے قابو میں نہیں رہتی خود اپنے ہنر دکھانے لگتی ہے۔ ان تعلیمی خطبات میں وہ خامی نہیں ہے جو کتاب میں ہوتی ہے اور قدرتی استعداد نے زبان کو اپنے خادم بنا کر ان میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ جو ادیبوں کی تحریر کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان خطبات میں انداز تقریر کا ہے تحریر کا نہیں ان میں کوشش کی گئی ہے کہ قلم اور کاغذ اور کتاب کو درمیان سے ہٹا کر آپ سے براہ راست بات کہی جائے اور اس طرح کہی جائے کہ آپ کے دل کو لگے۔"

(تعلیمی خطبات۔ صفحہ ۹)

اردو زبان کے تلفظ اور عبارت کے بارے میں ہم اردو والوں کی تنگ نظری، تنگ دلی اور کوتاہ خیالی کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملے گی۔ صرف ان خصوصی صفات سے متصف نہ ہونے کے سبب آج انگریزی زبان دنیا کے بڑے حصہ پر راج کر رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اس معاملہ میں کشادہ ذہن، وسیع القلب ہیں لکیر کے فقیر نہیں ہیں بلکہ چینی نما، جاپانی نما، کئی ہندوستانی زبانوں نما، افریقی زبانوں نما۔ اور عربی، ایرانی زبانوں نما۔ انگریزی کو انگریزی زبان سمجھتے ہیں۔ اسے خوشی خوشی گلے لگاتے ہیں۔ اسے وہ ایک بگڑی زبان نہیں سمجھتے۔ اور نہ کوئی دوسری زبان۔ یہ ایک لسانی حقیقت ہے کہ بڑے بڑے خطوں پر پھیلی ہوئی کوئی زبان ہر جگہ تلفظ، املا، سرمایہ الفاظ اور محاوروں کے اعتبار سے سو فی صد یکساں نہیں ہو سکتی۔ زبان کی عظمت اور ترقی کا راز اسی رنگا رنگی میں پوشیدہ ہے مگر اردو والے اس لسانی حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ اور اس راز کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے

اور خود کو تنگ نظری کے خول میں بند رکھنے کے عادی ہیں۔

ذاکر حسین کی دور بین نظر نے اردو والوں بلکہ ہندوستانیوں کی اس کمزوری کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ان کی اس حسن نظر کی داد دینا چاہیئے۔ مرشد نے ۲۶/اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے جو تقریر بچوں کی تربیت کے عنوان سے نشر کی تھی اس میں فرماتے ہیں:۔

"آپ کو یاد نہ ہو اس سے پہلے "بچوں کی تربیت" پر آپ سے دو بار باتیں کر چکا ہوں۔ ریڈیو کا انتظام کچھ ایسا ہے کہ بس آدمی اپنی سناتا ہے دوسرے کی نہیں سنتا۔ مگر ابھی اللہ رکھے ڈاک کا محکمہ سلامت ہے اس لیے یہاں سے پندرہ منٹ باتیں کر کے جائیے تو یہ نہیں کہ بات آئی گئی ہوئی۔ تیسرے ہی دن سے خط آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عجیب عجیب بھانت بھانت کے۔ بہت سے تو جھوٹ موٹ کی تعریف لکھ بھیجتے ہیں۔ بعض کسی چھوٹی سی بات کو مثلاً یہ کہ دو لفظ آپ نے ایسے بول دیئے، جو ان کی سمجھ میں (جس کے لیے کوئی پیمانہ نہیں) نہیں آئے۔ خفا بھی ہوتے ہیں۔ بہت سے لکھتے ہیں کہ اب کی بار یہ بات ضرور کہیئے گا۔ یہ بات ضرور بتائیے گا اور ہاں یہ تک کہ جی چاہے تو ہمارا نام بھی لے لیجیے گا۔ تو جناب سنیئے! حضرت! آپ سے عرض ہے کہ جنھوں نے یہ خط لکھے تھے ان سب کا جواب دینا تو میرے بس کی بات نہیں۔ تعریف کرنے والوں کا شکریہ۔ خفا ہونے والے صاحب کا بھی شکریہ۔ یہ مجھے یقین ہے سمجھیے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان میں سے ایک صاحب تو اس وقت بھی اپنے رسیور کے پاس بیٹھے اس کی ایک گھنڈی کو گھما گھما کر میری آواز کو، کہ پہلے ہی سے بہت اچھی نہیں، اور خراب کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو لفظ ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ کم سے کم بہت زور سے تو ضرور بولا جائے۔ خدا بخشے علی گڑھ کے مشہور استاد مولوی عباس حسین صاحب کو، فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! قرأت کا

فن ختم ہو گیا، ختم۔ میرے استاد مرحوم اس کے آخری جاننے والوں میں تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر "ق" کا صحیح تلفظ مٹکے کے اندر کروں تو مٹکا پھٹ جائے۔ تو جناب بٹن گھمانے والے صاحب! آپ سے گزارش ہے کہ میں تو اپنے دیس کے لوگوں کی سیدھی سادی زبان بولتا ہوں، اس میں ع، ق، کہیں کہیں آجاتا ہے تو اسے حرام نہیں سمجھتا، نہ آپ کو ایسا سمجھنا چاہئے۔ میرا تو تلفظ بھی ہندی ہے۔ مگر پھر بھی کسی "ق" کا تلفظ کچھ بھی صحیح ہو گیا تو آپ کے سٹ کا بلب تو پھٹ ہی جائے گا۔ بس بات سنیئے اور ایک ایک لفظ کے پیچھے نہ پڑیں۔ اللہ نے چاہا آپ کی سمجھ میں بھی آجائے گا۔ ہاں! جن صاحبوں نے مشورے بھیجے ہیں ان کا سب سے زیادہ شکریہ ادہ اب سنیں ان کے مشوروں پر بہت کچھ عمل کیا ہے۔ چاہے اس میں وہ حیدرآباد والے صاحب خوش ہوں یا جھانسی والے دوست، بمبئی والے بھائی یا ڈھاکے والے بزرگ کہ ہمارے مشورے پر عمل ہو رہا ہے۔

سچ یہ ہے کہ سب پر ہے اور خود بھی یہی کہنے کا ارادہ تھا۔ کیا؟

(تعلیمی خطبات، صفحات۔ ۸۷، ۸۸)

اس عبارت سے عیاں ہے کہ زبان کے بارے میں ذاکر صاحب کشادہ ذہن رکھتے تھے۔

ذاکر حسین کو انگریزی، جرمنی، عربی اور اردو پر برابر کی مہارت حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ ہو یا تخلیق، خیالات کے اظہار اور انتخاب الفاظ پر قدرت حاصل تھی۔ جس کا بین ثبوت ان کی تحریروں خصوصاً کہانیاں، خطبے اور نشریئے ہیں۔ یہاں صرف اردو تحریروں کی روشنی میں ان کی زبان دانی کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہر زبان کی طرح اردو بھی اپنی خاص لسانی، صوتی، صرفی، نحوی اور ادبی خصوصیات کی حامل ہے۔ چونکہ اس زبان کا رسم الخط ہندوستان میں ہی ارتقاء پذیر ہوا۔ زبان کے تشکیلی دور کی منزلیں طے ہوئیں۔ صرف اس کا تحریری ذریعہ کا پس منظر عربی، فارسی رسم الخط ہے۔ عربی میں ۲۹ حروف ہیں اور فارسی میں۔

شاید ہندوستانی زبانوں میں کوزی آوازوں کو خاص دخل ہے جب کہ یہ آوازیں عربی فارسی میں نہیں ہیں۔ اردو ہندوستانی زبان ہونے کی وجہ سے اپنے صوتیاتی نظام میں کثیر تعداد میں کوزی آوازوں کو اس طرح شامل رکھتی ہے جیسے کہ کوئی بھی جدید ہندوستانی زبان۔ عام طور پر اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے بعض بڑے بڑے اردوداں اس بات سے غافل ہیں مگر ذاکر صاحب کا لسانی شعور اس حقیقت سے آگاہ تھا جس کا اظہار انھوں نے کئی موقعوں پر کئی جگہ ضرور کیا ہوگا۔ علمی، ادبی گفتگو کے درمیان، بات چیت کے دوران۔ اردو زبان کی صرفی نحوی خصوصیات اور صوتیاتی نظام کے بارے میں ذاکر حسین کی یہ تحریریں غور طلب ہیں جو ان کے لسانی، صوتی شعور کی غماز ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں جو اردو کانفرنس ہوئی تھی اس کے خطبۂ صدارت سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "کہتے ہیں کہ اردو بدیسی زبان ہے۔ لیکن کیا کیجئے کہ تاریخی اور ادبی شواہد پکار پکار کر کہتے ہیں کہ نہ یہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اس میں افعال اور حروف اور عام مفردات کے اسم سب ہندوی ہیں۔ صوتی اعتبار سے دیکھیے تو اس کا ایران و عرب سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس میں آوازوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستانی ہے اور تو اور رسم خط تک میں کہ اس کے غیر ملکی ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ درجنوں ہندوستانی زبانیں ہیں جیسے ڑ، ڈ، ٹ، ڈھ، ڑھ، ٹھ، بھ، پھ، چھ، کھ، گھ، وغیرہ جنھیں کون غیر ملکی بتا سکتا ہے؟ مگر کہنے والوں کا منھ کون بند کرے؟
>
> (ذاکر صاحب اپنے آئینۂ لفظ و معنیٰ میں، صفحہ۔ ۱۵۸)

ذاکر حسین نے ہندی اور اردو والوں سے بار بار درخواست کی ہے کہ وہ زبان کے معاملہ میں نرم اور لچک دار رویہ اختیار کریں۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ اردو کی ترقی میں ہندی کی بھی ترقی کا راز مضمر ہے اور کسی بھی سطح پر اردو ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ اردو بھی دیگر جدید ہندوستانی زبانوں کی طرح خالص ہندوستانی زبان ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے

بلکہ ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کی زبان ہے۔ جس میں ہر مذہب کے ہندوستانی شامل ہیں۔ ان کے اس نظریہ کی وضاحت میں انھیں کا ایک بیان ملاحظ فرمائیں جو اردو نمائش اور کتب خانہ ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ کے افتتاح کے موقع پر دیئے گئے خطبے کا حصہ ہے۔ وہ اس وقت ریاست بہار کے گورنر تھے۔

"اردو تو خاص مسلمانوں کی زبان ہے بھی نہیں۔
کوئی فہرست نہیں بنائی ہے۔ جو نام اس وقت یاد آگئے وہ لیتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ تربھون ناتھ ہجر۔ جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار پروفیسر رام چندر، سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برج موہن دتاتریہ، نسیم چکبست، سرور جہاں آبادی، فراق گورکھپوری، منشی نول کشور، لالہ سری رام صاحب خمخانہ جاوید، منوہر لال زتشی، دیا نرائن نگم کی زبان کو کوئی مسلمان کی زبان کیسے بتاتا ہے اور اس زبان پر مذہبی تنگ دلی اور فرقہ پرستی کی تہمت کیسے باندھ سکتا ہے؟ جس زبان میں آریہ سماج کا تمام تر مذہبی لٹریچر موجود ہو جس سے عیسائیوں نے اپنے مذہب کی خدمت کا پورا پورا کام لیا ہو، اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر تنگ دلی اور تنگ نظری کی پرورش کرنا کون سی دیانت ہے، کون سی فراست ہے؟ پھر اردو نہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ ذرا بھی دیکھیے تو قدم قدم پر اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس کے افعال اور حروف اور عام ضرورت کے اسم سب ہندی ہیں۔ اس کی آوازوں پر کان دھریئے تو ایران اور عرب سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ آوازوں کی بہت بڑی تعداد خالص ہندوستانی ہے۔ عربی لفظوں میں جو سامی آوازیں آئی ہیں انھیں بھی بول چال میں ہندیا لیا ہے۔ لکھائی میں بھی اس کے پردیسی ہونے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ درحقیقت ہندوستانی آوازوں کے ظاہر کرنے کا اس میں سامان ہے اس میں ڈ، ڑ، ٹ، ٹھ، ڈھ، بھ، پھ، جھ، چھ اور کھ کیا پردیسی آوازوں کے نشان ہیں؟" (ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں، صفحہ ۱۹۲)

مذکورہ اقتباس میں ذاکر حسین نے ہندی اردو کے رشتہ کے ساتھ ساتھ اردو ہندی کے لسانی، صوتی، صرفی، نحوی یکسانیت کا جو ذکر کیا ہے اردو حروف تہجی کی نئی نئی شکلوں کی ضرورت جو خالص ہندوستانی آوازوں کی سلیقہ سے ادائیگی کے لیے ڈھال لیے گئے تھے۔ ان کے اردو زبان پر گہری نظر کا بین ثبوت ہے ایسی نظر تو اردو ادب کے ماہرین کے پاس بھی کم ملتی ہے۔ ان خصوصیات کا شعور ماہر لسانیات اور ماہر زبان کے ہاں ہی ملتا ہے۔

اردو زبان سے ان کو بے حد محبت تھی بلکہ جذباتی حد تک اس زبان سے لگاؤ تھا۔ اور اردو کے بارے میں ان کا یہ خیال تاریخی حقیقت ہے کہ :

"اردو نہ کسی فرقے کی زبان ہے، نہ کسی مذہب کی زبان ہے، نہ کسی حکومت کی زبردستی چلائی ہوئی زبان ہے، نہ کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان ہے۔ یہ تو جنتا کی بولی ہے! لوگوں کی زبان ہے! آپس کے میل جول کا پھل ہے، میلوں ٹھیلوں، بازاروں ہنڈیوں کی ریل پیل میں رچی ہوئی زبان ہے۔ زندگی کے بیوہار کے کانٹوں میں تلی ہوئی زبان ہے۔ چیزوں کے لین دین کے ساتھ وچاروں کے لین دین کا نتیجہ ہے۔ یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو اپنے پریم سے چھلکتے ہوئے دل کی بات اوروں تک پہنچانے کے لیے بے کل تھے اور جن کی من موہن باتیں سننے کو عام لوگ کان لگائے رہتے تھے اسی لیے یہ محبت اور پریم کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے، اس کا دل بھی بڑا ہے اس کی جھولی بھی بڑی ہے۔ یہ نئے انداز سے جھجکتی نہیں، نئی بات پر بدکتی نہیں، لفظوں سے گھنیاتی نہیں، وچاروں سے چھوت چھات نہیں کرتی"

(ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں، صفحات ۱۹۱-۱۹۲)

ذاکر صاحب ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ اردو کے مطالعے سے ہندی والے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور سہل زبان کے عوام میں رواج سے دونوں زبان والوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ان کی زبانی سنیے۔

"سارے دیس میں جو جگہ جگہ یہ ڈر ہے، غلط ڈر کہ ہندی اپنے سیاسی اثر سے دوسری زبانوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے یا پہنچانا چاہتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے مٹ جائے گا اور ذہنی تعاون کی ہزار راہیں کھل جائیں گی اور جب آپ ہمدردی سے اس مسئلہ کو دیکھیں گے تو خود آپ پر بہت سی باتیں روشن ہو جائیں گی۔ آپ دیکھیں گے کہ اردو ادب کا مطالعہ خود ہندی والوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اور اردو کی ترقی کسی طرح ہندی کی ترقی میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی۔ آپ پر روشن ہو گا کہ اردو ہندی کے جھگڑے نے ان کے باہمی فرق کو جان جان کر بڑھانے کی جو کوشش کرائی ہے اس سے دونوں زبانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اردو کو کم ہندی کو زیادہ پیچھے دیکھنے کی عادت پیدا کی ہے، آگے سے غافل کیا ہے۔ زبان کو ودوانوں اور عالموں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں کی چیز سمجھ کر بہت سا کام ہوا ہے۔ اور ان کروڑوں آدمیوں کو بھلا دیا گیا ہے جن کے ذہنوں کو روشن کرنا ادیبوں کا فرض ہے۔"

(ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنیٰ میں۔ صفحہ ۱۶۶)

اردو زبان کے معاملہ میں یہ کہیں ادیبوں، معلموں سے مخاطب ہیں تو کہیں اداروں کی توجہ اس طرف مبذول کرا رہے ہیں اور کبھی اس کی لسانی و صوتی خصوصیات کے دلیلوں کے ذریعہ اس کے ہندوستانی زبان ہونے کے شواہد پیش کر رہے ہیں۔ اردو ہندی والوں کے دلوں کو جوڑنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں۔ ذاکر صاحب کا یہ لسانی شعور قابل تعریف ہے اور ان کے صحتمند رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ وہ دل سے یہی چاہتے تھے کہ ہر ہندوستانی خوش رہے اور اپنی اپنی ذمہ داری کو نہ خوب سمجھے بلکہ اسے سچی لگن کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرے۔ ہندی اردو کے تعلق سے ان کے جو بھی نظریات اور خیالات ہیں وہ آج بھی سو فیصد قابل عمل ہیں جس سے ہندوستان میں ایکتا بھائی چارہ، دوستی، ہم آہنگی اور میل ملاپ کا خوشگوار ماحول پروان چڑھ سکتا ہے جس کی ہمیں آج سخت ضرورت ہے

محمد یعقوب عامر

ڈاکٹر ذاکر حسین : ترجمہ کے بڑے فنکار

اردو کے صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے ذاکر صاحب کی ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ صاحب اسلوب انشا پرداز ہیں جو کہ ان کے تعلیمی خطبات سے ظاہر ہے۔ وہ بچوں کے ادیب ہیں جیسا کہ ان کی تصنیف "ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں" پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بہترین ترجمہ نگار بھی ہیں۔ ان کی بہت سی ترجمہ شدہ کتابوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔

موٹے طور پر درج ذیل تراجم دستیاب ہیں۔

۱۔ بابی مذہب۔ (تلخیص و ترجمہ) پروفیسر براؤن کے مضمون کا ۱۹۱۵ء

۲۔ جمہوریۂ فلاطون کا ایک ورق۔ افلاطون کی کتاب ری پبلک کے ترجمے کے چند ٹکڑے۔ ۱۹۲۰ء

۳۔ بزم ہستی میں ضروری ہے کوئی روح رواں۔

چسٹرٹن کے مضمون "ہوا اور درخت" کا ترجمہ

۴۔ مبادی معاشیات۔ ایڈون کینن کی کتاب "المینٹری پالٹکل اکنامی" کا اردو ترجمہ۔ سال اشاعت ۱۹۲۲ء

۵۔ راہِ عمل۔ برٹرینڈ رسل کی کتاب "ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو" کے آخری باب سے بعض اقتباسات کا ترجمہ۔ ۱۹۲۳ء

۶۔ تعلیم اور آزادی فکر۔ رسل کی ایک اور کتاب کے اقتباسات کا ترجمہ۔ ۱۹۲۳ء

۷۔ معاشیاتِ قومی۔ فریڈریشن لسٹ کی کتاب جس کا جرمن نام ہے۔

"DAS NATURLICHE SYSTEM DER POLISTICHEN OKONO MIC." ۱۹۲۶ء

۸۔ ریاست۔ افلاطون کی کتاب ری پبلک کا مکمل ترجمہ۔ اشاعت ثانی ۱۹۶۰ء

پہلی اشاعت ۱۹۳۲ء

مذکورہ بالا مضامین و کتب کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے ذہن و فکر کے میدان کتنے مختلف، وسیع اور گوناگوں تھے۔ وہ ادب، فلسفہ، تعلیم، تہذیب، اور سماجیات و سیاسیات میں برابر کی دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان مختلف میدانوں میں وہ سرسری واقفیت نہیں رکھتے بلکہ ان علوم میں انہیں پوری دستگاہ اور گہرا درک حاصل ہے۔ ان کی دوسری تحریروں میں اُن علوم میں ان کی جزرسی، کشادہ نظری اور گہری بصیرت جگہ جگہ ظاہر ہوتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کے ترجموں کے بارے میں کوئی گفتگو کریں، ان کے ہمعصروں کے تاثرات کا جائزہ لینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اُن کے ہم جماعتوں کا کہنا ہے کہ اُن کے ترجمے قلم برداشتہ ہوتے تھے۔ وہ ایک نشست میں، یا ایک رو میں جب تک یہ موڈ طاری رہتا تھا، برابر لکھتے رہتے تھے۔ مگر جب ان کا قلم رُک جاتا تھا پھر اس طرف جلدی راغب نہ ہوتے تھے۔ لہٰذا اُن کے کئی ترجمے نامکمل رہ گئے ہیں۔ وہ زیادہ تر طبیعت کی آمد کے زور پر قلم کو حرکت میں لاتے تھے۔ فرمائشی مضامین یا سیمیناروں کی چیزوں کی طرف قدرتی التفات نہ کرتے تھے بلکہ مسلسل یاد دہانیوں کے باوجود ٹالتے رہتے تھے۔ جب تاریخ بالکل قریب آجاتی تو لکھنے بیٹھتے اور ایک ہی نشست میں مسلسل و متواتر لکھتے اور کام ختم کر کے اٹھتے۔ رشید احمد صدیقی نے جو زمانہ طالب علمی میں ان کے ہوسٹل کے ساتھی بھی تھے، ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"طالب علمی کے زمانے کی بات ہے۔ میں ذاکر صاحب اور مولانا سہیل ساتھ تھے۔ مولانا شاعری کرتے تھے۔ اور میں گل منزل پر مضامین لکھتا تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ بھی کچھ لکھنا شروع کریں گے۔ بشرطیکہ ان کو مضمون کے دو چار عنوان بتا دیئے جائیں۔ کئی دن تک عنوان کے چکر میں رہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ لائبریری سے PLATO'S REPUBLIC لئے آرہے ہیں۔ فرمایا عنوان نہ بتایئے، آپ لوگوں کی ضد میں ترجمہ کروں گا، چند ہی دنوں میں کافی ترجمہ کر ڈالا...... ایک دن ذاکر صاحب نے مولانا (سُہیل) کو یا مولانا نے ذاکر صاحب کو دھر لیا۔ ترجمہ سنانے کا اہتمام ہوا

.... میں انگریزی پڑھتا جاتا۔ ذاکر صاحب اُس کا اردو ترجمہ سناتے جاتے۔...
.... (مولانا نے) فرمایا: ذاکر، شاد باش۔ شاذری۔ ظالم غضب کرتا ہے، افلاطون کو اردو آتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ کمبخت بیماری نے کہیں کا نہ رکھا، ورنہ میں بھی ایسا ترجمہ کرتا۔

جنوری و فروری ۱۹۲۰ء کے علی گڑھ منتھلی میں ,,جمہوریہ فلاطون کا ایک ورق،، کے نام سے اس ترجمے کے چند ٹکڑے شائع ہوئے تھے۔ اس ترجمے کی متعلق اس پرچے کے مُدیر کی رائے سنیئے۔

,,عرصہ ہوا ذاکر صاحب نے جمہوریہ فلاطون کا اردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس خیال کو ایسا ترک کیا کہ آج تک باوجود مزید یاددہانی اور اصرار کے اس کی طرف توجہ نہ کی (یہ بھی ممدوح کی خصوصیات میں سے ہے جن سے ہم بخوبی واقف ہیں) جس انہماک اور سرگرمی سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ محض اس سے ہو سکتا ہے کہ کم و بیش ایک ماہ میں جمہوریہ کے چار مقالات کا ترجمہ ہو گیا۔

,,اس امر کے ظاہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ ترجمہ بالکل قلم برداشتہ ہوا ہے۔ حتٰی کہ نظرِ ثانی بھی نہیں کی گئی ہے۔ لیکن لطف و کمال یہ ہے کہ لفظی ترجمہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شروع سے آخر تک قائم ہے۔،،
علی گڑھ میگزین کے مئی جون ۱۹۲۱ء کے شمارے میں ,,بزم ہستی میں ضروری ہے کوئی روحِ رواں،، ترجمے کے بارے میں ایڈیٹر کا نوٹ نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ اس سے ذاکر صاحب کے تخلیقی عمل کا اچھا خاصہ اندازہ ہو جاتا ہے۔ مدیر نے مکالمے کے انداز میں اس کی پُر لطف داستان پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ایڈیٹر اپنے مزاحیہ انداز میں لکھتا ہے۔
جی۔ کے۔ چیسٹرٹن جس کے مضمون ,,ہوا اور درخت،، کا ترجمہ ہم آج پیش کرتے ہیں، انگلستان کے ادبی حلقے میں یکتائے عصر مانا جاتا ہے:........
,,ہمارے اصرار و التجا سے نہیں بلکہ تخویف مجرمانہ سے ذاکر صاحب نے اس مضمون کو اردو کا جامہ پہنایا۔ پچھلے روز نماز جمعہ کے بعد ہمارے پاس پہونچے، پسینے میں تر، پیاس سے بیتاب اور پاؤں آبلوں سے مجروح! ہم ان کی کمزوریوں سے

واقف تھے، اگر ابتدار ہماری طرف سے نہ ہوتی تو پھر ممدوح کو زیر کر لینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ ذیل کا مکالمہ ناظرین کے تفننِ طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

"ذاکر صاحب، بس دیکھئے اگر آج آپ یہاں سے بغیر کچھ لکھے ہوئے گئے، تو پھر یہ نہ کہئیے گا کہ ابتدار ہماری طرف سے ہوئی، اور اس کو خوب سمجھ لیجئے کہ آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے پر آئندہ سے آپ ایک چپراسی پائیں گے جو آپ کا سدِ راہ ہوگا۔ یہ جو آپ وقت بے وقت اُڑے چلے آتے ہیں، اور اس کے چند منٹ بعد کمرے میں خورد و نوش کی کوئی چیز نہیں رہ جاتی، تمام بستر پر قلیہ رانی ہوتی ہے۔ .... وہ آخر کب تک برداشت کیے جائیں گے۔

"سر کو ایک طرف جھٹک کر، ہُنھ! اچھا پانی پلائیے، پنکھا دیجئے اور ہاں خلوئے معدہ میں پانی پینا مضر ہے اطلاعاً عرض ہے۔ نوکر کو آواز دی، مشیت"

"یہ کہہ کر چارپائی پر دراز ہو گئے اور "دوش میگفتم ..... کی ضرب لگائی ہی تھی کہ ہم نے سختی سے روکا۔

"بس بس، یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ ان لغویات کو تہ کر رکھیں گے۔ آپ نے غالباً ہمارے الفاظ کو کافی غور سے نہیں سنا .... دست و گریباں ہونے کی دیر تھی

"اچھا اچھا میں تیار ہوں، بتائیے کیا کروں ...... میرا تمام پروگرام گڑبڑ ہو گیا، میں تو مسجد سے واپس جا رہا تھا، شامتِ اعمال، ادھر آنکلا۔

کیوں نہیں بڑا احسان کیا، اور پھر یہ شامتِ اعمال جس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہو، اللہ کی شان اسے بھی شکایت کا حق حاصل ہو، چسٹرٹن کا یہ مضمون لیجئے اور اس کا ترجمہ ابھی ابھی کر ڈالئے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس دوران میں ڈاکٹر اقبال یا کسی شاعر کا کلام جناب کی زبان پر رواں نہ ہو اور نہ جناب اپنے پروگرام کا کوئی تذکرہ کریں۔

"(بے بس ہو کر) لیکن تشنگی، گرمی اور گرسنگی،

"یہ سب کچھ نہیں، نصف ترجمہ کر لیجئے تو پیاس رفع کی جائے گی اور جب پورا ترجمہ ختم ہو جائے گا تو آپ کی گرسنگی کا علاج ہوگا۔ رہا گرمی کا سوال۔ یہ ہمارے آپ کے کسی کے بس کا نہیں، ....

اچھا اب سوا کام شروع کر دینے کے اور کوئی سوال جواب نہ ہو ورنہ۔۔۔۔۔

"ترجمہ شروع ہوا، آدھ گھنٹے کے بعد، اُف پانی"

"کیوں شرط بھول گئے، ترجمہ کہاں تک ہوا؟

"جھنجلا کر "نصف ہو گیا، بس پانی پلائیے ورنہ یہ دیکھئے، ترجمہ چاک ہو کر داخل دفتر ہوتا ہے،۔ دونوں ہاتھ کی چٹکیوں میں کاغذ کے دونوں سرے تھے اور زبان پر،

"اے سوار اشہب دوراں بیا،

"دیکھا تو نصف ترجمہ واقعی ختم ہو چکا تھا اور مسودہ بالکل صاف اور نستعلیق لکھا ہوا تھا۔ "نہیں نہیں، یہ پانی حاضر ہے،

"ایک پورا گلاس پی کر دوسرا گلاس طلب کیا۔ وہ بھی ختم ہوا تو پان کی فرمائش ہوئی۔ پورا پان، چونا محض برائے گفتن، کتھا دہ چند، چھالیہ ایک کف دست، چار چھوٹی الائچیاں، منہ میں رکھا ہی تھا کہ غائب! پان کے چند باریک باریک سبز ٹکڑے رہ گئے تھے جنہیں ہلکے ہلکے تھوک دیا۔ اس کے بعد پھر ایک گلاس پانی کی فرمائش ہوئی۔

"آخر اب پانی کی کون تک ہے۔۔۔۔۔

"ارے بھائی، پان کھانے کے بعد ہی پانی پی لینے سے منہ خوب میٹھا ہو جاتا ہے۔

"یہ لیجئے پانی حاضر ہے۔ لیکن پھر کام شروع ہو جائے، ایک دو۔۔۔۔ دوسرے نصف گھنٹے میں بقیہ ترجمہ بھی ختم ہو گیا۔۔۔۔

یہ ہے اس ترجمے کی شانِ نزول،

"ناظرین اسے غور فرمائیں اور ممدوح کے کمال کی داد دیں۔ یہ ترجمہ بالکل قلم برداشتہ ہوا ہے اور ایک گھنٹے میں پورا ہوا ہے۔ عبارت کی پاکیزگی، الفاظ کی دروبست زبان کی صفائی، بیان کی شستگی، انگریزی کے اصل مفہوم کو بہترین طریقے سے اُردو میں ادا کر دینا اور لفظی ترجمے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم ذاکر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ارباب نظر کی باصرہ نوازی کے لیے اس دیباچۂ "شجر" کو میگزین کے اوراق میں رکھ کر پیش کرتے ہیں۔"

یہ تھیں وہ آرار جو ذاکر صاحب کے تخلیقی عمل اور ان کے ترجموں کی خوبیوں کے بارے میں ان کے معاصرین رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ نگاری کی طرف ذاکر صاحب کا میلانِ طبع شروع ہی سے تھا۔ وہ فطری طور پر ترجمہ نگار تھے۔ انہوں نے اٹاوہ سے ۱۹۱۲ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور اس زمانے میں اپنے ہم جماعتوں کو پانیر اخبار کا زبانی ترجمہ کر کے سناتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ اس زمانے میں اُن کا ترجمہ الناظر میں چھپ گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ذاکر صاحب کو رشید احمد صدیقی اور مولانا سہیل جیسے ادب دوست ساتھی ملے۔ اور ان سے اپنی اس خداداد صلاحیت کی داد حاصل کی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں تو ان کے تراجم کا پوری طرح اعتراف کیا جانے لگا تھا۔

جامعہ کے زمانے میں جب وہ بطور ٹیچر کام کر رہے تھے۔ یعنی ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران۔ انہوں نے ”مبادی معاشیات“ کے نام سے۔ ELEMENTRY POLTCAL ECONOMY کا ترجمہ کیا۔ اور ریپبلک کے ترجمہ کو بھی پورا کرنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ معاشیات میں Ph.D کرنے کے لیے جرمنی چلے گئے۔ مگر وہاں بھی ترجمہ نگاری سے غافل نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے مضمون خصوصی کے ساتھ دیگر علوم کی طرف توجہ کی۔ اور مغربی مفکرین کے زیر اثر تعلیم اور سماج کے باہمی ربط و تعلق کے مطالعے میں مشغول ہو گئے۔ یہ تعلیم کا ایک نیا پہلو تھا۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں انہوں نے رسالہ جامعہ میں راہِ عمل کے نام سے اپنا ترجمہ چھپوایا۔ جرمنی ہی میں انہوں نے تعلیم و آزادیٔ فکر کے عنوان سے ایک اور ترجمہ اسی رسالے میں چھپوایا۔ یہ ترجمے برٹرینڈ رسل کی کتاب PRINCIPLES OF SOCIAL RECONSTRUTION اور ROAD TO FREE DOM. کے اقتباسات کا ترجمہ ہیں۔

ان دونوں کتابوں کے اقتباسات کے ترجموں کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ رسل کی ”ہیئت اجتماعی کی تعمیرِ نو“ سے۔

”دنیا کو ایک ایسے فلسفے یا ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو حیات پرور ہو، لیکن افزونیٔ حیات کے لیے محض حیات کے علاوہ کسی اور چیز کی قدر کی بھی ضرورت

ہے۔ جو زندگی بس زندگی کے لیے ہی وقف ہو۔ وہ حیوانی زندگی ہے۔ اس میں کوئی حقیقی قدر انسانی نہیں...... اگر زندگی کو کامل طور پر انسانی زندگی بنانا ہے تو اسے کسی ایسے مقصد کا خادم ہونا چاہیئے جو کسی نہ کسی معنی میں اس سے خارجی ہو، کوئی مقصد جو مافوق الناس اور غیر شخصی ہو، مثلاً اللہ، حق یا جمال۔ جو لوگ سب سے زیادہ ترقی حیات کا موجب ہوتے ہیں وہ اپنی خاطر زندگی نہیں گزارتے، ان کی نظر ہوتی ہے...... وجود انسانی میں حقیقت ازلی کا جزو پیدا کرنے پر.... ...... اس عالم ازلی سے لگاؤ ـــ خواہ یہ ہمارا خیالی عالم ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ساتھ ایک ایسی قوت اور اپنے ہم رکاب ایک ایسا امن و سکون لاتا ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی کی کشاکش اور ظاہری ناکامیاں اسے کبھی کلیتہً فنا نہیں کرسکتیں حقیقت ازلی کا یہی مسرت انگیز تصوّر ہے جسے اسپی نوزا خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کرتا ہے۔ جنہوں نے ایک مرتبہ اُسے جان لیا، ان کے لیے یہ ہمیشہ کلیدِ گنجِ عرفاں ہے"

دوسری کتاب کا بھی ایک اقتباس دیکھئے۔

"تعلیم میں ایک حد تک تسلط اور اختیار ناگزیر ہے۔ ہاں معلّموں کو اس تسلّط کے استعمال کا ایک ایسا راستہ دریافت کرنا ہے جو حرّیت کے منشار کے مطابق ہو۔ جہاں تسلّط ناگزیر ہو وہاں ضرورت ہوتی ہے حرمت و تکریم کی۔ جو شخص بچوں کو دراصل اچھی تعلیم دینا چاہتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو درجۂ کمال پر پہونچانے کا آرزومند ہے، اسے اس جذبۂ تکریم سے لبریز ہونا چاہیئے۔"

"ہمارے مدارس میں ڈسپلن اور ضبطِ نفس پر جو اصرار پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایک عیب ہے۔ ضبط نفس کی ایک قسم ہے جو ہر حصولِ مقصد کے لئے لازمی ہے۔ لیکن یہ پسندیدہ قسم خود اندر سے پیدا ہوتی ہے اور ایک بعید مقصد کے لیے استقلال کے ساتھ کوشش کرنے اور اس کی راہ میں بہت سی چیزیں ترک کرنے اور بہت سے مصائب برداشت کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ہیجانات کو ارادہ کا ماتحت کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے مہتم بالشان تخلیقی آرزوؤں سے عمل کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے۔ .... اس ضبط کے بغیر کوئی حوصلہ، اچھا ہو یا بُرا، پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضبط

خود اپنے ارادے سے پیدا ہوتا ہے نہ کسی خارجی جبر سے ....."

ترجمے کی زبان دیکھی آپ نے۔ بالکل آمد ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ترجمہ نہ ہو اور وہ اپنی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہوں۔ مفہوم پوری شرح وبسط اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ پڑھنے والے کی گرفت میں آجاتا ہے۔ یہ خوبی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ جیسا کہ ڈاکٹر عابد حسین نے ان کے بارے میں کہا تھا، اپنے مخصوص مضمون سے کہیں زیادہ علم تعلیم اور فن تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے۔

طوالت کے خوف کے پیش نظر، باقی ترجموں کو نظر انداز کرتے ہوئے اب صرف افلاطون کی کتاب کے ترجمے سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

"میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ مال و دولت کی طرف سے کچھ بے نیاز سے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کو یہ چیزیں بلا ذاتی محنت اور کاوش کے ورثے میں مل جاتی ہیں۔ یوں تو افادے کے خیال سے مال سے کسے محبت نہیں ہوتی لیکن جو لوگ ذاتی کوشش سے دولت پیدا کرتے ہیں انہیں اس سے کچھ مزید تعلق سا ہو جاتا ہے اور چونکہ یہ اُسے اپنی محنت کا پھل جانتے ہیں اس لیے انہیں دولت سے ایسی ہی الفت ہو جاتی ہے جیسے شاعر کو اپنے شعر سے یا ماں باپ کو اپنی اولاد سے۔ خدا ایسے لوگوں کی صحبت سے بچائے رکھے، ان بے چاروں کے پاس سوائے دولت کے گن گانے کے اور کوئی بات کرنے کو ہوتی ہی نہیں۔" ص ۲۵

"ت: بہت اچھا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ نظام حکومت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کہیں شخصی حکومت ہوتی ہے۔ کہیں طبقۂ امرا حکومت کرتا ہے اور کہیں جمہور کی حکمرانی ہوتی ہے۔

س۔ جی ہاں۔

ت۔ اور آپ غالباً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہر ریاست میں حکومت ہی قوی فریق اور بالادست طاقت ہوتی ہے۔

س۔ بے شک

ت۔ حکومت کا یہی نظام خواہ شخصی ہو، امارتی ہو، یا جمہوری اپنے مختلف اغراض کا خیال

رکھ کر آئین و قوانین بناتا ہے۔ اور انہیں قانونوں کے ذریعے جو ریاست کی اغراض کے پابند ہوتے ہیں اپنی رعایا میں عدل اور انصاف قائم رکھتا ہے۔ ان قانونوں کی نافرمانی کرنے والوں کو غیر منصف یا ظالم تصور کر کے سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ تمام ریاستوں میں عدل کا ایک ہی اصول ہے یعنی حکومت کی اغراض کا اتباع، اور چونکہ حکومت اور قوت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے عدل کے معنی صرف قوی فریق کے اغراض کا پاس کرنا ہیں۔،، ص ۱۸

،، لیکن درحقیقت عدل کو انسان کے ظاہر سے سروکار نہیں باطن سے ہے۔ کہ یہی انسان کی اصلی اور اس کی حقیقی غایت ہے۔ عادل آدمی اپنے مختلف اندرونی عناصر کو ایک دوسرے میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ ایک کو دوسرے کا کام کرنے دیتا ہے۔ وہ اپنی باطنی زندگی کو منضبط کر لیتا ہے۔ خود اپنا آقا ہوتا ہے، خود ہی اپنے لئے قانون بنا لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے برسرِ پیکار نہیں ہوتا، بلکہ صلح و سلامتی کے ساتھ رہتا ہے۔ جب یہ اس طرح اپنی روح کے تینوں اصولوں کو (جو بمنزلہ اونچے، نیچے اور متوسط سُر اور ان کے درمیانی فصل کے ہیں) باہم متحد کر لیتا ہے اور اس میں کثرت باقی نہیں رہتی بلکہ ایک معتدل اور منضبط طبیعت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر ضرورت کے وقت یہ عمل کی طرف اپنا قدم اٹھاتا ہے۔ خواہ یہ عمل املاک کے بارے میں ہو، یا جسم کے علاج کے متعلق یا کوئی سیاسی یا خانگی معاملہ ہو۔ جو چیز اس تناسب اور یک آہنگ کیفیت کو قائم رکھے یا اس میں مدد دے، اسے یہ نیک اور عادلانہ جانے گا بھی اور کہے گا بھی۔ جو علم اس عمل خیر کا باعث ہو اسے حکمت اور عقل سے تعبیر کرے گا، جو عمل اس کیفیت میں حارج ہو اسے غیر عادلانہ قرار دے گا۔ اور جو رائے اس کی وجہ ہو گی اسے جہل جانے گا۔،، ص ۱۷۵

،، میرے دوست۔ پھر تم قانون بنانے والے کا مقصد بھول گئے۔ اس کا مقصد ریاست میں کسی ایک طبقے کو دوسروں سے زیادہ خوشحال بنانا نہیں تھا۔ اسے خوش حالی درکار تھی ساری ریاست کی۔ اس نے شہریوں کو ترغیب اور ضرورت کے زور سے یکجا رکھا۔ انہیں ریاست کا محسن اور اس طرح گویا ایک دوسرے کا محسن بنایا۔ اسی غرض سے انہیں پیدا کیا۔ اس لیے نہیں کہ اپنی من مانی کریں بلکہ اس لیے کہ

ریاست کے بندھن باندھنے کا آلہ نہیں ۔" ص ۲۸۲

مندرجہ بالا اقتباسات ذاکر صاحب کی ترجمہ شدہ کتاب "ریاست" سے اِدھر اُدھر سے اٹھائے گئے ہیں ۔ یعنی اس میں انتخاب کی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔ ان تحریروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان عبارتوں میں اظہار کی برجستگی اور علم و عرفان کی آمیزش نے عجب دلآویزی پیدا کر دی ہے ۔ آل احمد سرور نے اس ترجمے کے بارے میں لکھا ہے ۔

"افلاطون سے لے کر برٹرینڈ رسل تک مفکرین و مصنفین کے یہاں یا تو علم کی گہرائی ہے یا ایک ہمیرانہ شان یا حسن بیان کی چاشنی ۔ یہ تینوں خصوصیات علاحدہ علاحدہ بھی اتنی ہی اہم ہیں کہ مشکل سے ایک ذات میں جمع ہو سکتی ہیں ۔ افلاطون کو ان سب کا بھرپور حصہ ملا تھا ۔ ذاکر حسین کے یہاں بھی تینوں کے ایک لطیف امتزاج نے جلال و جمال کی ایک دھوپ چھاؤں پیدا کر دی ہے "

یہ تھا ایک عام جائزہ ذاکر صاحب کے ترجموں کا ۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ذاکر صاحب کوئی عام ترجمہ نگار نہ تھے ۔ اور نہ انہوں نے یہ ترجمے اس لیے کیے ہیں کہ انہیں ترجمہ کرنا آتا تھا ۔ ان ترجموں سے ان کا مقصد دوسرے لوگوں کو بھی اس علم و آگہی سے مستفید کرانا تھا ، اور اس علمی بصیرت کو پھیلانا تھا ، جو انہوں نے منزل بہ منزل مشاہیر کی شخصیات اور تخلیقات سے حاصل کی تھی ۔ یہ ترجمے محض ترجمے نہیں ہیں بلکہ ان کے پُر مغز دیباچے بتا رہے ہیں کہ وہ ان علوم اور ان کتابوں کے غوّاص تھے ۔ علم کے جویا تھے ۔ اور اس روشنی سے خود فیضیاب ہو کر دنیا کو بھی منور کرنا چاہتے تھے ، یہ دیباچے ان کتابوں کی شرح و تفسیر بھی ہیں ۔ اور ان پر عالمانہ تبصرے بھی ۔ وہ ہمیں اصل مصنف کے ماحول ، اس کی شخصیت اور اس کے افکار سے سرسری نہیں بلکہ پوری بصیرت و آگہی کے ساتھ باخبر کرتے ہیں ۔ ذاکر صاحب نے جو کچھ پڑھا ، جو کچھ سیکھا اس کو اپنے تک محدود نہیں رکھا ۔ دوسروں تک پہونچایا ۔ ان کا یہ فیض جاریہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گا ۔

اس مضمون میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ۔

۱۔ اردو ادب ۔ ذاکر نمبر

۲۔ نذر ذاکر

۳۔ شہید جستجو ۔ ضیاء الحسن فاروقی

۴۔ ریاست افلاطون (ڈاکٹر ذاکر حسین) وغیرہ وغیرہ ۔

شمس الہدیٰ شمس

ڈاکٹر ذاکر حسین ۔اور۔ صحافت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو صحافت سے اتنی دلچسپی نہیں تھی بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد و مشن تعلیم کو ہی بنالیا تھا لیکن یہ بات کلی طور سے درست نہیں ہے بلکہ اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو صحافت کے ذریعہ ہی ان کی صلاحیت پروان چڑھی جس کا انھوں نے خود کئی جگہ اعتراف کیا ہے۔ خاص طور سے مولانا محمد علی کا "کامریڈ" اور "ہمدرد" اور مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" یہ اخبارات جو اس وقت ملک کے طول وعرض میں مقبول تھے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب ان اخبارات کو نہ صرف یہ کہ خود پڑھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی پڑھ کر سناتے تھے اور اپنے دل و دماغ میں اس کا عکس محسوس کرتے تھے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان کے اندر انہیں اخبارات سے پیدا ہوا تھا۔

چنانچہ اس کا اعتراف ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے موقع پر ۲۲/فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"میں مولانا کا ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں، میں ان کے حقیر چیلے ہونے کا فخر کرتا ہوں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا ۔ اپنی زندگی کو بنانے کے لیے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک لڑکا ہی تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیے کو سلگانا چاہتا تھا۔ اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتیاں بنائی تھیں اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا اور ڈھونڈھتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بتی، اس دیے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا اور جب میں

اس اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انہیں سناتا تھا۔ اس وقت اس بتی میں آگ لگی تھی۔ یوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی، لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پہلی آگ انہیں سے لی تھی،، (بحوالہ۔ ماہنامہ ,,آجکل،،۔ ابوالکلام نمبر اگست ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۱)

یہی نہیں بلکہ جس زمانے میں ذاکر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے ان کو انگریزی اخبار بھی پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ یہ پروفیسر حبیب الرحمان جو برسوں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ٹیچرز کالج کے پرنسپل رہے ان کے اسلامیہ ہائی اسکول کے ساتھیوں میں سے تھے انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

,,مرشد (ذاکر صاحب کو وہ مرشد ہی کہتے تھے) کو انگریزی اخبار پڑھنے کا اس زمانہ میں بھی بہت شوق تھا۔ پانیر (PIONEER) اخبار معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا۔ انہیں خبریں جلد سے جلد معلوم کرنے کی اتنی شدید خواہش رہتی تھی کہ وہ روز اٹاوہ کے اسٹیشن پر پانیر (PIONEER) اخبار خریدنے کے لیے جاتے تھے۔ آگے وہ اور پیچھے میں۔ اسٹیشن پر اخبار اترتے ہی ذاکر صاحب اسے حاصل کرتے تھے اور پھر وہ اور میں تقریباً بھاگتے ہوئے اسکول کے بورڈنگ میں واپس آتے تھے۔ طالب علم ذاکر صاحب کے منتظر ہوتے اور ان کے واپس ہوتے ہی چاروں طرف حلقہ بنا لیتے۔ ذاکر صاحب انہیں خبروں کا نہ صرف ترجمہ کر کے سناتے بلکہ ان پر تبصرہ بھی فرماتے،،۔ (بحوالہ۔ حبیب الرحمان ,,تعلیمی دور،، مطبوعہ مسلم یونی ورسٹی گزٹ علی گڑھ، ذاکر نمبر۔ ۲۴/فروری ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۴)

صحافت کے میدان میں بھی ڈاکٹر ذاکر حسین نے جوہر دکھائے ہیں اپنے طالب علمی کے زمانہ میں جب وہ علی گڑھ میں تھے۔ کالج کے میگزین میں ذاکر صاحب (RIP) کے نام سے کالج کی زندگی اور سرگرمیوں سے متعلق مزاحیہ انداز سے پر لطف ایسے مضامین لکھا کرتے تھے کہ لوگ بڑی بے صبری سے ان کے مضامین کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کے یہ مضامین بعد میں طنز و مزاح اور لطیف حاضر جوابی کا شاہکار نمونہ ہوا کرتے تھے رپ کے مستقل کالم کا عنوان

FROM-THE SLEEPY HOLLOW تھا ان کا مضمون رپ میں کیسا ہوا کرتا تھا اور کس طرح سے دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ نمونے کے لیے دو ٹکڑے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

"آپ کے میگزین کا گزشتہ شمارہ (اگست، ستمبر اور اکتوبر 1919ء) جن سے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا ہے۔ رپ RIP کی شخصیت سے متعلق قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں جو پرسکون بھی ہیں اور مضطربانہ بھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی دوسرے نام سے لکھنا بزدلی ہے۔ اس کے جواز میں میری دلیل یہ ہے کہ اس سے میرا مقصد وہ اقتدار حاصل کرنا ہے جو صرف ریاکاری ہی دے سکتی ہے۔ اور یہ کہ اپنی حفاظت کا سامان کرنا جو محض گمنامی ہی فراہم کر سکتی ہے اس لیے اونگھتے ہوئے غار کا ہنس رپ HENCE RIP FROM THE SLEEPY HOLLOW، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو بزدل ہیں کہ وہ یہ خطرے سے محفوظ رہیں گے۔"

دوسرا ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں کہ

"یہاں، وہاں اور ہر جگہ؟ یہ رپ آخر ہے کون؟ وہ کیسے میں کچھ دیکھ سکتا ہے؟ وہ کس طرح ایسی باتیں بھی سن لیتا ہے جنہیں لوگ صرف اپنے آپ سے کہتے ہیں؟ آدمی خطرناک معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔

"بیچارہ دمسکین رپ جیسا کہ وہ ہے۔ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ وہ کہیں نہیں ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے کیونکہ ہفتہ میں ایک بار اونگھتا ہوا غار عقاب کا گھونسلہ بن جاتا ہے جہاں سے وہ بڑی مستعدی سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے تاکہ اس کا کوئی شکار اس سے بچ کر نہ جا سکے۔ کمیں گاہ ہی کی جو کسی بزدلوں کی بہادری ہے۔" (بحوالہ۔ رشید احمد صدیقی ۔۔"ہمارے ذاکر صاحب" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ صفحہ ۲)

ذاکر صاحب بنیادی طور پر تعلیمی میدان میں سرسید کے فکر سے متفق تھے۔ وہ جس نصب العین کو لے کر اٹھے تھے۔ ان کی عظمتیں اور ہمہ جہتی متوقع نیم خیزی کے بھی معترف تھے۔ سرسید کا مقصد مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ تھا کہ اشاعت تعلیم کے وسیلے سے ہندوستان کے مسلمان مذہبی، سماجی اور معاشی اصلاح و ترقی

کا سامان کرنا تھا اور یہ بھی وہ محسوس کرتے تھے کہ آئندہ چل کر اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہوگی۔ ذاکر صاحب اس سطح پر سرسید کی دور اندیشی کو سراہتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب سرسید کے اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رکھا جائے بلکہ ذاکر صاحب تعلیم کو چوکی سمجھتے تھے درحقیقت وہ بذات خود ایک اعلا سطح کی سیاست تھی جس کی تکمیل ایک بلند اخلاقی مقصد کی حامل سماج اور مملکت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ سرسید اس حق میں نہیں تھے کہ انگریزی سامراج کے خلاف ملی اور قومی تحریکوں میں کسی صورت میں بھی حصہ لیا جائے اور اور ذاکر صاحب کی جامعہ ملیہ کی تحریک آزادی کا تعلیمی محاذ تھی اور اس کے اساتذہ و کارکن اور ہمدرد قومی تحریک کے عملی منصوبوں میں شریک ہو کر سبتہ گرہ اور قید و بند کی زندگی اختیار کر سکتے تھے۔

اور ان سارے خیالات کا اظہار ذاکر صاحب نے صحافت کے ذریعہ ہی کیا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب کہ وہ صرف ۲۳ سال کے تھے "علی گڑھ میگزین" کے مارچ، اگست ۱۹۲۰ء کے شمارے میں ایک انگریزی مضمون ETERNITY; OR TOY کے عنوان سے چھپا ہے۔ جس کا اردو ترجمہ "ابدیت یا کھلونا" ہے۔ یہ مضمون اس امر کا غماز ہے کہ اس وقت ذاکر صاحب کا قومی و ملی رجحان کیا تھا اور ان کے فکر کا دھارا کس طرف بہہ رہا تھا۔ اس مضمون میں سرسید کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ان کے فکر و عمل کی بعض کمزوریاں اور علی گڑھ تحریک کی ادھوری کامیابی کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے۔

مذکورہ مضمون میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس سلسلے میں جو بات بہت واضح ہے وہ تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی احتیاط ہے جس کی سرسید برابر تلقین کرتے رہے۔ اور علی گڑھ کے ذمہ دار حضرات آج تک اس کے قائل ہیں اگر تھوڑا سا سوچ بچار کیا جائے تو اس نظریہ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ انسانی جسم ایک جیتا جاگتا جسم نامی ہوتا ہے۔ اس لیے انسانی سرگرمیوں کو خانوں میں بانٹنا ایک ایسی بات ہے جسے سوچا بھی

نہیں جاسکتا۔ آپ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم آپ کو ساری چیزوں سے علیٰحدہ کرکے تعلیم دیں گے اور وہ چیزیں اپنا کام آپ کرلیں گی آپ ایسا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ اسے اس طرح پا نہیں سکتے ہیں۔ یہ نئی نسل بے شمار خارجی عوامل سے متاثر ہوتی ہے خواہ آپ اس سلسلے میں کچھ کریں یا نہ کریں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ میں نے اپنی طویل عمر میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے باپ دادا کے متعلق کم اور اپنے عہد کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔"

ذاکر صاحب آگے مزید لکھتے ہیں کہ

"جس طرح قومی معشیت کی بہت سے ضروری مسائل اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک قوم تعلیم یافتہ نہ ہوجائے، اس طرح تعلیمی اصلاح بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سیاسی اداروں کو بہتر نہ بنایا جائے۔ اس لیے یہ بات کہ تعلیم کو سیاست سے الگ رکھا جائے جیسا کہ سرسید بظاہر چاہتے تھے نہ تو ممکن تھی اور نہ مناسب۔ اور یہ اس لیے کہ تعلیم حیرت انگیز طور پر پیچیدہ چیز ہے اور واقعی اچھی تعلیم کا سچا عزم اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا ہے جب تک کہ ایک لبرل تعلیمی حکمت عملی نہ اپنائی جائے جس میں سوشیولوجی اور سیاست کا بھی اتنا ہی اہم مقام ہو جتنا کہ ایک معلم کا۔ سچی تعلیم کا مقصد چونکہ اچھے شہری پیدا کرنا ہے اس لیے تعلیمی و سیاسی کوششوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک ایسی دنیا کے افراد تیار کر رہے ہیں جن کا اس دنیا کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہوگا ایسی غیر فطری علیٰحدگی ماحول سے بے تعلقی اور دوری پیدا کردیتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے قدیم طلبہ کے صفوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنے بھائی انسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہوں"(بحوالہ۔ ذاکر حسین "ابدیت یا کھلونا" ترجمہ۔ ڈاکٹر مسرور ہاشمی اسلام اور عصر جدید۔ دہلی جنوری۔ اپریل ۱۹۸۷ء)

ذاکر صاحب ماہر تعلیم اور ایک کامیاب سیاست داں تھے لیکن اگر وہ صحافت کے میدان میں بھی اس طرح دلچسپی لیتے جس طرح تعلیم پائی تھی تو یقیناً

وہ ایک کامیاب صحافی بھی ہوتے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن دنوں وہ جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ وہ سویڈن کے ایک شخص پیٹرسن جن کا ڈیری فارم میں زبردست مہارت تھی۔ ان دنوں جس مکان میں ذاکر صاحب رہتے تھے بطور مہمان آئے ہوئے تھے لیکن وہ ڈنمارک و سویڈن میں رہتے تھے۔ ذاکر صاحب کا چونکہ شروع سے ہی یہ محبوب مشغلہ رہا تھا کہ وہ مختص موضوعات اور مختلف چیزوں سے متعلق معلومات فراہم کریں اور معلومات فراہم کرنے تک انہیں ہر چیز سے دلچسپی تھی چنانچہ جب پیٹرسن کی ذاکر صاحب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو انہیں اس موضوع سے بھی دلچسپی ہو گئی اور انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ پیٹرسن کے ساتھ اسکینڈی نے وین ملکوں کا بھی دورہ کیا جائے اور یہ سوچا بھی نہیں کہ اس مہم پر کیا خرچ آئے گا اور اس کا انتظام کیسے ہو گا دونوں سفر پہ نکل پڑے۔ یہ اکتوبر ۱۹۲۴ء کی بات ہو گی کہ ذاکر صاحب پیٹرسن کے ساتھ ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کے سفر پر نکل پڑے۔

جب وہ اسٹاک ہوم میں تھے تو پتہ چلا کہ جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے اس کا بل ادا کرنے کے لیے ان لوگوں کے پاس پیسے نہیں تھے — پیٹرسن نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر ذاکر صاحب گاندھی جی پر کوئی مضمون لکھ دیں تو اُسے کسی اخبار میں شایع کرا دیا جائے گا۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے انگریزی میں گاندھی جی پر ایک تفصیلی مضمون لکھا اور پیٹرسن نے جرمن میں اس کا ترجمہ کر دیا۔ اور ایک اخبار نے ذاکر صاحب کی تصویر کے ساتھ اسے شائع بھی کر دیا۔ اخبار نے اس مضمون کا جو معاوضہ دیا وہ اتنا تھا کہ اس سے انہوں نے ہوٹل کا بل ادا کیا اور بہ خیریت جرمنی واپس آگئے۔

ذاکر صاحب کو تہذیب اور سیاست کے اہم مسائل سے دلچسپی اتنی تھی کہ اگر جرمنی میں بھی ان کو پیسے کی کمی محسوس ہوئی تو جس طرح سے کہ اسٹاک ہوم میں ہوئی تھی تو شاید وہ جرمنی کے اخبارات میں بھی ایسے مضامین لکھتے اور یقیناً ان کا معیار ایک عام صحافتی مضمون سے کہیں زیادہ بلند ہوتا اور وہ

پسند بھی کیے جاتے کیونکہ ہندوستان کی آزادی اور گاندھی جی کی شخصیت اور افکار پر انہوں نے جرمنی کے مختلف شہروں میں جو تقریریں کیں وہ بہت پسند کی گئیں کیوں کہ اس زمانے میں جرمنی کے لوگوں کو ہندوستان سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

ذاکر صاحب کی بچپن سے یہ خواہش تھی کہ وہ استاد بنیں اور وہ استاد بن بھی گئے جس کی وجہ سے انہیں زندگی میں وہ مقام و مرتبہ حاصل ہوا جو ایک مہذب و صحت مند سماج میں ایک سچے اور بڑے معلم کا ہونا چاہئیے۔ ان کی بچپن کی یہ سادہ آرزو پوری نہ ہوتی اور اپنے بڑے بھائی کی خواہش کے مطابق انجینیر یا ڈاکٹر بن جاتے یا اپنے چچا کی خواہش کے احترام میں اپنے والد مرحوم کی طرح وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو ہندوستان کی سیاست جس اعلیٰ و آخری مقام تک وہ پہنچے کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں کہا جا چکا ہے کہ ان کی شخصیت کو نکھارنے میں اور بنانے میں صحافت نے ہی اہم رول ادا کیا تھا اور صحافت ان کے رگ و پے میں اس طرح سے رچی بسی تھی کہ زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں ان سے جدا نہیں ہوئی ہے اگرچہ جرمنی کے دور قیام میں انہوں نے وہاں کے اخبارات میں کچھ نہیں لکھا اور غالباً اس طرف ان کا ذہن ہی نہیں گیا ہوگا یا ممکن ہے کہ تعلیمی مصروفیت نے ان کی اجازت بھی نہ دی ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سوچا ہو کہ جرمنی وہ جس مقصد کے تحت آئے ہیں وہ اوّل پورا ہونا چاہئیے لیکن اس کے باوجود انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اس کام سے جو رسالہ "جامعہ" شائع کرنا شروع تھا وہ آج تک جاری ہے جرمنی سے اس رسالہ کے لیے کوئی نہ کوئی مکتوب، مضامین یا دوسروں کے مضامین کے ترجمے ضرور بھیجتے تھے مثلاً مورخہ ۱۶/دسمبر ۱۹۲۲ء کے اپنے مکتوب میں جرمنی میں چیزوں کی قیمت اور جرمن مارک کے نرخ مبادلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ

"آپ لوگ پائنیر (Pioneer) میں نرخ مبادلہ پڑھ کر یہاں کے

اخراجات کے گھٹنے، بڑھنے پر ذرا حکم نہ لگائیں، مبادئ معاشی کیفیت اس درجہ پیچیدہ ہے کہ چند روز قبل بھی کوئی صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن اس تمام گفتگو کا مقصد یہ نہیں کہ یہاں خرچ زیادہ ہے۔ بہت پڑھنے پر بھی یہاں جتنے مصارف ہیں ان میں یہاں کی سی تعلیم دراصل کوڑیوں کے مول ہے۔ مثلاً سنیئے کہ اس گرانی اور مبادلہ کے اتار چڑھاؤ کا اثر مجیب پر کیا پڑا۔ نومبر میں ہمارے فیملی (جس خاندان میں آج کل قیام ہے) والوں نے رہنے اور کھانے کے لیے ہم سے ایک پونڈ (۱۵ روپیہ) فی کس وصول کیا تھا۔ گرانی جو ہوئی اور قیمتیں دوگنی وچوگنی بڑھ گئی تو اس پر دو پونڈ (۳۰ روپیہ) کا مطالبہ کیا ہے لیکن یوروپ میں رہنے اور کھانے پر اگر ۳۰ روپے ماہوار صرف ہو گئے تو کون بہت ہیں میں یاد کرتا ہوں کہ آتے وقت بمبئی میں ہوٹل والے کو محض قیام کے لیے پانچ روز میں پندرہ روپے دینے پڑے تھے تو کس قدر متعجب ہوتا ہوں۔۔؟

(بحوالہ۔ جامعہ جلد (۱) نمبر (۱) جنوری ۱۹۲۳ء جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ صفحات ۴۷،۴۸)

اپریل ۱۹۲۲ء کے "جامعہ" کے اپریل کے شمارے میں ذاکر صاحب نے برٹرنڈرسل کی کتاب "حیثیت اجتماعی کی تعمیرِ نو" کے آخری باپ سے بعض اقتباسات کا ترجمہ "راہ عمل" کے عنوان سے برلن سے بھیجا تھا۔ ملاحظہ ہو اس کا ایک اقتباس۔

"دنیا کو ایک ایسے فلسفے یا ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو حیات پرور ہو، لیکن افزونی حیات کے لیے محض حیات کے علاوہ کسی اور چیز کی قدر کی بھی ضرورت ہے۔ جو زندگی بس زندگی کے لیے ہی وقف ہو وہ حیوانی زندگی ہے۔ ایسا کوئی حقیقی قدر انسانی نہیں۔۔۔۔ اگر زندگی کو کامل طور پر انسانی زندگی بنانا ہے تو اسے کسی ایسے مقصد کا خادم ہونا چاہیئے جو کسی نہ کسی معنیٰ میں اس سے خارجی ہو، کوئی مقصد جو مافوق الناس اور غیر شخص ہو مثلاً اللہ حق، یا جمال۔ جو لوگ سب سے زیادہ ترقی حیات کا موجب ہوتے ہیں وہ اپنی خاطر زندگی نہیں گزارتے ہیں انائی نظر ہوتی ہے۔۔۔ وجود انسانی میں حقیقت ازلی کا جزو پیدا کرنے پر۔۔ اس عالم ازلی سے گھاؤ، خواہ یہ

ہمارا خیالی عالم ہی کیوں نہ ہو، اپنے ساتھ ایک ایسی قوت اور دیئے ہمرکاب ایک ایسا امن وسکون لاتا ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی کی کشاکش اور ظاہری ناکامیاں اسے کبھی کلیتاً فنا نہیں کر سکتیں۔ حقیقت ازلی کا یہی مسرت انگیز تصور ہے جسے "اسپی نوزا" خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کرتا ہے جنہوں نے ایک مرتبہ اسے جان لیا۔ ان کے لیے ہمیشہ کلید گنج عرفان ہے۔۔۔"

محمد مجیب

ذاکر صاحب اور تعمیرِ جامعہ

مجھے حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ جامعہ ملیہ کو قایم کرنے کی تحریک قوم کے ان رہنماؤں نے نہیں کی تھی جن کے نام اس سلسلے میں بتائے جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی استادوں اور طالب علموں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ سرکاری درسگاہوں کو چھوڑ دیں، ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ ایک خاص تاریخ کو وہ علی گڑھ آنے والے تھے اور یونین میں ان کی تقریر ہونے والی تھی۔ ذاکر صاحب، جو اس وقت آدھے طالبِ علم، آدھے استاد تھے اور طالب علموں میں ممتاز اور ان کے خاص گروہ میں ہر دل عزیز تھے، چاہتے تھے کہ اس جلسے میں ضرور شریک ہوں۔ لیکن انھیں اپنے علاج کے لیے دلّی بھی آنا تھا، جہاں وہ ڈاکٹر انصاری مرحوم سے وقت لے چکے تھے اور اتفاق سے جو تاریخ انھوں نے دلّی جانے کے لیے مقرر کی تھی، اسی تاریخ کو علی گڑھ میں مہاتما جی کی آمد ہوئی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ جلسے کا وقت ایسا طے ہو کہ وہ دلّی سے واپس آکر اس میں شریک ہو سکیں، مگر جب وہ اسٹیشن پہنچے، تو ان کے کئی دوست ان کے استقبال اور انھیں یہ خوشخبری سنانے کے لیے آئے ہوئے تھے کہ مہاتما جی کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مہاتما جی کی تقریر کا بنارس ہندو یونیورسٹی کے طالب علموں اور استادوں پر بھی کارگر اثر نہیں ہوا تھا، لیکن وہاں پنڈت مدن موہن مالویہ جلسے میں موجود تھے۔ علی گڑھ میں کوئی بات آداب کے خلاف جلسے میں تو نہیں ہوئی، البتہ جلسے کے بعد مہاتما جی کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ ذاکر صاحب

علی گڑھ اسٹیشن پر اترے، تو مذاق اڑانے کا سلسلہ جاری تھا اور اس میں ان کے بعض اپنے دوست بھی شریک تھے۔

ذاکر صاحب کو اس وقت تک مہاتما گاندھی سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی۔ مہاتما جی نے اپنی اخلاقی حکومت رفتہ رفتہ قایم کی؛ پہلے ان کے ماننے والے بہت کم تھے، وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ مسلمان تقریروں میں جس اندازِ بیان کو پسند کرتے تھے، اسے دیکھتے ہوئے اس کا امکان بہت کم تھا کہ مسلمانوں میں وہ اپنی قوتِ بیان کی وجہ سے اثر پیدا کر سکیں۔ اور ہمیں علی گڑھ کے ان طالب علموں کو قصور وار نہیں ٹھہرانا چاہیئے، جنھیں ان کی تقریر سننے کے بعد ان سے عقیدت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن تمسخر اور تحقیر کے جس انداز سے مہاتما جی کی تقریر اور ان کے مقصد پر فقرے چست کیے گئے، اس سے ذاکر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی۔ ایسی فضا میں جیسی کہ اس وقت علی گڑھ میں تھی، اعتراض یا نصیحت کرنا یا سیاست اور تہذیب کا دوسرا رُخ پیش کرنا بیکار تھا، پھر بھی ذاکر صاحب اگلے دن اس جلسے میں گئے، جس میں طالبِ علم مہاتما جی کی اس تحریک پر بحث کرنے والے تھے کہ استاد اور طالب علم سرکاری درسگاہوں کو چھوڑ دیں۔ انھیں بخار تھا اور وہ بحث میں حصّہ نہیں لینا چاہتے تھے، مگر اس فریق کی تایید کیے بغیر نہ رہ سکے جو مہاتما گاندھی کی تحریک کے موافق تھا۔ اسی فریق کی مخالفت میں کسی نے طعنہ کے انداز میں کہا کہ جو لوگ موجودہ درسگاہوں کو چھوڑنے کی تلقین کر رہے ہیں، انھیں یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ ان درسگاہوں کو چھوڑنے والے جائیں کہاں؟ یہ علی گڑھ کے مقابلے میں ایک قومی درسگاہ قایم کرنے کا ایک چیلنج تھا، جسے ذاکر صاحب نے دل میں قبول کر لیا۔ وہ دلّی آئے اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور دوسرے لیڈروں سے مل کر انھیں یقین دلایا کہ علی گڑھ میں ایک قومی درسگاہ قایم کی جا سکتی ہے اگر قوم کے رہنما ان استادوں اور طالب علموں کو سہارا دیں جو اس میں تعلیم دینے اور تعلیم پانے کے لیے تیار ہیں۔ قومی لیڈر بغاوت کے ایسے ہی آثار کے تو منتظر تھے۔ انھوں نے بہت گرمجوشی کے ساتھ ایک قومی درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو اپنا لیا، اور

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملّیہ اسلامیہ وجود میں آ گئی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کا کام فروری مارچ ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ اس وقت عبدالمجید خواجہ صاحب مرحوم شیخ الجامعہ تھے اور جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا جا چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک یہ بات رفتہ رفتہ ظاہر ہو گئی تھی کہ جامعہ میں کون بغیر شرط کے کام کرنے پر تیار ہے، کون نہیں ہے؛ اور ان شرطوں میں جن کے بغیر کام کرنا شرط تھا ایک یہ بھی تھی کہ چاہے جامعہ کے مقصد پر گفتگو اور بحث کی جاتے، اس کے کاموں کو لاحاصل قرار دے کر اسے چھوڑا نہ جائے۔ غالباً اکتوبر ۱۹۲۰ء اور ستمبر ۱۹۲۳ء کے درمیانی زمانے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ جامعہ کی غیر مشروط خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ صلاحیت ذاکر صاحب میں ہے؛ اور انھوں نے جرمنی سے واپسی پر شیخ الجامعہ کے فرائض بھی اس طرح انجام دینا شروع کر دیے، گویا وہ رخصت سے واپس آئے ہوں۔

جامعہ میں اس وقت تھا کیا؟ اسکولوں اور کالجوں کو ملا کر قریب ۸۰ طالب علم اور پچیس تیس استاد جن میں سے ہر ایک کی اپنی جدا گانہ شخصیت اور نفسیاتی مسائل تھے۔ ایک بیرک نما عمارت ہوسٹل اور بیشتر استادوں کے رہنے کے لیے تھی اور کتاب خانے، دفتروں اور کلاسوں کے لیے تین اور کرائے کی عمارتیں، جن میں سے دو کے ساتھ چند کوٹھریاں تھیں۔ مہاتما جی جامعہ کے علی گڑھ سے منتقل ہوتے وقت ایک سال کا خرچ دے چکے تھے۔ اس کے بعد سے جامعہ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنا، امیرِ جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنے ذمّے لیا تھا۔ طالب علموں کی تعداد ایک معمولی مدرسہ سے بھی کم تھی، مگر ۱۹۲۶ء کے شروع کے طالب علموں میں سے بیشتر اور استادوں اور کارکنوں میں سے تقریباً سب ایسے تھے، جو اس وقت جب علی گڑھ میں جامعہ کو بند کرنے کا مسئلہ زیرِ غور تھا، اس کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں گے، چاہے لیڈروں میں سے کوئی بھی ان کا سرپرست اور مددگار بننے کو تیار نہ ہو۔ یہی عزم جامعہ کا اصل سرمایہ تھا، اسی کے بل پر

اپنے آپ کو اور دوسروں کو یقین دلانا تھا کہ جامعہ ملیہ آزاد قومی تعلیم کا نمونہ اور تعلیم کی ایک نئی تحریک کا پیش خیمہ ہے۔

کسی تاریخی شخصیت کے عمل کو سمجھنے کے لیے سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی جگہ پر تصور کریں اور تمام حالات اور تمام لوگوں کو نظر میں رکھ کر سوچیں کہ ہم ہوتے تو کیا کرتے۔ اپنے آپ کو اس "مسند" پر تصور کیجیے، جس پر ذاکر صاحب صبح آٹھ بجے سے سہ پہر ساڑھے چار یا پانچ بجے تک بیٹھتے تھے۔ بعض استادوں کا دستور ہے کہ گھنٹہ خالی ہوا، تو آکر شیخ الجامعہ کے دفتر میں بیٹھ جائیں گے اور ادھر ادھر کی باتیں، یعنی گپ کریں گے یہ بزرگ ہیں، ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے؛ خود ان سے کام کی بات کی نہیں جا سکتی؛ ان کی موجودگی میں بھی وہی باتیں ہو سکتی ہیں، جن سے ان کو دلچسپی ہو ان کے علاوہ جو لوگ ملنے آتے ہیں، وہ یا تو ضرورت بیان کر کے روپے کا مطالبہ یا ساتھیوں میں سے کسی کی شکایت کرتے ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہ ہے کہ کسی فرض شناس باپ نے بیٹے کی فیس بھیج دی یا مکتبہ کی کچھ کتابیں بک گئیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کو جامعہ کی خراب مالی حالت کا بڑا دکھ ہے، مگر ان سے اصرار کے ساتھ کہا بھی نہیں جا سکتا کہ جو کچھ کرنا ہے جلد کیجیے۔ وہ ضرور سوچتے رہتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے؛ کس سے، کس وقت اور کہاں ملنا چاہیے؛ اصول اور عقیدے کی خلاف ورزی کیے بغیر جامعہ کی قوم پرستی اور حکومت دشمنی سے کس طرح نظر اور توجہ ہٹا کر جامعہ کی اہمیت کو واضح کرنا چاہیے؛ جامعہ کی نازک مالی حالت پر پردہ ڈال کر کس طرح دینے والے کو یقین دلانا چاہیے کہ اس کا روپیہ ایک ترقی پذیر کام میں صرف ہوگا۔ ان سب باتوں کے بارے میں غور کرنے کے لیے ملاقات کی ضرورت ہے، اور اس وقت بڑے آدمیوں سے ملنے کی یہی صورت ہے کہ ان کی مصاحبت کی جائے۔ حکیم صاحب جب کبھی بلا بھیجتے ہیں، تو امید بندھتی ہے کہ روپے کا کچھ انتظام کیا جائے گا مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشورے کے لیے وقت نہیں ملا، اس لیے کہ حکیم صاحب کی ذمہ داریاں اور مجبوریاں بہت ہیں اور جانے آنے میں اپنی جیب سے کچھ خرچ

ہوگیا۔ حکیم صاحب جن لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے کے خیال سے ملاتے ہیں، ان کے پاس غریب بن کر جایئے تو ان کی نظروں سے گر جائیں گے، اور بے غرض بن کر خودداری کے ساتھ ملیے تو انھیں جامعہ کی ضرورتوں کا احساس نہ ہوگا۔ اگر کسی جامعہ بلانا اور جامعہ کے کام دکھانا ہو تو کیا کیجیے گا؛ جامعہ میں دکھایئے گا تو کیا دکھایئے گا، اور جلسے اور نمایش میں کچھ خرچ کرنا ہوا تو وہ کہاں سے آئے گا۔ پھر لوگ ہیں کہ وقت بے وقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ کہیں سے کچھ لایئے تو کام چلے! گویا جامعہ وہ ہیں اور ان کی ضرورتیں۔ کبھی مشورہ کیجیے کہ جامعہ کو ترقی دینے کے لیے کیا کرنا چاہیئے، تو سب کہتے ہیں کہ یہ باتیں تو آپ ہم سے بہتر سوچ سکتے ہیں؛ ایک دو ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں اور جوش آجاتا ہے، تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ جامعہ کے کاموں کو ترقی دی جاسکتی ہے، روپیہ مل سکتا ہے، اگر چندہ جمع کرنے کی اسکیم بنائی جائے؛ اور شیخ الجامعہ صاحب دفتر میں بیٹھے رہنے کے بجائے چندہ جمع کرنے میں اپنا وقت صرف کریں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی، مگر جامعہ کا ایک اعلا دینی اور قومی مقصد بھی تو تھا، جس کی خاطر ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کی جاسکتی تھیں۔

جامعہ کو قایم کرنے کا ایک مقصد علم کو دین کے رنگ میں رنگنا تھا، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ تھی کہ دین کا تصوّر واضح ہو اور فنِ تعلیم کے ایسے ماہر موجود ہوں جو علم کو دین کا اور دین کو علم کا رنگ دے سکتے ہوں۔ لیکن دین کا تصوّر واضح کرنے کا حوصلہ کون کر سکتا ہے؟ عربی اور دینیات کے استادوں میں سے ایک بزرگ وہابی خیال کے تھے وہ پنج وقتہ نماز اور روزے کی پابندی کے علاوہ سر مُنڈا رکھنا، لبیں کتروانا اور ٹخنے سے اونچا پایجامہ پہننا لازمی سمجھتے تھے۔ وہ نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنے یا ان سے ہاتھ ملانے کو اتنا بُرا خیال کرتے تھے کہ ایک موقع پر مسز نائیڈو انتہائی کوشش کے باوجود انھیں آمادہ نہ کر سکیں کہ وہ ان کی طرف دیکھیں۔ ایک اور مرتبہ جلسے میں جب مرحومہ بیگم بھوپال سے ان کا تعارف کرایا گیا اور بیگم صاحبہ

نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے یہ کہہ کر مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا کہ میں نامحرم عورتوں سے ہاتھ ملانا غلط سمجھتا ہوں۔ ایک دو شیعی اور غیر مسلم استادوں کو چھوڑ کر باقی سب سنّی حنفی تھے، جن میں سے بعض ہر وقت اسلام کی بات کرتے تھے، اگرچہ خود روزے نماز کے زیادہ پابند نہ تھے۔ بعض دوسرے روزے نماز کے پابند تھے لیکن اسلام کی بات کم کرتے تھے۔ غرض جسے عام طور پر دین داری کہتے ہیں، اس کی مثال پیش کرنے کا شوق کسی کو نہ تھا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ جامعہ میں بچوں کو اچھّے مسلمان بننا سکھایا جاتا ہے۔ دوسری طرف فنِ تعلیم سے واقفیّت رکھنے والے استاد بھی نہیں تھے؛ دینیات کے نصاب میں نئے تجربے کیے بھی جاتے تو شاید اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا، اس لیے کہ دینیات کے استاد صرف پرانے ڈھنگ پر تعلیم دے سکتے تھے۔ گویا جامعہ کی تعلیم کو دین اور علم کو سمونے کا ایک تجربہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن تھا اور دین اور ملت سے دلچسپی رکھنے والے وہ مسلمان جن کی دولت سے مدد حاصل کی جا سکتی تھی، جامعہ کے قومی رنگ کو ناپسند کرتے تھے اور اس سے الگ ہی رہنا چاہتے تھے۔

جامعہ کا دوسرا مقصد تعلیم کی ایک نئی تحریک شروع کرنا تھا، جس کا سارے ملک کی زندگی پر اثر پڑے۔ یہ کام بعد کو بنیادی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں پہلے کی ایک تجویز کے آثار نظر آتے تھے کہ جامعہ میں صنعتی تعلیم دی جائے۔ ان آثار میں دو ہینڈ پریس، ایک کاتب، ایک مصلح سنگ اور ایک پریس مین تھا۔ کچھ اور سامان تھا، جس سے خیال ہوتا تھا کہ فوٹو گرافی سکھانے کی اسکیم بھی ذہن میں تھی۔ مگر سامان سب انمل بے جوڑ تھا؛ کچھ تالے اور اوزار قفل سازی کی اسکیم کی یادگار تھے۔ جامعہ میں بعض لوگ تھے، جن کے نزدیک سب سے اہم کام شبینہ مدرسے قایم کرنا تھا؛ بعض جامعہ کے مدرسوں کے نمونے پر دوسرے مدرسے کھولنا چاہتے تھے؛ جامعہ کی ایک شاخ رنگون میں تھی، ایک نیا مدرسہ باڑہ ہندو راؤ (دلّی) میں قایم کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ ان تجربوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے، مگر انھیں تجربوں پر جامعہ میں لوگ ہنستے بھی تھے۔

یہ ہیں وہ حالات جنھیں ذاکر صاحب کی شخصیت کے سمجھنے کے لیے نظر میں رکھنا چاہیئے۔ اب اسی سمجھنے کی کوشش کی تکمیل کے لیے حالات کو ذاکر صاحب کی نظروں سے دیکھیے۔ کسی کے دل میں گھس کر ساری حقیقت معلوم کر لینا ممکن نہیں ہے اور کوئی شخص خود اپنا سارا حال بتانا چاہے، تو بھی شاید نہ بتا سکے گا۔ لیکن ذاکر صاحب اور جامعہ کے تعلق کی کہانی خود ان کی زبانی بیان ہوتی تو شاید اس طرح سے ہوتی:

"جامعہ قایم ہوگئی ہے، اسے قایم رکھنا ہے، ہر حال میں قایم رکھنا ہے۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے، کام کرنے والوں کی ضرورت ہے، مگر سب سے زیادہ صبر اور ہمت کی ضرورت ہے؛ ایسے صبر کی نہیں جو آدمی میں صرف برداشت کی طاقت پیدا کرے، بلکہ ایسے صبر کی جو عزم کی صورت بن جائے، حالات پر غالب آنا سکھائے، جو موجود ہو، محسوس نہ ہو، جیسے صوفیوں کا فاقہ کہ چہرے کو رونق اور دل کو سرور بخشتا تھا۔ ہاں، اور ہمت بھی ایسی چاہیئے جو خود اپنے اندر روانی کی طاقت پیدا کرے، کسی شخص، کسی امید، کسی خیال کی دست نگر نہ ہو، جو پرند کی طرح سرسبز باغ اور ویرانہ ——— دونوں کے اوپر سے آزادانہ اڑتی ہوئی گزر سکے؛ جسے اپنی آزمایش (اپنی آزمایش) کے لیے مخالفوں کی تلاش نہ ہو، بلکہ جو لطف اور مروّت بن کر مخالفوں کو دوست بنالے، جو دُنیاوی حیثیت اور اقتدار رکھنے والوں کے سامنے سر کو نہ جھکنے دے، نگراں کی کوتاہیوں سے بیزار نہ ہونے دے اور ان سے مصلحت اور تہذیبی حسن کے ساتھ اپنا کام نکالنے کے طریقے بتاتی رہے۔ جامعہ میں جو لوگ ہیں ان سے صبر اور ہمت کا ذکر کیا جائے، تو نہ معلوم کیا سمجھیں گے، وہ تو چاہتے ہیں کہ انھیں مطمئن رکھا جائے۔ انھیں مطمئن رکھنے کے لیے خود مجھے ہر وقت مطمئن اور مطمئن ہی نہیں، تازہ دَم معلوم ہونا چاہیئے۔ وہ اگر اس بات پر خفا ہوں کہ میں روزمرّہ کے کاموں میں لگا ہوں، تنخواہوں

کے لیے روپیہ لانے کی دوڑ دھوپ سے بچتا ہوں، تو کچھ بہت ہرج نہیں؛ اس سے میرا اپنا اطمینان ظاہر ہوتا ہے ـــــــ روپیہ کے لیے بہر حال موافق حالات کا انتظار کرنا ہے، لیکن لوگوں کو مطمئن رکھنے کی اور تدبیریں بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک تدبیر یہ ہے کہ نئے کام کا یا پرانے کاموں کو بہتر کرنے کا کوئی خیال ذہن میں آتا ہے ـــــــ اور شکر ہے کہ ایسے خیال مسلسل ذہن میں آتے رہتے ہیں ـــــــ ـــــــ تو جو بھی ملتا ہے، اس سے اپنے خیال کو بیان کرتا ہوں، اسے دعوت دیتا ہوں کہ اس خیال کو عمل میں لائے یا مجھے مشورہ دے کہ اسے کس طرح عمل میں لایا جائے۔ دراصل یہ اس لیے کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت سے مجبور ہوں اور اس کا حساب نہیں رکھتا کہ کتنے خیال بیان ہو کر بھلا دیے گئے۔ مگر اس کا مجموعی اثر جامعہ والوں پر یہ پڑتا ہے کہ ہر ایک جامعہ کے کاموں کو ترقی دینے کی فکر میں الجھا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ فکرمند نہ رہا تو جامعہ نہ چل سکے گی۔ اگر جامعہ والوں میں سے کوئی اپنے شوق سے کسی کام کو کرنا چاہتا ہے، تو میں اس کی ہمت افزائی کرتا ہوں، اس لیے کہ کوئی کام بھی جم جائے تو اس سے مفید نتیجے نکل سکتے ہیں؛ اور اگر کوئی ارادہ غلط ہو تو بہتر ہے کہ ارادہ کرنے والا خود اپنی غلطی کو محسوس کرے؛

"جامعہ والے مجھ سے آکر ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں اور محاسب کے طریقِ کار سے سب بیزار ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ جس انداز سے کوئی بات شروع کرتا ہے میں بھانپ لیتا ہوں کہ اس کا اصل مدّعا کیا ہے؛ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جامعہ میں جیسے لوگ ہیں بہت غنیمت ہیں۔ ان کو جامعہ سے محبت ہے؛ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ جامعہ کو نہ چھوڑیں گے؛ اور تھوڑی سی ہمدردی اور ہمت افزائی انھیں ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ جس میں جیسی

صلاحیت ہے ویسا اس سے کام لوں، اور جس میں کوئی صلاحیت
نہ ہو اسے بھی مصروف رکھوں...

"یہ لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں، تو ایک دوسرے سے،
اور مجھ سے، پوچھنے لگتے ہیں کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے۔ میں موقع
کی مناسبت سے کوئی جواب دے دیتا ہوں، یا مقصد طے کرنے کی
ذمّے داری انھیں پر ڈال دیتا ہوں۔ خدا نے ذہانت دی ہے،
بیان کی قوّت دی ہے؛ مجھے یقین ہے کہ جامعہ رفتہ رفتہ ترقی کرتی
رہے گی اور یقین اتنا پختہ ہے کہ اپنے اوپر ہنس لیتا ہوں؛ اور
جب دل بھر آتا ہے تو دوسروں کو رُلا سکتا ہوں۔ خوب ہے
جامعہ کی زندگی، کہ اس میں ستّر فاقے کا مزہ بھی ہے اور ستّر
عبادت کا بھی......"

جس شخص نے بیس برس سے زیادہ ایک ادارے کی رہنمائی کی ہو،
اس کے علاوہ بنیادی تعلیم کو وسیع پیمانے پر رواج دیا ہو اور غالباً بلا استثنا
ہر ایک کو جو اس سے ملا، اپنی قابلیت سے متأثر کیا ہو، خود اس کی مردم شناسی
پر شبہہ کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر بہت سے لوگوں پر جنھوں نے
اپنی شخصیت اور قابلیت کی بنا پر غیر معمولی امتیاز حاصل کیا، ایسا ہی شبہہ کیا جاتا
رہا ہے۔ بات شاید یہ ہے کہ مردم شناسی کی کمی کا الزام لگانے والے خود مردم
شناس نہیں ہوتے یا قابلیت اور دوسری خوبیوں میں اپنے آپ کو کسی سے
کم نہیں سمجھتے۔ اس لیے انتخاب کی نظر جا ہے جس پر پڑے، وہ کہتے ہیں کہ
غلط شخص پر نظر پڑی؛ پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ انتخاب کرنے والے کو آزادی
کتنی ہے اور انتخاب کے لیے اسے آدمی کتنے ملے تھے۔ ذاکر صاحب سے
اس راتے میں جامعہ والے سب اتفاق کرتے تھے کہ جامعہ کے تمام شعبوں اور
تمام کاموں کو بڑھنا اور اس طرح ترقی کرنا چاہیے کہ وہ قوم کی نظروں کے سامنے
آئیں اور قوم کو جامعہ کی طرف متوجہ کریں، لیکن وسائل اتنے نہیں تھے کہ ہر
شعبے کی ترقی کے لیے ایک ساتھ انتظام کیا جا سکے، اس لیے یہ طے کرنا ضروری تھا

کہ ترقی کی کوشش کہاں سے شروع کی جائے۔ کوشش کو محدود کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وسائل جتنے بھی تھے بیشتر اسی میں لگائے جائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس خاص شخصیت کے مطالبوں کو جس کے سپرد کوئی نیا کام کیا گیا ہو، دوسروں کے مطالبوں پر ترجیح دی جائے۔ یہ بات ظاہر ہے، ان لوگوں پر گراں گزرتی تھی، جن کو وسائل کی کمی کے سبب پہلے بھی کافی نہیں ملتا تھا۔

ذاکر صاحب کی ایک ابتدائی تجویز یہ تھی کہ بچوں کے لیے کتابچے لکھے جائیں، اس غرض سے مکتبہ کو روپیہ دیا جائے اور اس کا کام جامعہ کے دفتر سے الگ کیا جائے۔ مکتبہ کو کاروباری طریقے پر چلانے کے لیے حامد علی خاں مرحوم سے زیادہ موزوں شخص اُس وقت جامعہ میں کوئی نہیں تھا؛ لیکن جامعہ کی بھائی چارہ کی فضا میں کاروباری طریقے کو برتنے سے خاصی کشمکش پیدا ہوئی، اگرچہ یہ بات بھی صاف تھی کہ مکتبہ کسی اور طریقے پر کامیابی کے ساتھ چلایا نہیں جا سکتا تھا۔

ذاکر صاحب کی اسی دَور کی ایک اور تجویز یہ تھی کہ مدرسۂ ابتدائی کو نمونہ کا مدرسہ بنایا جائے۔ اس کے لیے کسی استاد کو کسی اچھے اُستادوں کے مدرسے میں تربیت کے لیے بھیجنے اور اس کے بعد مدرسۂ ابتدائی اس کے سپرد کرنے کی ضرورت تھی ذاکر صاحب کی نظرِ انتخاب عبدالغفّار مدھولی پر پڑی، جنھیں شاید اور کوئی شخص بھی اس فریضہ کے لائق نہ سمجھتا، لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس سے بہتر انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عبدالغفار صاحب موگا بھیجے گئے؛ وہاں انھوں نے مدرسے کے اُستادوں کو محنت اور شوق سے حیرت میں ڈال دیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ مدرسۂ ابتدائی کے نگراں مقرر ہوئے، تو ان کے شوق اور انہماک نے مدرسے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ لیکن ایک اُستاد پورا مدرسہ نہیں بن سکتا، استادوں کی بہر حال ضرورت تھی۔ مدرسۂ ثانوی کے ایک استاد سے کہا گیا کہ وہ ابتدائی میں بھی پڑھایا کریں، تو انھوں نے اسے اپنی شان کے خلاف سمجھا؛ اور ان کی ضد میں خود ذاکر صاحب نے ابتدائی کے ایک کلاس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف عبدالغفار صاحب کی باضابطگی ایسی تھی کہ کوئی استاد ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب کسی جلسے کی صدارت کے لیے

چند منٹ دیر سے پہنچے، تو انھوں نے دیکھا کہ جلسہ شروع ہوگیا ہے اور اسکی صدارت کوئی اور کر رہا ہے۔ ذاکر صاحب اس سے بہت متأثر ہوئے اور عبدالغفار صاحب کی قدر ان کی نظروں میں بہت بڑھ گئی؛ مگر جامعہ میں مروّت اور رعایت کی جو فضا تھی اس میں عبدالغفار صاحب کی باضابطگی کو سراہنے والے بہت کم تھے۔ عبدالغفار صاحب چند سال بعد نگرانی سے علیٰحدہ ہو گئے، ایک استاد کی طرح پہلی یا دوسری جماعت کو پڑھاتے رہے۔ ابتدائی مدرسے کی حالت کبھی بگڑی کبھی سدھر گئی؛ مگر جو جان عبدالغفار صاحب نے اس میں ڈال دی تھی، وہ اب تک باقی ہے۔ تیسرا نمایاں کام جو اس ابتدائی دور میں ہوا، ایک شعبہ کا قیام تھا جو ہمدردانِ جامعہ کہلاتا تھا اور جس کا مقصد جامعہ کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ معلوم نہیں، یہ تجویز ذاکر صاحب کی تھی یا مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی کی۔ یہ بہت کامیاب ہوئی اور روپیہ جمع ہونے کے علاوہ اس شعبے کی بدولت جامعہ کا سارے ملک میں چرچا ہوگیا۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ جامعہ کے استاد چندہ جمع کرنے کے کام میں شریک ہوں۔ مرحوم شفیق صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ سب سے اپنا کام کرا لیتے تھے، پھر بھی یہ سوال ہر وقت اٹھتا رہتا تھا کہ استاد چندہ جمع کرنے میں لگے رہیں یا تعلیم کا کام کریں۔ غالباً خود ذاکر صاحب کو وہ دوڑ دھوپ پسند نہ تھی جو بہت سے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی رقمیں جمع کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ اس میں اصل آزمائش صبر اور استقلال اور بڑا پیمانہ کی ہوتی ہے، شخصیت کے اثر کی نہیں ہوتی۔ جامعہ کا کام سیٹھ جمال محمد مرحوم کے عطیے اور حیدرآباد کی گرانٹ کی بدولت چلا۔ عطیہ اس تعلق کی وجہ سے دیا گیا جو سیٹھ صاحب کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے تھا۔ حیدرآباد کی گرانٹ منظور کرانا اور ایک مرتبہ بند ہو جانے کے بعد پھر اسے جاری کرانا تنہا ذاکر صاحب کا کام تھا۔ اس کے بعد بھی جو بڑی بڑی رقمیں ملیں، وہ بھی انھیں کے اثر، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی کی بدولت ملیں۔ اس معاملے میں بھی شخص اور موقع کا انتخاب انھوں نے اپنی صوابدید کے مطابق کیا اور جامعہ والوں کی یہ شکایت سنتے رہے کہ وہ چاہیں تو بہت روپیہ جمع کر سکتے ہیں؛ نہ معلوم کیوں نہیں کرتے

دراصل اس میں قصور جامعہ والوں ہی کا نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا کچھ ایسا اثر تھا، مشوروں اور بحثوں میں وہ اس طرح حاوی رہتے کہ سب کا میلان خود بخود اس طرف ہو گیا کہ ہر مشکل کو حل کرنے کا اہل اور اس لیے اس کا ذمہ دار انھیں کو بنا دیں۔ جب رفتہ رفتہ جامعہ کے اپنے مفاد کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ ایسے کاموں میں لگیں، جو جامعہ کے کام نہیں کہے جا سکتے تھے، تو ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے معاملات سے دلچسپی تھی، اس کی وجہ سے ان کے خاص لوگوں سے تعلقات بڑھے اور ان کی مصلحت اندیشی، حاضر جوابی اور ذاتی اوصاف کا ایسے حلقوں میں چرچا ہو، جہاں شاید جامعہ کا کسی اور سلسلے سے ذکر نہ آتا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ استادوں کی ایک کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور ان کے خطبۂ صدارت نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ان سے ملاقات کرنے اور ان سے تقریروں کی فرمائش کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھنے لگی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں وردھا میں وہ کانفرنس ہوئی، جس میں مہاتما گاندھی نے بنیادی قومی تعلیم کی تجویز پیش کی۔ ذاکر صاحب بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے؛ ان کے جوہر دیکھ کر مہاتما جی نے تجویز کو مرتب شکل دینے کا کام ان کے سپرد کر دیا اور پھر انھیں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا صدر بنا دیا۔ بنیادی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب ان تمام صوبوں میں بلائے جانے لگے، جہاں کانگریسی حکومت تھی اور بنیادی تعلیم کا کسی شکل میں تجربہ کرنا چاہتی تھی، اسی زمانے میں مسلم لیگ نے کانگریس کی مخالفت کے ساتھ بنیادی تعلیم کی بھی مخالفت شروع کر دی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، جس سے ظاہر ہے ذاکر صاحب الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ کچھ لوگ جامعہ سے اس بنا پر خفا ہو گئے کہ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے اور بنیادی تعلیم کا پرچار بھی کر رہے تھے؛ لیکن مصلحت اندیشی کا یہ کمال تھا کہ جامعہ سیاسی عداوتوں کی لپیٹ میں نہیں آئی اور مدرسۂ ابتدائی میں، جس پر شبہہ کیا جا سکتا تھا کہ بنیادی تعلیم کا نمونہ بن گیا ہے، طالب علموں کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہ البتہ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ جامعہ نے مدرسۂ ابتدائی میں بنیادی تعلیم کا تجربہ نہیں کیا، صرف بنیادی تعلیم کے استادوں کی

تربیت کے لیے استادوں کا مدرسہ قایم کیا۔ دراصل اب قوم کے لیڈر جنھیں یقین ہو گیا تھا کہ بنیادی تعلیم ہی سچی تعلیم کہلانے کی مستحق ہے، ذاکر صاحب کو اتنی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی نگرانی میں یکسوئی کے ساتھ تجربے کرائیں؛ اور جامعہ والے بنیادی تعلیم کے اصولوں کو اتنی گہرائی کے ساتھ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی کے بغیر بھی کامیابی کے ساتھ بنیادی تعلیم کے طریقے کو اختیار کر سکتے۔

مسلمانوں میں بنیادی تعلیم کی جو مخالفت ہو رہی تھی، اس سے جامعہ کو کوئی خاص صدمہ اس وجہ سے بھی نہیں پہنچا کہ مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی نے اسی زمانے میں بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے ابتدائی منصوبوں میں سے ایک یہ تھا کہ قرآن کی آیتیں اور حدیثیں ترجمے کے ساتھ پوسٹروں کی شکل میں شائع کی جائیں۔ یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا۔ اس لیے کہ اس کا رسمی مذہب سے قریبی تعلق تھا، مگر مسلمانوں کو جو غلط فہمیاں بنیادی تعلیم کے بارے میں تھیں، وہ بھی قایم رہیں؛ اور اسی ملت میں جس کی کسی زمانے میں ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ اس میں دستکاری کا ہنر جاننے والے کی بڑی قدر تھی، ایسے طریقِ تعلیم کو برا سمجھا جاتا رہا، جس کی بنیاد اور جان دستکاری تھی۔ لیکن ملک بھی بنیادی تعلیم کی اسکیم سے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھا سکا۔ مہاتماجی کو ایک طرف بنیادی تعلیم کا نصاب تیار کر لینے کی اتنی جلدی تھی کہ جو نصاب تیار ہوا، اس میں خامیاں رہ گئیں؛ اور دوسری طرف وہ سوت کی کتائی کو اتنی اہمیت دیتے رہے کہ باقی تمام حرفے نظر انداز کر دیے گئے، اگرچہ رسمی طور پر ان کا ذکر ہوتا رہا۔ خود ذاکر صاحب نے بعد کے خطبات میں "کام" کی جو تعریف کی، اس کے اصول بتائے اور جس طرح اس حقیقت کی وضاحت کی کہ تہذیبی قدریں کام کے ذریعے ایک نسل سے دوسری میں منتقل ہوتی ہیں، وہ بنیادی تعلیم کی رپورٹ اور نصاب میں نہیں پائی جاتی اور اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ نصاب مرتب کرنے والے ذاکر صاحب کے خیالات کو سمجھ نہ سکے تھے۔ جامعہ والوں نے ان اعتراضات سے جو بنیادی تعلیم پر کیے جا رہے تھے، اتنا اثر لیا کہ اس کی

گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا ایک طریقہ جو قومی زندگی کی تعمیر میں بہت مددگار ہو سکتا تھا، ایک سرکاری ڈھونگ بن کر رہ گیا۔

جنگ کے زمانے میں برطانوی حکومت ایک طرف ہر ایسی تحریک اور ہر ایسے شخص کو بے ضرر کر دینا چاہتی تھی جس سے جنگ کی کارروائیوں میں خلل پڑ سکتا تھا، وہیں دوسری طرف، خاص طور سے ۱۹۴۲ء کے بعد اس الزام سے بھی بچنا چاہتی تھی کہ اسے ہندوستان کی بہبودی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی سلسلے میں تعلیم کے محکمے کی حیثیت بدلی اور بڑھائی گئی اور یہ ایک بہت قابل اور مخلص ماہرِ تعلیم سر جون سارجنٹ کے سپرد کر دیا گیا۔ سارجنٹ کی تحریک پر جامعہ کی طرف سے درخواست بھیجی گئی کہ اس کی سندیں تسلیم کر لی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سرکاری کمیٹی نے جامعہ کا معائنہ کرنے کے بعد سفارش کی کہ جامعہ کی تمام سندوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ جامعہ میں اس وقت تک تعلیم کے میدان میں صرف مدرسۂ ابتدائی نے امتیاز حاصل کیا تھا اور بنیادی تعلیم کے لیے استاد تیار کرنے میں استادوں کے مدرسے نے۔ حکومت کی طرف سے جو دو سندیں تسلیم کی گئیں، اس سے سمجھنا چاہیے کہ ذاکر صاحب کی تعلیمی خدمات کا اعتراف مقصود تھا۔ اسی زمانے میں جامعہ کے جشنِ سیمیں کو اہتمام سے منانے کا فیصلہ کیا گیا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر جامعہ کی توسیع کے لیے روپیہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا، اس سلسلے میں جتنی بڑی رقمیں وصول ہوئیں، وہ جامعہ کو نہیں بلکہ ذاکر صاحب کو دی گئیں۔ ذاکر صاحب ہی اس کا حوصلہ کر سکتے تھے کہ جامعہ کے جشنِ سیمیں کو قومی ہم آہنگی کا یادگار واقعہ بنائیں، جب کہ شمالی ہندوستان میں دشمنی اور کشت و خون کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ ان کی کوشش سے جشنِ سیمیں کے موقع پر کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور سب نے جامعہ کی قومی اور تعلیمی حیثیت کا اعتراف کیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے اس سے بڑھ کر کوئی اور کرشمہ نہیں دکھایا اور یہ ہمت اور حکمتِ عملی کا ایک کارنامہ تھا جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

جامعہ نے اپنے تعلیمی کاموں کے سلسلے میں آس پاس کے تمام گانوؤں کے لوگوں سے دوستانہ تعلّقات پیدا کر لیتے تھے اور اس کا اندیشہ کم تھا کہ قتل و غارت کی وبا سے اثر لے کر یہ لوگ جامعہ پر حملہ کریں گے! لیکن فساد کرنے والے باہر کے لوگ تھے اور اگرچہ جامعہ پر براہِ راست حملہ نہیں ہوا تھا، یہاں اتنے مسلمان گانوؤں سے بھاگ بھاگ کر پناہ گزیں ہو گئے تھے کہ حالت بہت خطرناک ہو گئی۔ اس وقت وہ محبّت جو مہاتما جی کو ذاکر صاحب سے اور جامعہ سے تھی، آڑے آئی۔ ۸ ستمبر کو جب وہ دہلی پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے ذاکر صاحب اور جامعہ کی خیریت دریافت کی، اور دوسرے دن خود حالات معلوم کرنے کے لیے تشریف لے آئے۔ ان کی اس توجّہ نے حکومت کو بھی اپنے فرض کا احساس دلایا۔ اب تو وزیرِ صحت، وزیرِ اعظم، کمانڈر اِن چیف سب ہی آئے اور حال دیکھ گئے؛ اور پھر کمانڈر اِن چیف نے ایک فوجی دستہ جامعہ والوں کی حفاظت کے لیے تعینات کر دیا۔ اس احسان کا بدلہ ذاکر صاحب نے اس طرح اُتارا کہ ۱۰ جنوری کو بارہ ہندوراؤ میں ایک جلسہ کرایا جس میں پناہ گزیں اور مسلمان اپنے بچّوں کو ساتھ لے کر آئے؛ بڑے آپس میں گلے ملے، بچّوں نے ساتھ کھیلا اور مٹھائی کھائی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کے آخری دو سال افسردگی اور مایوسی میں گزرے۔ جشنِ سیمیں کے بعد جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ایک طرف ملک میں فساد کی آگ بھڑکتی اور پھیلتی رہی، اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے بجھانا تو درکنار اس کے شعلوں کی لپک کو کم کرنا بھی کسی کے بس کی بات نہیں ہے؛ دوسری طرف سوائے سماجی تعلیم کے اس کام کے جو مرحوم شفیق صاحب کی نگرانی میں شہر میں ہو رہا تھا اور نئی کتابوں کی اشاعت کے اس منصوبے کے جو مرحوم حامد علی خاں نے بنائے تھے، جامعہ والوں میں نئے ولولوں اور حوصلوں کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ معمول کا کام، معمول کے جھگڑے، چھوٹی سی دُنیا کے حقیر ہنگامے، وہی جن سے پیچھا چھڑانے کے لیے جشنِ سیمیں کا اہتمام کیا گیا تھا، بدستور گلے کا طوق بنے رہے۔ ذاکر صاحب

کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی اور اس کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ انھیں شاید سب سے زیادہ دُکھ اس بات کا تھا کہ حکومتِ ہند، اگرچہ اب ایک آزاد ملک کی حکومت تھی، ہنوز پُرانے قاعدے قانونوں کی غلامی کو اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ذاکر صاحب حیدر آباد میں امداد مانگنے گئے، تو سر مرزا اسمٰعیل نے انھیں لنچ کی دعوت دی اور کھانے کے بعد پانچ لاکھ کا چک بطورِ عطیہ پیش کر دیا۔ سر مرزا اسمٰعیل غالباً جامعہ اور اس کے کام سے واقف بھی نہ تھے، صرف ذاکر صاحب سے ملے تھے۔ حکومتِ ہند کے رہنما جامعہ سے اور اس کے کاموں سے واقف تھے، ذاکر صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے تھے، اور بظاہر ان کی بڑی قدر بھی کرتے تھے، لیکن انھوں نے بھی عطیے کے طور پر اور استادوں کے مدرسے کی عمارت کے لیے کُل تین لاکھ نوّے ہزار کی رقم دی، اور بس۔ اس کے بعد معلوم ہوتا تھا گویا حکومت اپنا فرض ادا کر چکی ہو، اب جامعہ کو کچھ ملے گا تو سرکاری قاعدے کے مطابق اور تمام شرطیں پوری کرنے کے بعد ملے گا۔ اور چونکہ سرکاری قاعدہ وہی برطانوی حکومت کے زمانے کا تھا، اس لیے درخواستیں دینے اور ان کی پیروی کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آخر میں ذاکر صاحب نے کہہ دیا کہ جس کو مانگنا ہو، وہ جائے اور مانگے، اب میں کسی درخواست پر دستخط نہیں کروں گا۔

ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں علی گڑھ چلے گئے۔ آدمی کو انھیں خطروں کا علم ہوتا ہے، جو اسے پیش آتے ہیں، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ جو خطرے ابھی پیش نہیں آئے، انھیں بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ جامعہ کے بند ہو جانے کا خطرہ تھا کہ؛ اس کا خطرہ تھا کہ اس کے سارے منصوبے بس دلوں کا سُرور بن کر رہ جائیں گے جامعہ لاوارث ہو سکتی تھی ــــــ ایک یتیم ادارہ، جس کے چلانے والے دربدر پھرتے اور خیرات کے بدلے دُعائیں دیتے۔ لیکن جامعہ، اس ابتدائی مذہبی جوش میں جو اس کے قیام کے زمانے میں پھیلا ہوا تھا، ایسا ادارہ بھی بن سکتی تھی، جس کا مذہب بدلتے بدلتے مولانا محمد علی مرحوم کی سیاست کا رنگ اختیار کر لیتا؛

یا وہ قومی تعلیم کی ایسی مثال بن سکتی تھی جو نہ مسلمان کے دل کو لگتی نہ ہندو کے۔ وسائل کی کمی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جامعہ والے اس دنیا ہی کو حقیر اور گمراہ سمجھنے لگیں جو ان کی اور ان کے کاموں کی قدر نہیں کرتی تھی؛ خود ستائی اور ریاکاری کے فریب میں آجائیں، غریبی کی پابندیوں اور مجبوریوں کو اپنا مذہب بنالیں۔ ان سب خطروں سے جامعہ کو ڈاکر صاحب کی طبیعت نے بچایا، جو صرف آزاد ہی نہیں تھی، بلکہ کسی طرح سے کسی کی گرفت میں نہیں آتی تھی۔ انھوں نے نصیحت نہیں کی، بس عقدہ کشا عقل کا امتحان لیتے رہے، اخلاق اور علم کی ایک مثال بنے رہے جس کا حسن ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا اور جو ہر دیکھنے والے کو اس سوچ میں ڈال دیتی تھی کہ سراب کا جلوہ حقیقت ہے یا حقیقت سراب کا جلوہ۔

صغرا مہدی

ذاکر حسین کا شہرِ آرزو: جامعہ ملیہ اسلامیہ

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جنگِ آزادی میں گاندھی جی نے ایک نئی جان ڈال دی۔ انھوں نے تحریکِ عدم تعاون کے ذریعے لوگوں میں آزادی کا جوش پیدا کیا۔ اسی کے زیر اثر تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ بھی کیا جانے لگا۔ گاندھی جی اور علی برادران علی گڑھ کالج بھی گئے اور وہاں کے طلباء سے کالج چھوڑنے کی اپیل بھی کی۔ پہلے دن تو ان کو ناکامی ہوئی مگر دوسرے دن گاندھی جی تو واپس آگئے علی برادران نے ایک مرتبہ پھر اپنی مادر درس گاہ کے طالب علموں سے کالج چھوڑنے کی اپیل کی تو وہاں کا ایک طالب علم جو جُز وقتی لیکچرر بھی تھا اس نے سب سے پہلے ان کی آواز پر لبیک کہا اور یہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ جنھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے یونیورسٹی میں اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھنے والے طالب علم اور کچھ اسٹاف کالج چھوڑ کر چلے آئے۔

۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں ہی مولانا محمود الحسن کے ہاتھوں ایک آزاد تعلیمی ادارے کی بنیاد پڑی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کہلایا۔ جس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی تھے۔ ذاکر صاحب اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ یہ ادارہ ایک بے سروسامانی کی حالت میں قایم ہوا تھا۔ نہ اس کے پاس وسائل تھے نہ کوئی منصوبہ۔ مگر قوم کے سچے خادموں نے جن میں سے بعض کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور کچھ گم نام رہ گئے اس ادارے کو قایم کرنے کے لیے سارے وسیلے مہیا کردیئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ آ تو گئے تھے مگر اس کا نقشہ کیا ہو یہ ان کے ذہن میں صاف نہیں تھا۔ ولایت سے اعلا تعلیم حاصل کرنے کی فکر بھی تھی چنانچہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب جرمنی روانہ ہو گئے۔ جاتے وقت جامعہ ان کے لیے ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اور انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ یورپ سے واپس آ کر اسی کو اپنا میدان عمل بنائیں گے۔ جرمنی میں ان کی ملاقات دو حضرات سے ہوئی۔ یعنی ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب جو آگے چل کر جامعہ میں ان کے رفیق کار بنے اور جامعہ کے ارکان ثلاثہ کہلائے۔ جنھوں نے جامعہ کو نئی زندگی دی۔

شروع میں جامعہ کی حیثیت ایک سیاسی کیمپ کی تھی۔ مولانا محمد علی بھی سیاسی کاموں میں مشغول تھے اور اسی سلسلے میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ چند سال بعد جامعہ کی حالت ابتر ہو گئی اور یہ سوچا جانے لگا کہ اس ادارے کو بند کر دیا جائے مگر جامعہ کے کچھ طالب علموں کو یہ فیصلہ منظور نہیں تھا اس لیے ان لوگوں نے جن کے لیڈر شفیق الرحمٰن قدوائی تھے ذاکر صاحب کو اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ یہ جان کر ذاکر صاحب بہت فکر مند ہو گئے انھوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کے مشورے سے جامعہ کے سرپرستوں سے وہاں سے درخواست کی کہ بس چند دن کے لیے وہ جامعہ کو سنبھال لیں پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ آ کر جامعہ کی ساری ذمہ داری لے لیں گے۔ اس خبر سے خیر خواہان جامعہ کو بہت اطمینان ہوا۔ اور فروری ۱۹۲۶ء میں یہ تینوں اس شہر آرزو کو بسانے کے لیے ولایت ہی سے دہلی آ گئے۔ کیونکہ اس دوران جامعہ دہلی منتقل ہو چکی تھی۔ جامعہ کو قایم ہوئے چھ سال ہوئے تھے۔ اس نے ہندوستان میں اپنا مقام بنا لیا تھا مگر اس کے مقاصد لوگوں کے ذہن میں واضح نہیں تھے۔ قوم کے چندے سے اس کا چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ سیاست کا اس پر غلبہ تھا۔ ذاکر صاحب نے آ کر انجمن تعلیم ملی کے نام سے ایک انجمن بنائی جس کے ممبر جامعہ کے پرانے خادم اور نئے سربراہ سبھی شامل تھے۔ انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ بیس سال تک جامعہ میں ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ کے طور پر لیں گے۔ ذاکر صاحب کے دوستوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے پچھتر روپوں سے زیادہ کبھی نہیں لیے۔ جب جامعہ کے پاس پیسے آتے تو آخر میں

تنخواہ لینے والوں میں ذاکر صاحب ہوتے۔ چھ سال بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کی شکل میں جامعہ کو ایک ایسا فائنڈ مل گیا جس نے اسے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔ اپنی دیانت، محبّت اور شخصیت کے طلسم سے ایثار پیشہ جفاکش لوگوں کی ایک جماعت بنائی جس نے ذاکر صاحب کے ساتھ اپنے کو جامعہ کے لیے وقف کر دیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ کمال نہیں ہے کہ انھوں نے جامعہ میں برائے نام تنخواہ پر بائیس سال کام کیا بلکہ انھوں نے جامعہ میں ٹیم ورک کی اسپرٹ پیدا کی۔ انھوں نے جامعہ کو مساوات کا صحیح تصور دیا۔ انھوں نے جامعہ میں کام کرنے والوں کو یہ یقین دلایا کہ ان کا وجود جامعہ کی بقا کے لیے اہم ہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے "نئے کام یا پرانے کاموں کو بہتر کرنے کا کوئی خیال ذہن میں آتا ہے اور شکر ہے کہ ایسے خیال برابر ذہن میں آتے رہتے ہیں تو جو ملتا ہے اس سے اپنا یہ خیال بیان کر دیتا ہوں اور اسے یہ دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس خیال کو عمل میں لائے یا مجھے مشورہ دے کہ اسے کس طرح عملی شکل میں لایا جائے۔۔۔۔۔ اس کا مجموعی اثر جامعہ والوں پر یہ پڑتا ہے کہ ہر ایک جامعہ کے کاموں کو ترقی دینے میں الجھا رہتا اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ فکرمند نہ رہا تو جامعہ چل نہ سکے گی۔۔۔۔ اگر جامعہ والوں میں سے کوئی اپنے شوق سے کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو میں اس کی ہمّت افزائی کرتا ہوں اس لیے کہ اگر کوئی کام جم جائے تو اس سے مفید نتیجے نکل سکتے ہیں اور اگر کوئی کام غلط ہو تو بہتر ہے کہ ارادہ کرنے والا خود ہی اپنی غلطی محسوس کرے۔"[1]

ذاکر صاحب لوگوں کے مذاق، پسند اور مزاج کے مطابق کام دیتے تھے اور اگر کسی کو اس کے مزاج کے خلاف کام کرنا بھی پڑے تو یہ اس کا اپنا فیصلہ ہو اس پر تھوپا نہ جائے۔ وہ لوگوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچاننے اور ان کو اجاگر کرنے کا گر جانتے تھے۔ انھوں نے جامعہ میں یہ ثابت کیا کہ اگر کوئی بڑا مقصد ہو تو لوگ مل کر اسے حاصل کرنے کے لیے کس طرح اتفاق و اتحاد سے کام کر سکتے ہیں، کس طرح اس مقصد کو پانے کے لیے سختیاں جھیلتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے غلام

---

[1] چوتھے امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین، رسالہ جامعہ جشن زریں نمبر

ہندوستان میں جب کہ پورا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا جامعہ میں آزادی کا عجیب و غریب تصور پیدا کیا فکر کی آزادی، رائے کی آزادی، کام کی آزادی۔ انھوں نے جامعہ کو ایک آزاد تعلیمی ادارہ بنانے کے لیے جان توڑ کوشش کی اور کامیابی حاصل کی ان کا کہنا تھا جامعہ نے یہ تہیہ کیا ہے کہ وہ تعلیمی کام تعلیمی حیثیت سے کرے گی اور اس تعلیمی آزادی کو بطور اصول بنیادی ہمیشہ پیش نظر رکھے گی۔

انھوں نے جامعہ کے ابتدائی مدرسے کو خاص طور سے اپنی توجہ کا مرکز بنایا اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کی یہ منزل سب سے اہم ہے اور اسی منزل پر ثانوی تعلیم اور اعلا تعلیم کے لیے تیاری ہونا چاہیئے۔ انھوں نے ڈھونڈھ کر ایسے لوگوں کو اسی مدرسے میں رکھا جنھوں نے نت نئے تعلیمی تجربے کیے۔ کام کے ذریعے تعلیم کو اصول بنایا۔ اور اس کی کوشش کی کہ بچوں کی ذہنی و جسمانی نشو و نما آزاد فضا میں ہو۔ پروجکٹ میتھڈ تعلیم میں استعمال کیا۔ تیرہ اپریل کو قومی دن' بچوں کی حکومت، بچوں کا بینک، بچوں کی بنائی ہوئی درس گاہ، ایک دن کا مدرسہ، کھلی ہوا کا مدرسہ، کیمپ فائر، سائنس میوزیم، بچوں کی زد، کی وجہ سے جامعہ ابتدائی اسکول کی دور دور شہرت ہونے لگی۔ لوگ اس کو دیکھنے آتے اور تعریف کرتے۔

ذاکر صاحب بنیادی طور پر ایک معلّم تھے۔ ایسے معلّم جنھوں نے تعلیم کے صرف نظریئے نہیں وضع کیے بلکہ ان کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ ان کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا بھی۔ بقولِ خواجہ غلام الدین "تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایک محدود تنگنائے سے نکال کر زندگی کے سمندر میں لائے تاکہ وہ ان تحریکوں سے متاثر ہو سکے جو زندگی کی گہرائیوں میں پیدا ہو کر اس کو نئے تقاضوں سے مالا مال کرتی رہتی ہیں۔ نظری طور پر اور لوگ بھی ہندوستان میں اس کی تبلیغ کر رہے تھے مگر زبانی اور تحریری سہل پسندی کے بجائے ذاکر صاحب نے اپنے لیے عمل کا دشوار گزار میدان پسند کیا"[1] انھوں نے بچوں کی درسی اور غیر درسی کتابوں کو نئے ڈھنگ سے لکھنے اور شائع کرانے پر زور دیا اور اپنی شدید

---

[1] "انھیں سے سنت منصور و قیس باقی ہے"، صغریٰ مہدی صفحہ ۲۹۲ نقش ذاکر مرتبہ عبدالحق خان

مصروفیات کے باوجود خود بھی بچوں کے لیے اچھی اور دل چسپ کتابیں لکھیں انھوں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا، استاد کی اہمیت اور فرائض پر چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں میں اہم نکتوں پر روشنی ڈالی جیسے استاد کی کتاب زندگی پر علم نہیں محبت کا عنوان ہوتا ہے یا بچے سے دو لوگ کبھی مایوس نہیں ہوتے ایک استاد۔ ایک ماں۔

اب تعلیم کے میدان میں ان کی شہرت ہونے لگی ۱۹۳۴ء میں ان کو استادوں کی کانفرنس کا صدر چنا گیا اور ۱۹۳۷ء میں جب واردھا میں کانفرنس ہوئی اور اس میں گاندھی جی نے قومی تعلیم کی تجویز پیش کی تو اس کو مرتب کرنے اور واضح شکل دینے کا کام ذاکر صاحب کو سونپا جسے انھوں نے اپنے رفیق دوست ہندوستان کے مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کی مدد سے بہت اچھی طرح انجام دیا پھر ذاکر صاحب کو ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا صدر بنایا گیا اس طرح اب ڈاکٹر ذاکر حسین ایک قومی تعلیم کا نقشہ بنانے والے کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ اسی کے ساتھ بنیادی تعلیم سے جڑے ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے ایک حلقے میں ذاکر صاحب کی مخالفت بھی ہونے لگی۔ ڈر تھا کہ اس کے ساتھ جامعہ بھی اس کا نشانہ نہ بننے لگے مگر یہ ذاکر صاحب کی حکمت عملی تھی بقولِ پروفیسر محمد مجیب "جامعہ سیاسی عداوتوں کی لپیٹ میں نہیں آئی اور مدرسۂ ابتدائی جس پر شبہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بنیادی تعلیم کا نمونہ بن گیا ہے اس میں طالب علموں کی تعداد برابر بڑھتی رہی"۔[1]

اسی زمانے میں جامعہ میں ٹیچرز ٹریننگ کالج کا قیام "استادوں کا مدرسہ" کے نام سے ہوا۔ اور یہاں بنیادی تعلیم دینے کے لیے استادوں کو تیار کیا جانے لگا۔ جس نے بہت جلد آزادی سے پہلے ہی شہرت حاصل کر لی۔ اپنے مخصوص طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی وجہ سے وہ آج بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں جامعہ کے بارے میں کہا تھا:۔

---

[1] چوتھے امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین رسالۂ جامعہ جشن زریں نمبر، نومبر ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۵۶

"جامعہ جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول، سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلقی، وقتی منصوبوں اور پائیدار دیر طلب کاموں میں موخر الذکر کی اہمیت کا اقرار، یہ ہمیشہ کے لیے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے۔"[1] اور اسے راسخ کرنے میں بلاشبہ ذاکر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔

ذاکر صاحب جامعہ میں طالب علموں اور استادوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کی نظر طالب علم کی ذہانت اور استاد کی قابلیت پر نہیں ہوتی بلکہ اس کی شرافت اور انسانیت پر ہوتی تھی انھیں طالب علموں سے گہرا تعلق تھا وہ بھی مدرسۂ ابتدائی میں پڑھاتے۔ اس کی تقریبوں میں شرکت ہوتی اور ہر موقعہ پر وہ بچوں کو یہ بتانا نہ بھولتے کہ بحیثیت طالب علم وہ بھی جامعہ کے طالب علم ان کا کیا نصب العین ہے۔ مثلاً اپنی ایک تقریر میں طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقے سے روزی کما سکیں مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان، روزی کو زندگی کا، اجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے۔ یعنی سوسائٹی میں اپنے لیے کوئی مفید جگہ ڈھونڈھ کے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو۔"[2]

ابتدا میں جامعہ کے لوگوں کو مادی وسائل کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے اس کے لیے جو تکلیفیں اٹھائیں اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں "ان کا کوئی عزیز ساتھی ان مصیبتوں اور مشکلوں سے جن کا جامعہ کے لوگوں کو چوتھائی صدی مقابلہ کرنا پڑا۔ گھبرا کر جامعہ چھوڑنا چاہتا تو وہ

---

[1] جامعہ کی کہانی۔ عبدالغفار مدھولی صفحہ ۳۹۱۔ [2] صفحہ ۳۹۲

ان اخلاقی بندھنوں کو جنھوں نے اسے ان کی ذات اور جامعہ سے وابستہ کر رکھا تھا اس طرح کس دیتے کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا مگر یہ صورت بہت کم پیش آتی تھی۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا کہ جب کوئی رفیق نیم فاقہ کشی کی زندگی سے تنگ آکر ان کے پاس جاتا کہ فریاد شکایت یا طنز و طعن کے ذریعے اپنے دل کا بخار نکالتے تو وہ ان کے صبر و حلم سے شرمندہ ہو کر یا ان کی محبت اور اعتماد سے خوش ہو کر لوٹتا۔ وہ اسے روٹی کے بجائے "کام" دیتے۔ وہ فخر و مسرت سے پھولے نہ سماتا۔"[1]

۱۹۴۶ء میں جامعہ نے اپنی سلور جوبلی بہت اہتمام اور شان سے منائی۔ ذاکر صاحب نے جامعہ کے پلیٹ فارم پر مختلف سیاسی نظریات کے حامل لیڈروں کو جمع کیا اور لوگوں نے بھی دل کھول کر جامعہ اور جامعہ کے خادموں کی داد دی۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ اس کا بٹوارہ ہو گیا اور اس سیاسی موڑ نے جامعہ کو بھی متاثر کیا۔ ذاکر صاحب کو جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ جانا پڑا۔ اس کے بعد وہ گورنر بنا دیئے گئے۔ پھر نائب صدر جمہوریہ اور آخر میں صدر جمہوریۂ ہند۔ مگر وہ جامعہ کو نہ بھولے نہ جامعہ ان کو۔ وہ جامعہ کی زندگی میں اس طرح روح بس گئے تھے کہ جامعہ میں ہر جگہ ان کی چھاپ تھی۔ ان کی باتیں ان کی یادیں ان کے فقرے جامعہ کے لوگ دہراتے رہتے۔

وہ برابر جامعہ کی تقریبوں میں شامل ہوتے اور جامعہ کے لوگوں کی ذاتی تقریبوں میں بھی وہ برابر آتے تھے۔ اس کا اندازہ اس دلچسپ واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جامعہ نرسری میں جب گڑیا کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو نرسری کے بچوں میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ بغیر ذاکر صاحب کے گڑیا کی شادی کس طرح ہو سکتی ہے؟

ذاکر صاحب نے ملک کے اعلاترین منصب پر بھی اپنی شناخت جامعہ کے وسیلے سے بنائی اور یہ بات وہ کبھی نہیں بھولے کہ انھیں یہ منصب جامعہ کی بے لوث خدمت کے عوض ملے ہیں جب وہ نائب صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز

---

[1] مردِ مومن مردِ حق صفحہ ۲۰۲ حیاتِ عابد مرتبہ صغریٰ مہدی

ہوئے تو انھوں نے اپنی تقریر میں کہا "میرے انتخاب کے بعد مجھے مبارکباد کے جو ہزاروں خط اور تار موصول ہوئے ...... ان کے بھیجنے والوں کی بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جو معلم تھے ملک کے دور دراز گوشوں میں پرائمری سطح کے مدرس تھے، ہائی اسکول اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ تھے تب مجھے محسوس ہوا... کہ مجھے اس اعزاز کا مستحق اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ میں تعلیمی کام میں منہمک رہا ہوں...... آپ نے ہندوستان کے نائب صدر اور راجیہ سبھا کے چیرمین کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے ایک اسکول کا مدرس ہونے کے علاوہ اب تک کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ میں اپنی حدود سے واقف ہونے کے باوجود خوش ہوں کہ میرے لوگ قومی زندگی میں تعلیم کے کردار کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔"[1]

ذاکر صاحب نے مختلف حیثیتوں سے ملک کی جو خدمت کی وہ اپنی جگہ مُسلّم ہے مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو نئی زندگی دینا ہے اور اس کو ایک آزاد تعلیمی ادارہ بنانا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو "جامعہ" انھوں نے بنایا اور بلاشبہ وہ اس کے روح رواں تھے۔

---

[1] نقش ذاکر مرتبہ عبدالحق خاں "ذاکر صاحب راجیہ سبھا میں"، ظفر احمد نظامی صفحات ۲۷۶ ۔۔۔ ۲۰۰۰

ذاکر حسین خاں صاحب کے خطوط پر تمہیدی نوٹ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ہماری ددھیالی عزیز تھے۔ ان کے والد فدا حسین خاں صاحب میری دادی کے چچیرے یا پھوپھیرے بھائی تھے۔ میرے والد غلام اکبر خاں صاحب، المخاطب بہ نواب اکبر یار جنگ بہادر، فدا حسین خاں صاحب کی وجہ سے پہلے اورنگ آباد اور پھر حیدرآباد گئے تھے، اور وہاں قانون کی تعلیم حاصل کی، اور بہت کم عمری میں ان کو حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج، اور پھر معتمد امور عامہ یعنی ہوم سکریٹری ہونے کا موقع ملا۔

ہم لوگ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو ذاکر میاں کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اور وہ میرے والد کو چچا میاں یا چچا صاحب کہتے تھے۔ وہ اکثر حیدرآباد میں ہمارے گھر بمقام ترپ بازار میں آکر رکتے تھے۔ میرے والد ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے ایثار، خودداری اور حب الوطنی کا ذکر ہم لوگوں سے اکثر کرتے تھے۔ مجھ پر بچپن ہی سے ان کا بڑا اثر تھا۔ اور وہ مجھ سے بڑی شفقت اور محبت سے ملتے تھے۔ جس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ملے گا۔ ان کے بہت سے خطوط تو ضائع ہو گئے، مگر خوش قسمتی سے حسب ذیل چار خطوط محفوظ رہ گئے۔

(۱) پہلا خط تقریباً نصف صدی پہلے کا ہے، مورخہ ۲۵/ نومبر ۱۹۴۶ء، جس میں انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جشن سیمیں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہنگامی دور تھا، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست کا ٹکراؤ تھا، جس کا اثر جامعہ کے مستقبل پر پڑھ رہا تھا۔ اس موقع پر ذاکر میاں کی تقریر نے دلوں کو ملانے اور قومی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی تھی۔ یہ تقریر اپنی بصیرت کے لیے ایک شاہکار ہے۔

(۲) دوسرا خط انگریزی میں ۲۰ دسمبر ۱۹۶۰ء کا ہے ۔ میرے چھوٹے بھائی بشیر الدین احمد خاں، جو آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ ہیں۔ ان کی شادی کے سلسلہ میں ہم پٹنہ گئے تھے۔ ذاکر میاں نے مجھے راج بھون میں اپنا مہمان رکھا تھا، اور دو دن قومی سیاست اور بزرگ قومی رہنماؤں پر باتیں کرتے رہے۔

(۳) تیسرا خط ۲۶ جون ۱۹۶۱ء کا ہے، جس میں انہوں نے اس مضمون کا ذکر کیا ہے جو میں نے ان کے بارے میں لکھا تھا، جس کا عنوان تھا "شخصیت" یہی مضمون موجودہ مجموعہ میں طبع ہو رہا ہے۔

(۴) چوتھا خط مورخہ ۷ جنوری ۱۹۶۶ء، انگریزی میں ہے، جو انہوں نے حیدرآباد کے انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے اطلاع نامہ ملنے پر لکھا تھا۔

ان خطوط کے علاوہ مجھے اپنے دادا، جناب احمد شبیر خاں صاحب (۱۸۲۵ تا ۱۹۱۵ء) کی تین ڈائریاں بھی ملیں۔ ان میں سے کچھ دلچسپ اندراج حسبِ ذیل ہیں۔

رشید الدین خان

دفتر شیخ الجامعہ
جامعہ نگر، دہلی
۲۵/نومبر ۴۶ء

تار کا پتہ! جامعہ
ٹیلیفون! ۳۵۸
نمبر! ۳۲۲

عزیزم رشید میاں۔ السلام علیکم

آپ کا محبت نامہ ملا۔ خدا کا بڑا شکر ہے کہ جشن سیمیں کی تقریب خیر و خوبی سے انجام کو پہنچی۔ اس زمانہ میں یہاں حالات کچھ ایسے خراب ہو گئے تھے کہ بڑی تشویش تھی کہ یہ دن کیسے گذریں گے۔ لیکن خیریت رہی۔ الحمدللہ۔
میری تقریر شائع نہیں ہوئی ہے۔ شائع ہوتے ہی آپ کو بھی ایک نسخہ بھیجوں گا۔ آل انڈیا ریڈیو غالباً چند روز میں ہماری کارروائیوں کا ایک ریکارڈ نشر کرے گا۔ اسے سنیے گا۔
نظام ادب کے پرچے ابھی نہیں ملے ہیں۔ انشاء اللہ کل پرسوں مل جائیں گے۔ خدا حمید میاں کو صحت عطا فرمائے۔ بڑی تکلیف جھیلی غریب نے۔ ان کی خیریت سے کبھی کبھی مطلع کرتے رہیے۔ چچا صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچا دیں۔

تمہارا بھائی
ذاکر

عزیزی رشید الدین احمد صاحب
معرفت حکیم نواب اکبر یار جنگ بہادر
ترپ بازار
حیدرآباد دکن

Hyderabad, Dn

راج بھون
رانچی
۲۶/جون ۱۹۶۷ء

عزیزم رشید میاں۔ خدا آپ کو خوش اور تندرست رکھے۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ عجیب شخص ہے یہ بھائی ہمارا کہ نہ خط کا جواب دیا، نہ مضمون کی رسید بھیجی۔ مضمون جس وقت ملا اسی وقت پڑھ لیا تھا۔ اس میں اور خط میں آپ نے میری ایسی توصیف کی تھی کہ مارے خجالت کے اس وقت جواب نہ بن پڑا۔ آپ کی نیک خیالی سے اپنی بدحالی کو کیسے ملاتا۔ بہرحال جواب رہ گیا۔ اور جب ایک دفعہ رہ گیا تو پھر ٹلتا ہی رہا۔ لیکن آپ کا خط غیر تعمیل شدہ کاغذات میں وقتاً فوقتاً سامنے آتا اور شرمندہ کرتا رہا آج سوچا کہ اسے فائل سے نکالنا ہی چاہیئے۔ آپ نے اپنی محبت میں میرے متعلق بہت حسن ظن سے کام لیا ہے۔ مگر یہ کچھ برا نہیں۔ میں تو جیسا ہوں ویسا ہی ہوں۔ مگر آپ کو اگر کوئی خوبی مجھ میں یا کسی اور میں نظر آتی ہے تو وہ آپ کی پسند کی غماز ہے۔ آدمی رفتہ رفتہ وہی ہوجاتا ہے جو وہ پسند کرتا ہے۔ وہی صفتیں اس میں مجسم ہوجاتی ہیں جنھیں وہ پسند کرتا ہے۔
خدا کرے آپ سب بخیر ہوں۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے مطلع کر دیا کریں آج کل آپ کیا خاص کام کر رہے ہیں۔ اور آئندہ کیا منصوبے ہیں۔ سب لوگوں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

آپ کا بھائی
ذاکر

BIHAR GOVERNOR'S CAMP

Patna, Dec. 20, 1960

My dear Rashid Mian,

Thank you for your letter of the 14th which I received on my return from Chandigarh. Ghulam Ahmad had informed me of the coming wedding of Bashir Mian and I had written to him to say how sorry I was that I would be absent from Patna on that day. Owing to a programme finalized earlier I have to be at Jamshedpur till the 28th. I am going to Shantiniketan tomorrow. I have since received the invitation cards also. I feel very bad about my absence and am now planning to arrange to fly back to Patna to join you all at the wedding in the afternoon and fly back to Jamshedpur the next morning. I hope I shall be able to see more of you when I return on the 28th. I have invited the delegates to the Political Science Conference to tea on the 29th. You could come over and stay with me from the 28th on.

Looking forward to meeting you and with all good wishes.

Yours sincerely,

[signature]

Mr. Rasheeduddin Khan,
Lecturer, Osmania University,
Troop Bazar, Hyderabad (AP).

NO. VP-19170/Dy-65/4114

उपराष्ट्रपति, भारत
नई दिल्ली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

January 7, 1966

My dear Rasheed Mian,

Thank you for sending me the neatly printed brochure containing a description of the constructive activities undertaken by the Institute of Asian Studies, Hyderabad. I am sure the Institute will be publishing useful reports and discussions. If you can pass on to me any publication which you think will interest me, I shall be happy. I should like to keep in touch.

With all good wishes for a New Yar of Happiness and fruitful endeavour.

Yours affectionately,

Zakir Husain

Dr. Rasheeduddin Khan,
Member, Institute of Asian Studies,
& Professor & Head of the Department
of Political Science,
Osmania University,
HYDERABAD-A.P.

VICE PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

May 23, 1962.

My dear Shri Sharma,

I write this to thank you for your congratulatory message, which I greatly appreciate. More than the congratulations, I need the blessings of friends like you to prove worthy of the choice.

With kind regards,

Yours sincerely,

Shri Jagdish Sharma,
Block II-F, Qr.No.110,
Lajpat Nagar,
New Delhi-14.
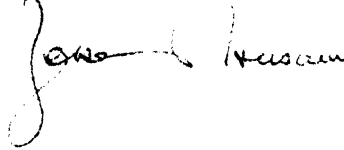
VICE-PRESIDENT
INDIA

NEW DELHI
July 7, 1962.

Dear Shri Jagdish Sharma,

I thank you for the kind invitation for lunch today. I am sorry I could not come owing to other engagements. I send my best wishes for Romi's long life, health, and prosperity.

Yours sincerely,

Zakir Husain

Shri Jagdish Sharma,
Block 11-F, Qr. No.110,
Lajpat Nagar,
New Delhi 14.

Rashtrapati Bhavan
New Delhi-4

I deeply appreciate and greatly value your kind congratulations and send you my heartfelt thanks.

Zakir Husain
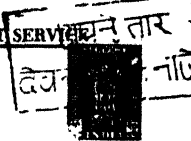
To

Shri Jagdish Sharma,
Block II-F Qr. No.110,
Lajpat Nagar,
New Delhi-14.

President's Secretariat,
Rashtrapati Bhavan, New Delhi-4.

منظومات

قطعات و نظم و استقبالیہ

جو عالی جناب، فضائل مآب ڈاکٹر ذاکر حسین بھارت رتن نائب صدر جمہوریہ ہند کی حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج اٹاوہ میں تشریف آوری کے موقع پر ۸؍ دسمبر ۱۹۶۲ء میں پڑھی گئی۔

قطعہ

ہے سوا عید کے دن سے بھی خوشی آج کے دن — آئی پژمردہ گلوں پہ بھی ہنسی آج کے دن
جاگی تقدیر اٹاوے کی یہ فیضِ ذاکر — یہ زمیں غیرتِ فردوس بنی آج کے دن

قطعہ

جلوہ فرما آج یوں کالج میں ہیں ذاکر حسین — جس طرح ہو زینتِ آغوشِ مادر نورِ عین
کیوں نہ ہو مسرور اس کالج کا بچہ بچہ آج — آپ ہی ہیں راحتِ جاں، آپ ہی ہیں دل کا چین

نہیں جس کا سہارا کوئی اس کا آسرا تم ہو — خدا رکھے ہر اک کے قلبِ محزوں کی دوا تم ہو
کہیں رکنِ حکومت ہو، کہیں اہلِ صفا تم ہو — کہ اے ذاکر حسین آئینۂ حیرت نما تم ہو
مرقع ہو کمالِ علم و فضل و عقل و حکمت کا — دیارِ ہند کی دیرینہ عظمت کا پتا تم ہو
کمالِ نکتہ دانی میں، کمالِ نکتہ فہمی میں — ہر اہلِ علم، ہر اہلِ ادب کے پیشوا تم ہو
ہوئی کافور جس کے دم سے تاریکی جہالت کی — حقیقت میں مہِ علم و ادب کی وہ ضیا تم ہو
کیا گاندھی کی جوہر میں نظر نے منتخب جس کو — وہ اک انمول موتی ہو، وہ دُرِ بے بہا تم ہو
سمجھنا تم کو اے ذاکر حسین آسان ہے کوئی — کہیں ہو قبلۂ دانش، کہیں قبلہ نما تم ہو
بیاباں بھی تمہارے فیض سے ہیں غیرتِ گلشن — تصدق جس پہ گل ہیں، وہ بہارِ جاں فزا تم ہو
بہ ظاہر امتیازِ ما و تو ممکن نہیں لیکن، — کہے دیتے ہیں پھر بھی کون ہم ہیں اور کیا تم ہو
دعا ہم ہیں، اثر تم ہو، مرض ہم ہیں، دوا تم ہو — چمن ہم، بوئے گل تم، مدعی ہم، مدعا تم ہو
یہاں تک آ کے پروازِ تخیل رک گئی اپنی — خدا ہی جانتا ہے اب کہ اس کے بعد کیا تم ہو

تمہاری ذات سے کالج کی امیدیں ہیں وابستہ — کہ اس کشتی کے اے ذاکر حسین اب ناخدا تم ہو
تمہارا ہاتھ لگ جائے تو بیڑا پار ہو جائے — کہ یہ ٹوٹی ہوئی کشتی ہے اس کا آسرا تم ہو
کسی کو کیوں پکاریں غیر کی امداد کیوں چاہیں — ہمارے جب خدا کے فضل سے حاجت روا تم ہو

تمہارے نام پر توفیقؔ کا دل کیوں نہ ہو صدقے
کہ اس کی آرزو میں تم ہو، اس کا مدعا تم ہو

پیش کردہ:-
سید توفیق الحسن توفیقؔ
آنریری جوائنٹ سکریٹری
حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج اٹاوہ

قطعہ تاریخ صداقت

بخدمت گرامی مرتبت عالی معلّٰی القاب "بھارت رتن" ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند

قطعہ

کیا سمجھ کے آپ کا رتبہ کیا حق نے بلند ۔۔۔ آپ پر ہے خاص لطف فاتح بدر و حنین
مسند آرائے صدارت ہو گئے کل ہند کے ۔۔۔ حق تو یہ ہے نام نامی نے بڑھا دی زیب و زین
آپ کے اسم گرامی کا ہے جُزو وہ پاک نام ۔۔۔ جس کو کہتا ہے زمانہ فاطمہ کا نور عین
یہ تو دنیا ہے یا پیمبر نے مدد کی آپ کی ۔۔۔ حشر میں بھی ہوں گے حامی بادشاہ مشرقین
اس صدارت نے کیا تقسیم انعام اس طرح ۔۔۔ دی دلِ اعدا کو دھڑکن دوستوں کے دل کو چین
قطعۂ تاریخ ہے آئینہ زورِ خلوص ۔۔۔ کر دیا ہے سات شعروں میں ادائے فرض عین

عیسوی سن میں مہذّب کس قدر مصرع ہے صاف
آپ کل ہندوستاں کے صدر ہیں ذاکر حسین

پیش کردہ:-
مہذّب لکھنوی

۲۰/جولائی ۱۹۶۷ء

بخدمت اعلیٰ حضرت ڈاکٹر ذاکر حسین بالقاب گورنر بہار
منجانب "بزم سخن" سائنس کالج پٹنہ

ساقیِ "بزم سخن" لا بادۂ حبِ وطن — آج گنگا کے کنارے ہے سجی "بزم سخن"
اور ہے پیرِ مغانِ علم صدرِ انجمن — کیوں نہ ہو فیضِ قدم سے میکدہ رشکِ چمن

باغباں مسرور اپنے گلستاں کو دیکھ کر
اور کھلے جاتے ہیں غنچے باغباں کو دیکھ کر

مرحبا اے کاروانِ علم کے بطلِ جلیل — تو ہے "ذاکر" اور جہاں میں ہے تیرا ذکرِ جمیل
علم تیرا بے مثال و حلم تیرا بے عدیل — خُلق تیرا تیرے اوصافِ حمیدہ کی دلیل

فخر ہے جس کو اثر پر ناز جس کو شاد ہے
ہے تیرے دامن کا سایہ اس عظیم آباد پر

جامعہ ہو یا علی گڑھ کی ہو قومی درس گاہ — تیرے سایہ میں ملی دونوں اداروں کو پناہ
تیری تدبیروں نے کی حالات سے اکثر نباہ — تیری کوشش سے بنی جد و جہد کی شاہ راہ

ہیں بہت سے ناموَر "عہدہ نوازی" کے لیے
وقت نے ڈھونڈھا ہے تجھ کو چارہ سازی کے لیے

تیرے ذوقِ باغبانی نے ثمر پیدا کیے — تیری شانِ رہبری نے راہبر پیدا کیے
تو نے کتنا چارہ ساز و چارہ گر پیدا کئے — اہل دل پیدا کئے اہل نظر پیدا کئے

تیرے نقشِ پا ہدایت کا نشاں بنتا گیا
راستے بنتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس سے روشن ہیں ستارے تو ہے وہ مہرِ کمال — تیری ہر تصنیف وہ آئینہ فکر و خیال
جس میں حالی کی متانت جس میں شبلی کا جمال — اور تیرے نطق میں آزاد کا سحرِ حلال

ملتِ بیضا کی امیدوں کا دامن تیری ذات
خوابِ سرسید کی اک تعبیرِ روشن تیری ذات

اے رفیقِ راہِ عرفاں ، اے میرِ کارواں　　　فخرِ تہذیبِ وطن ، نازِ دلِ ہندوستاں

تیری جانب لو لگائے ہے تیری اردو زباں　　　ہے زبانِ بے زبانی سے نوا سنجِ فغاں"

اس کی جانب بھی کوئی واضح اشارہ چاہیے

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیے

نائب صدر جمہوریۂ ہند سے

کنور مہندر سنگھ بیدی

تو ہے نائبِ صدر عالی مقام
تری ذات ہے قابلِ احترام
تو ہے محتشم، معتبر، باوقار
ترے دم سے باغِ وطن میں بہار
تو ہے سیکولر قوم کا پاسباں
تو ہے امنِ پیہم کی روحِ رواں
سرِ راہ تو ہے نہ بالائے نام
تو ہے بہرِ دیدارِ ہر خاص و عام
تو ہے ذاکرِ ذکرِ نامِ حسینؑ
تو ہے ساقیٔ پاکِ جامِ حسینؑ
ترے لب پہ ہے داستانِ شہید
ملر تے در پر مسلّط یزید
کہاں تک مناسب ہے فخرِ وطن
فرشتے کا ہو پاسباں اہرمن
جو دیکھا تو دل ہو گیا اشک بار
کہ فرعون موسیٰ، کا ہے پہریدار

کسی نوکری کی نہ مجھ کو تلاش
نہ میں راندۂ حزنِ فکرِ معاش
سفارش کا خواہاں نہ تھا با خدا
"نہ ہستم اسیر کمندِ ہوا"
فقط تیرے دیدار کی پیاس تھی
تجھے دیکھ لوں گا یہی آس تھی
مقدر کو یہ بھی نہ منظور تھا
قریب آ کے دیکھا بہت دور تھا
خوشامد جو بھیڑ کے کی ہو شرطِ دید
یہی ہے اگر تیرے در کی کلید
تو اے نائبِ صدرِ عالی مقام
تجھے دور سے دور ہی سے سلام
فزوں تر وطن میں تری قدر ہو
دعا ہے کہ تو ہند کا صدر ہو

انسان ہے تو

کنور مہندر سنگھ بیدی

تیری فطرت میں ہے گو بند کا ایثار مگر
ابنِ مریم کا مقلِد تِرا کردار مگر
رام اور کرشن کے جیون سے تجھے پیار مگر
بادۂ حُبِ محمدؐ سے بھی سرشار مگر
سکھ، نہ عیسائی، نہ ہندو، نہ مسلمان ہے تو
تیرا ایمان یہ کہتا ہے کہ انسان ہے تو

ہندوؤں سے تجھے لینا ہے ذہانت کا کمال
اور سکھوں سے شجاعت کہ نہ ہو جس کی مثال
اہلِ اسلام سے لینا ہے عبادت کا جلال
اور عیسائیوں سے صبر، لگن، استقلال
ان عناصر کو محبت سے ملانا ہو گا
کشورِ ہند کا انسان بنانا ہو گا

من کے مندر کو منور کرے نور اسلام
کعبہ دل میں رہے شام و سحر رام کا نام
کبھی گنگا، کبھی کوثر سے ملیں جام پہ جام
یوں بنیں شیر و شکر تیری حکومت میں عوام

رام ہو اور رحیم اور نہ ہونے پائے
اب کوئی بچہ یتیم اور نہ ہونے پائے

تجھ سے امید یہ ہے ملک میں افلاس نہ ہو
تنگ دستی نہ نظر آئے کہیں یاس نہ ہو
اُلم و رنج کا دکھ درد کا احساس نہ ہو
اور تعصب کی کسی قوم میں بو باس نہ ہو

عُنصر امن شکن کو تہہ و بالا کر دے
تو جو آیا ہے تو ظلمت میں اجالا کر دے

نذرِ ذاکر

حکیم غلام مہدی راز

بڑھایا اس نے اپنی ذات سے معیار انسانی
وہ اک کردار کا غازی وہ اک تصویر نورانی
نشانِ عظمتِ انسانیت اس کی صدارت تھی
کہ اس کی ذات گویا رونقِ تاجِ حکومت تھی
ہر اک لمحہ مساوات و اخوت تھا چلن اس کا
ہر اک محفل کی زینت بن کے رہتا تھا سخن اس کا
کوئی اس کے نگاہ و دل کی وسعت پا نہیں سکتا
کوئی اس طرح ذہن و زندگی پر چھا نہیں سکتا
معلّم تھا نئے افکار کی تعلیم دیتا تھا
وہ دورِ تیرگی میں نور برساتا رہا تنہا
گواہی جامعہ کے بام و در دیں گے وہ کیسا تھا
یہ وہ گلشن ہے جس کو اس نے خونِ دل سے سینچا تھا
علی گڑھ اب بھی اس کی یاد سے تحریک پاتا ہے
ہر اک ذرّہ وہاں کا اب بھی اس کے گیت گاتا ہے
وہ جس منصب پہ پہنچا اس کو حسن رنگ و بو بخشا
نظر کو گرمیاں دیں دل کو سوزِ جستجو بخشا
مجسّم انکسار و عجز تھا نخوت سے عاری تھا
وجود اس ایک تنہا کا کروروں پر بھی بھاری تھا
کہاں ممکن ہو اب ایسا کوئی صاحبِ نظر پیدا
"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

یادگار لمحات

شیخ سمیع الدین بلخی

ذاکر حسین میموریل میوزیم

اپنی وصیت کے مطابق ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مدفون کیے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ وہ ادارہ ہے جسے ذاکر صاحب نے پروان چڑھایا اور اک اسکول سے اُسے آگے بڑھایا۔ جامعہ اسکول سے پہلے ذاکر صاحب کا مقبرہ بنایا گیا ہے۔ اس مقبرہ میں ذاکر صاحب اور اُن کی زوجہ شاہجہاں بیگم کی قبریں ہیں۔ اس مقبرہ کے احاطہ میں ایک گول عمارت بھی ہے۔ یہ عمارت "ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل میوزیم" ہے۔

اس میموریل کا افتتاح ۳ر مئی ۱۹۷۶ء میں مرحوم صدر جناب فخر الدین علی احمد کے ہاتھوں ہوا یہ میوزیم حکومت ہند نے قایم کیا ہے۔

ہم کسی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دو چیزوں کا سہارا لیتے ہیں ایک اس کی خود نوشت سوانح حیات دوسرے کسی اور کے ذریعے لکھی گئی سوانح حیات، ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت سوانح حیات تو یہی ہے لیکن ان کی سوانح حیات کئی مختلف اصحاب نے لکھی ہے۔ جن میں پروفیسر مجیب مرحوم ہیں۔ جنھوں نے "ذاکر حسین" کتاب لکھی۔ ان کے علاوہ رشید احمد صدیقی، خورشید مصطفےٰ رضوی، لطیف اعظمی، ضیاء الحسن فاروقی، وادھے موہن ہیں۔ سوانح حیات پڑھ کر ہم اس شخص کی زندگی اور حالات کا تصور کر سکتے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن میوزیم کے

ذریعے ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ "ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل میوزیم" اسی چیز کو پورا کرتا ہے۔ یہ میوزیم ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔ اس میوزیم میں ڈاکٹر صاحب کی بیشتر چیزیں جیسے ان کے کپڑے، کتابیں، ڈگریاں، روزمرہ استعمال کی چیزیں تہنیت مضامین، مختلف شوکیس میں رکھی گئیں ہیں۔

اس گیلری میں ذاکر صاحب کا سب سے پہلا فوٹو ہے جو بچپن کا ہے۔ ان کے والد کا فوٹو ہے اور اُن کے اہلِ خاندان کے فوٹوز ہیں جب ذاکر صاحب جامعہ میں تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھے، اس وقت کے بیشتر فوٹوز ہیں۔ جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر ہوئے، نائب صدر ہوئے اور پھر صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے اور اسی عہدہ پر رہتے ہوئے اس دنیائے فانی سے کوچ کیا اور آخری آرام گاہ میں اتارے گئے اس وقت تک کے بیشتر فوٹوگراف موجود ہیں۔ جو اُن کی پوری زندگی کی جدوجہد، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے زندگی وقف کرنے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک زبردست بحران سے باہر لانے، ان کی جدوجہد اور ذاتی سمجھ بوجھ کی بنا پر حکومت ہند کے ممتاز عہدوں پر فائز ہونے کا جیتا جاگتا ثبوت مہیا کرتے ہیں ذاکر صاحب ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب فارسی اور اُردو شاعری میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ فارسی زبان و ادب کا ان پر بہت اثر تھا۔ اس کا ثبوت خطاطی کے وہ نمونے ہیں جس میں اُنھوں نے اپنے پسندیدہ اور دل کو چھو لینے والے فارسی اور اُردو اشعار یکجا کیے ہیں اس نے ان کے دل و دماغ پر اثر کیا اور ان کی فطرت کو جلا بخشی خط نستعلیق میں لکھوا کر رکھے۔ ان میں مولانا روم، امیر خسرو، سعدی، عرفی کے اشعار خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بیاض ہے اس میں جو اشعار ہیں وہ بھی ذاکر صاحب کی فطرت کے آئینہ دار ہیں۔

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر بنائے گئے تو وہاں ان کی فطرت کا ایک جوہر ابھر کر آیا۔ وہاں کی کانوں سے نکلے ہوئے معدنی پتھروں نے ذاکر صاحب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ذاکر صاحب نے ایسے پتھر جمع کرنے شروع کیے۔ یہ GEOLOGICAL STONES COLLECTION کا انتخاب کافی بڑا ہے۔ اس انتخاب Collection میں ۱۸۰۰ پتھر ہیں۔ جن میں منیرل، روکس اور فاسل ہیں۔ ذاکر صاحب کی نظر قدرت کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز میں اس کا خوب صورت پہلو دیکھتی تھی، چاہے وہ پتھر ہوں یا پھول اور پودے۔

ذاکر صاحب گلاب کے پھولوں کے بہت شوقین تھے۔ طرح طرح کے گلاب کے پھولوں کے پودے انھوں نے اپنے باغ میں لگا رکھے تھے یہ تقریباً ڈھائی سو قسم کے گلاب کے پودے تھے۔ لکھنؤ کی نیشنل نرسری میں گلاب کے ایک پھول کا نام ذاکر حسین گلاب رکھا گیا ہے، فرصت کے اوقات میں ذاکر صاحب ان پودوں کی خود نگہبانی کیا کرتے تھے اس کا ثبوت باغبانی کے وہ اوزار ہیں جو اس میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب مصوری کے بھی اتنے ہی شوقین تھے ہندستان کے بہترین مصوروں کی بنائی تصاویر اس کا ثبوت ہیں۔ جن میں ایم۔ ایف حسین، ایم سجاد، بی، شیخ، ستیش گجرال، آر۔ ایل دعون قابل ذکر ہیں۔

ان سب کے علاوہ ذاکر صاحب ایک بہترین مقرر اور قلم کار تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کہانیاں بہت مشہور ہیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔ افلاطون کی مشہور زمانہ کتاب "ریاست" کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا ہے۔ جو ترجمہ کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ ذاکر صاحب کی تقاریر جن میں تعلیمی خطبات بھی ہیں۔ اس میوزیم میں موجود ہیں۔ گورنر، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے جو اُنھوں

نے تقاریر کی ہیں ان کے ٹیپ بھی اس میوزیم کی زینت ہیں۔ ان تقاریر کو سُن کر ذاکر صاحب کا طرز بیان، زبان کی روانی، فصاحت اور بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے اکثر و بیشتر ذاکر صاحب بغیر کسی تیاری کے ہی تقریر کیا کرتے تھے۔

ذاکر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت اس میوزیم کے ذریعے عوام و خواص سب تک پہنچتی ہے۔ اس میوزیم سے ذاکر صاحب کے کارہائے نمایاں سامنے آتے ہیں اور عوام پر ذاکر صاحب کی شخصیت کے تمام پہلو ان کے سامنے آتے ہیں۔